بنگالی، گجراتی، مراٹھی، تامل اور ہندی افسانے

سچ کہانیاں

ترجمہ: الطاف فاطمہ

مشعل

سچ کہانیاں

ہندوستانی خواتین افسانہ نگاروں کے افسانے

تالیف: کالی برائے خواتین
ترجمہ: الطاف فاطمہ

مشعل
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،
لاہور، 54600، پاکستان

MashalBooks.org

سچ کہانیاں

(ہندی، بنگالی، گجراتی، مراٹھی، تامل اور انگریزی افسانے)

تالیف: کالی برائے خواتین

ترجمہ: الطاف فاطمہ

کاپی رائٹ© انگریزی 1986 کالی برائے خواتین
کاپی رائٹ© اردو 2000 مشعل

مشعل
آر بی 5، سیکنڈ فلور
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،
لاہور 54600، پاکستان
فون وفیکس 35866859-042
E-mail: mashbks@brain.net.pk

MashalBooks.org

فہرست

انا	(بنگالی)	مہاشویتا دیوی	4
گڑیاں	(مراٹھی)	سونیتی اپھالے	57
دھواں	(گجراتی)	ایلا مہتہ	91
ایک چھوٹا سا المیہ	(ہندی)	مرنال پانڈے	102
منیا کا	(تامل)	لکشمی کانن	167
سیاہی آدھی رات کا	(انگریزی)	وشوا پریا آئینگر	177

MashalBooks.org

4

بنگالی افسانہ

انا

مہاشویتا دیوی

میری موسی جنگل جھاڑ کے اس پار رہتی ہے،
میری موسی نے،
جو بہت دور کہیں رہتی ہے،
مجھے کبھی بھی مٹھائی کھانے کو نہیں بلایا۔

جسودھا کو تو یاد ہی نہ تھا۔ اس گیت کے مطابق، جو بچے گاتے پھرتے ہیں اس کی بھی کوئی ماسی ہے یا تھی، جس نے اس کے ساتھ ایسا کوئی اچھا برتاؤ کیا ہو۔ بس اس کو تو یہی پتا تھا کہ وہ تو جنم جنم سے بیس بچوں کی ماں اور کنگالی چرن کی بیوی ہے۔ ہاں یہ کوئی جھوٹ تو نہیں کہ اگر کوئی زندہ بچوں کے ساتھ ساتھ ان تمام مرے ہوئے یا مردہ پیدا ہونے والے بچوں کا حساب بھی لگائیں تو پورے بیس ہی تو بنتے ہیں۔ اپنے ذہن پر زور ڈالنے کے باوجود اس کو یاد ہی نہ آتا کہ کبھی زندگی میں اس پر ایسا دن بھی آیا ہو جب اس کے پیٹ میں بچہ نہ رہا ہو۔ اس کی کوکھ خالی ہو اور صبح صبح جی متلانے اور چکر آنے سے نجات ملی ہو۔ نہ ہی اس کی یاد میں اس پر کوئی ایسی رات اتری تھی جب کنگالی چرن نے اس پر چڑھائی نہ کی ہو، اور اگلی فصل کے لئے اس کے اندر تخم پاشی نہ کی ہو۔ وہ تو ہر رات اس طرح سے اس کے بدن کا سروے کرتا جیسے کوئی جیالوجسٹ پہاڑوں کی معدنیات کی تلاش میں برمے ڈال ڈال کر سوراخ کرتا پھرے ہے۔

یہ سوچنے اور فیصلہ کرنے کا تو جسودھا کو کبھی موقع ہی نہ ملا کہ وہ گربھ وتی اور ماں بننے کی سختیاں سہہ بھی سکے گی یا نہیں۔ بات یہ ہے کہ گربھ اور زچگی کا یہ لامتناہی سلسلہ ہی تو تھا جو اس کے اتنے بڑے کنبے کی زیست و بقا کا سہارا تھا۔ بات یہ بھی ہے کہ وہ پیشہ ور ماں تھی اور یہی اس کا پیشہ تھا اور وہ اس کوچہ میں شوقیہ یا اتفاقیہ اور لوگوں کی دوسری عورتوں کی طرح داخل نہ ہوئی تھی جو اکثر بابو لوگوں کے گھروں میں ملازمت کرتی ہیں۔ نہیں وہ تو باقاعدہ اور ضرورتاً اس پیشے میں آئی تھی۔ بات اصل یہ ہے کہ آج کی پوری دنیا پر پیشہ وروں نے قبضہ جما رکھا ہے جدھر دیکھو ان کا ہی سکہ چلتا ہے۔ بھلا شہر میں کوئی پوچھتا ہے، شوقیہ نا تجربے کار بھکاریوں کو۔ یہی حال شوقیہ طوائفوں اور چور اچکوں، جیب کتروں کا ہے۔ بھلا کون کسی کی پرواہ کرتا ہے۔ ارے کچرے کے ڈھیر میں خالی ڈبے اور سوکھی ہڈیاں کھکوڑنے والے کتے اور کوے تو اپنی جگہ سے ایک انچ بھی سرک کر نہیں دیتے۔ کیا مجال جو کسی نا تجربے کار اور شوقیہ آنے والے کو قدم جمانے اور گھس بیٹھنے کی اجازت دے دیں۔ سو جسودھا بھی اس پیشے میں ضرورت کے تحت بطور پیشہ ور ہی داخل ہوئی۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اس سارے معاملے کی ذمہ داری سٹوڈی بیکر موٹر کار پر ہے جو ہلدر گھرانے کے نئے نویلے داماد کی ملکیت تھی اور ہلدر بابو کے سب سے چھوٹے بیٹے کی اس ہٹ دھرمی اور شوق پر ہے جس کے تحت بیٹھے بٹھائے اس کو بھری دوپہر میں گاڑی چلانے کا شوق چرایا۔ خیر یہ بیٹھے بٹھائے شوق چرانے اور کسی بات کا سودا جی میں سمانے والی بات کوئی نئی تو نہ تھی۔ یہ تو اس لڑکے کی سدا سے عادت تھی کہ بیٹھے بٹھائے ایک بات کی دھن لگ جاتی۔ ایک دم بے تاب اور بے قابو ہو جاتا، اس وقت تک اس کے ہوش حواس ٹھکانے نہ آتے جب تک وہ اپنا شوق پورا نہ کر لیتا۔ عجب بات تھی کہ ایسی سنک اس پر بھری دوپہر ہی میں سوار ہوتی۔ الہ دین کے چراغ والے جن کی طرح بیٹھے بٹھائے اس کے سر پر بھوت سوار ہو جاتا۔ پر خیر جسودھا کی انا گیری کے پیشے میں آنے کا اس کی اس عادت سے کوئی تعلق نہیں بنتا تھا۔ نہ ہی اس کی اس حرکت سے جو اس کے من موجی پن کے نتیجے میں اس سے سرزد ہوئی۔ اس کا تو اس بات سے کوئی تعلق ہی نہیں بنتا۔

مثال کے طور پر ہوا یہ کہ ایک دوپہر اپنی ہوسناکی سے مغلوب ہو کر اس نے اپنے گھر کی باورچن پر ہاتھ ڈال دیا، وہ ایسا تھا کہ رسوئی چوکے سے فارغ ہو کر کہارن نے ڈٹ کر بھات اور مچھلی کا بھوجن ہی نہیں کیا بلکہ مچھلی کے وہ سر بھی مزے لے لے کر کھائے جو اس نے مالکن کی

MashalBooks.org

چیل جیسی تیز نظروں سے بچا کر الگ چھپا لئے تھے۔ پھر تازہ سبزیوں سے بنی بھاجی بھی مزے لے لے کر اڑائی تھی۔ اتنا ڈٹ کر کھانے سے جو اونگھ آئی تو ستانے کو لیٹ گئی۔ تو خیر جب یہ سوچتے سوچتے کہ بس یہی تو میرا من بھاتا بھوجن ہے۔ اس کی آنکھ لگنے ہی لگی تھی کہ لڑکے کے سر پر وہی الہ دین کا جن سوار ہو گیا اور جب جن کا زور ٹوٹا اور لڑکا اپنے آپے میں آیا تو لگا رونے اور ٹسوے بہانے اور بنتی کرنے۔

"دیکھو یہ بات کسی سے نہ کہنا"۔ تو وہ بڑی لاپروائی سے بولی:

"لو بھلا یہ بھی کہنے والی بات ہوئی، اس میں کہنے والی کون بات ہے"۔ یہ کہا اور آرام سے پڑ کر سو گئی۔ وہ یہ بات گول کر جاتی اور کسی سے بھی نہ کہتی کہ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ خود بھی ایک طرح سے بڑی خوش تھی کہ اس کے بدن اور چھب پر مالک کے بیٹے کی نظر پڑی اور اس نے اس پر ہاتھ ڈالا۔ پر اس کا کیا جائے کہ وہ جس کے دل میں چور تھا اس کے سر پر بھی وہی جن سوار ہوا اور لگا ہنکارنے۔۔۔ اب وہ ہر دم بے کل سا رہنے لگا اور اب بیٹھے بٹھائے وہ اس وہم میں مبتلا ہو گیا کہ وہ اس کی تھالی میں کھلے ہاتھ سے مچھی اور بھات پروس رہی ہے تو اس کا کچھ مطلب ہے۔ اچھے سے اچھے مزیدار کھانے اس کے سامنے رکھ دیتی ہے تو اس کا یہی مطلب ہوا نا کہ وہ یہ بھانڈا پھوڑنا چاہتی ہے۔ اپنے اس خصوصی برتاؤ سے وہ منہ سے ایک لفظ نکالے بنا ہی سب کچھ جتا دینا چاہتی ہے، لڑکا ڈر گیا اور وہ نامراد جن اس کے سر پر سوار ہوا تو اس نے اس کو اس وقت تک چین سے بیٹھنے نہ دیا جب تک کہ اس نے اپنی ماں کی انگوٹھی چرا کر کہاری کے تکئے تلے چھپا کر شور نہ ڈال دیا۔ ایک ہنگامہ، ہاہا کار مچادی کہ یہ تو چور ہے نکالو اس کو۔

پھر اس نے دوسری حرکت یہ کی کہ اپنے پتا کا ریڈیو چرا کر بیچ ڈالا۔ اب اس کے ماں باپ اس کی ان حرکتوں اور تلون مزاجی سے عجیب الجھن میں تھے۔ وجہ کیا ہے آخر لڑکے کی ان حرکتوں کا سہہ پہر کو ستانے اور سونے کے وقت سے تعلق کیا ہے۔ اس لئے کہ ہلدر گھرانے کے بچوں کی عادتوں میں دوپہر کو سونے کا کوئی رواج شامل ہی نہ تھا، انہوں نے تو اپنے بچوں کو رات گئے سونے کی عادت ڈالی ہوئی تھی اور بچوں کے سونے جاگنے کے یہ اوقات بھی باقاعدہ جنتری اور زائچہ ہی کے اشارے اور صلاح سے مقرر کئے گئے تھے۔ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے گھر کے پھاٹک کے اندر داخل ہوتے ہی یہ احساس ہوتا تھا کہ اس گھرانے پر ابھی تک سولھویں صدی کے

رہن سہن اور عقائد کی چھاپ ہے۔ اسی کا سکہ چل رہا ہے کہ اس گھر کے باسی اب تک اپنی گھر والیوں سے ملاپ اور ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے دن اور سمے تک بھی جنتری دیکھ کر ہی مقرر کرتے ہیں۔ اچھا ! مگر جسودھا کی کہانی کا اس سب سے تو اتنا ہی تعلق بنتا ہے کہ اس کی کہانی نے اسی چلن اور طور طریق کے چکر پھیر میں ہی جنم لیا۔ کئی چھوٹی چھوٹی باتوں سے یہ کہانی اپنے انجام اور منزل پر پہنچی۔

بھئی وہ کنگالی چرن تو ایک حلوائی کی دکان پر کام کرتا تھا اور دیوی کے مندر پر آنے والے ان برہمن یاتریوں کے لئے مٹھائیاں تیار کرتا تھا۔ جنہیں اپنی اونچی گوت اور ذات کا بڑا مان ہے اور اپنے کھانے پینے کے معاملے میں ابھی تک بڑے کٹڑ چھوت چھات اور بھرشٹی کے قائل ہیں۔ اس دکان کی، جس پر وہ پوریاں تلتا تھا، دور دور تک یہی شہرت تھی کہ اس دکان پر اونچی ذات کے باہمن کے ہاتھ کی تلی پوری بھاجی ملتی ہے۔ اب اس کا یہ تھا کہ حلوائی کی آنکھ بچا کر پوریوں کا آٹا اڑا لیتا اور اس طرح اپنے پریوار کے پیٹ پوجا کا سامان کر لیتا تھا۔ ایک سمہ پہر کو جب دکان کا کام نبٹا کر دکان، مالک کے حوالے کر کے گھر کو چلا تو حسب معمول اس کی دھوتی کے بل میں دکان سے اڑائے ہوئے چند سموسے اور تھوڑی سی جلیبیاں بھی چھپی ہوئی تھیں کہ اس کا دستور تھا کہ دوپہر کا بھوجن جسودھا کے ساتھ ڈٹ کے کرنے کے بعد اس کے توانا اور گداز جسم خصوصاً بھری بھری چھاتیوں سے تھوڑی دیر کھیلنے اور لطف اندوز ہونے کے بعد آرام سے پڑ کر سو جاتا۔ اس روز بھی وہ عیش و لطف کے ان ہی خیالوں میں مگن اور کھویا ہوا مانو سورگ کی اور لپکا چلا آ رہا تھا کہ اسی آن ہلدر گھرانے کے چھوٹے بابو کی اسٹوڈی بیکر ایک زبردست جھراٹے اور جھٹکے کے ساتھ اس طرح رکی کہ کنگالی چرن کا کچومر بنتے بنتے تو بال بال بچ گیا لیکن اس کے دونوں پیر نہ بچ سکے اور کچلے گئے۔ اس طرح کہ ان کا جوڑ جوڑ ہل گیا اور معاملہ قابو سے باہر ہو گیا۔ گاڑی کے شور کے ساتھ ہی آناً "فاناً" بھیڑ لگ گئی۔ ایک ہاہا کار مچ گئی۔ اوپر سے پہنچ گیا نبین پانڈا۔ اس نے تو گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخنا چلانا اور دھمکیاں دینا شروع کر دیں کہ جو یہ ہلدر بابو کے گھر کے سامنے نہ ہوا ہوتا تو ہم تو خون کی ندیاں بہا دیتے۔ نبین پانڈا تو شکتی دیوی کے مندر کا خاص الخاص مہنت اور پروہت ہے۔ شکتی دیوی کے مہا پنڈت ہونے کے ناطے بڑا بلوان اور شہوانی جذبوں سے بھرپور۔ اب ظاہر ہے کہ اس بھری دوپہر اور گرمی کے جوبن کے سمے اسے تو آسمان سر پر اٹھانا ہی اٹھانا تھا۔ اس کا پارہ

ایک دم چڑھ گیا تھا۔اس کی چیخم دہاڑ سن کر پورے کا پورا ہلدر گھرانا گھر سے باہر نکل آیا۔ بڑے ہلدر بابو نے بیٹے پر نظر پڑتے ہی اس پر تھپڑوں اور طمانچوں کی بارش کر دی اور اونچی اونچی آواز میں ڈانٹنا ڈپٹنا شروع کر دیا۔

"ارے گدھے، پاگل باہمن کی جان لینا چاہ رہا تھا۔کیا؟"

اب ان کے جنوائی صاحب کی باری تھی۔ان کا تو یہ تھا کہ پہلے تو انہوں نے کنکھیوں سے اپنی سٹوڈی بیکر کا جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر بس معمولی سا رگڑا ہی لگا ہے اور کوئی ایسا بھاری نقصان نہیں ہوا پہلے تو اطمینان کی سانس لی اور پھر یوں ظاہر کرنے لگے گویا انہیں کوئی پرواہ نہیں، چلو پھر کیا ہوا نقصان تو ہونا تھا سو ہو گیا۔اب ظاہر ہے کہ اس اداکاری پر واہ، واہ تو ہونی ہی تھی۔بھئی کیا دل والا داماد ملا ہے۔اس گھرانے کو۔کیا اپنے نقصان کو ٹھنڈے دل سے پی گیا، گویا بات ہی کوئی نہ تھی۔ہاں بھئی بڑا دل ہے۔چلو کیا ہوا جو پائی پائی پر جان دیتا اور دولت بٹورتا، مگر تہذیب اور شرافت برتنا جانتا ہے۔رشتوں کی لاج تو رکھتا ہے۔۔۔۔۔اس نے تو نہایت باریک کرکری اور ریشم سی نرم آواز میں کہا تو یہ کہا:

"ارے تو کیا اب اس آدمی کو یوں ہی مرنے دو گے یا ہسپتال لے جاؤ گے"۔

کنگالی کا مالک حلوائی بھی اس بھیڑ اور ہجوم میں موجود تھا۔اس نے کنگالی کی دھوتی کے بل سے نکل کر مٹی میں ملنے والے سموسوں اور جلیبیوں پر نظر ڈالی تو خون کھول گیا۔ پر یہ کہتے کہتے زبان روک لی کہ "شرم نہیں آتی کنگالی۔۔۔۔۔تم کو۔۔۔۔تم یہ بھی کرتے ہو"۔

یہ کہتے کہتے اس نے اپنا لہجہ بدل لیا اور ہلدر بابو کے داماد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

"اب یہ تو آپ ہی کرپا کریں گے دادا کہ اس غریب کو ہسپتال تک پہنچا دیں"۔

سو ہلدر بابو اور ان کے جنوائی فوراً اسے ہسپتال لے کر دوڑ گئے، بڑی مستعدی سے، اس حادثے کا ہلدر بابو کو سچ مچ بڑا افسوس ہوا تھا۔وجہ اس کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں فاشسٹوں کے خلاف انہوں نے بھی بڑا کردار ادا کیا تھا یعنی اسکریپ آئرن کی خرید و فروخت بڑی مستعدی اور وفاداری سے کرتے رہے۔ساتھ ہی اپنے دھرم کے اتنے پکے کہ اپنی ہر صبح کا آغاز باہمن کے چرن چھو کر ہی کرتے تھے اور اگر کسی وجہ سے چٹرجی بابو وقت پر موجود نہ ہوتے تو پھر وہ ان کے بیٹے کنگالی کے خستہ اور پھٹے جوتے تلے کی خاک کا ایک ذرہ چھو کر ہی کام

MashalBooks.org

چلا لیا کرتے۔ کنگالی چرن ان دنوں بچہ ہی تھا بالکل نوعمر لڑکا۔ پر چٹر جی کا بیٹا ہونے کے ناطے وقت بے وقت کام آ ہی سکتا تھا۔ تیج تیوہار اور تقریبات میں اسے اور اس کی بیوی جسودھا کی شرکت لازمی ہوتی تھی اور جب ہلدر بابو کی بہو کا پہلے پہل پاؤں بھاری ہوا تھا تو جسودھا کو ایک ساری اور اس کے ساتھ سیندور چڑھاوے کے طور پر بھیجا گیا تھا۔ بڑے ہلدر بابو ماضی کی سوچوں سے نکل کر جب حال میں واپس ہوئے تو انہوں نے کنگالی کو تسلیاں دینی شروع کر دیں۔۔۔۔۔

"میرا بچہ۔۔۔۔۔ بیٹا تو گھبرا نہیں بالکل، چنتا نہ کرنا۔ اپنے جیون بھر تو میں تجھے کوئی کشٹ نہیں اٹھانے دوں گا"۔ یہ کہتے کہتے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ کچل کر قیمہ بن جانے والے انہیں کے پیروں کی طرف دیکھ کر ان کو یہ دکھ بھی تو ستا رہا تھا کہ ان کو اس کے چرنوں کی ضرورت ہوا کرے گی تو وہ کیا چھو کر اپنی ڈھارس بندھائیں گے۔ کنگالی چرن تو اب بنا چرنوں ہی کے رہ جائے گا نا۔ پچھتاوے اور رنج کے مارے انہوں نے رونا شروع کر دیا۔

" کیا کر دیا اس کتیا کے بچے نے۔ پاپ مہا پاپ"۔ آنسو بھر آنکھیں ہسپتال کے ڈاکٹروں کی طرف اٹھا کر انہوں نے ان کی خوشامدیں شروع کر دیں۔ گڑگڑا گڑگڑا کر ان سے بنتی کی۔ "ڈاکٹر صاحب پیسے کی پرواہ نہ کریں، اس کو جس طرح بنے ٹھیک کر دیں"۔

پر ڈاکٹر کر ہی کیا سکتے تھے اب وہ کنگالی چرن کو نئے پیر تو لا کر نہیں دے سکتے تھے۔ سو وہ گھر آیا تو معذور اور محتاج برہمن کی صورت لے کر بیساکھیوں پر چلتا ہوا۔ گھر آنے پر پتہ چلا کہ ہلدر بابو کے گھر سے جسودھا کو ہر روز کھانے کا ایک پارسل ملتا رہا ہے۔

نبین پانڈے کا شمار مندر کے پجاریوں میں تیسرے نمبر پر تھا۔ اسی اعتبار سے وہ مندر کے چڑھاووں اور پرساد کے چھٹے حصے کا حقدار بنتا تھا۔ اپنے سے اونچے درجے کے پجاریوں کی لعن طعن اور دانتا کل کل سے وہ پریشان اور بجھا بجھا رہنے لگا تھا۔ اتنا کہ کبھی کبھی اپنے آپ کو بالکل ہی حقیر اور بے حقیقت کیڑے جیسا لگنے لگتا تھا۔ ان ہی دنوں اس نے راما کرشنا پر ایک فلم دیکھی اور وہ اس سے بہت متاثر ہوا اور جس بے تکلفی سے کرشنا دیوی سے باتیں کرتا تھا، اس نے بھی وہی انداز اختیار کر لیا۔ ساتھ ہی بیحد رقت آمیز لہجے میں بھجن گانا شروع کر دیتے۔ بڑی ہی گمبھیر آواز میں جو کسی زمانے میں شکتی کی پوجا کے لئے مخصوص تھی۔

ایک دن اس نے کنگالی کو بتایا کہ جب میں نے تمہاری رکھشا کرنے اور تم پر کرپا

کرنے کے لئے دیوی ماں سے پرارتھنا کی اور اس پر پھولوں کا چڑھاوا چڑھایا تو پتہ ہے پگلی نے مجھ سے کیا کہا۔ کہنے لگی: " کنگالی کے گھر میں تو میرا ہی ایک روپ موجود ہے اور وہ کنگالی ہی کی رکھشا کے لئے وہاں بس رہا ہے کہ وہ اپنے گھر صحیح سلامت لوٹ کر آئے"۔

اب ہوا یہ کہ کنگالی کے من میں شک سا ہوا، اس نے جسودھا سے سچ بات اگلوانے کے لئے اسے جھڑکیاں دینا اور برا بھلا کہنا شروع کیا۔ "اچھا تو میرے پیچھے تو یہ گن کرتی رہی تھی۔ اس بدمعاش نبین پانڈے کو پھانس رکھا تھا تو نے۔ اس کے ساتھ عیش کرتی رہی ہے۔ جسودھا نے اس کے وہمی اور شکی سر کو اپنے سینے سے چمٹا کر دونوں چھاتیوں کے درمیان بھینچ لیا اور بولی:

"لو ! اور سنو میں بھلا اس موٹے لفنگے نبین پانڈے کو بلاتی تھی۔ ارے میں اور اس چلتر باز کو منہ لگاتی۔ پھر ہر رات تو ہلدر بابو کے گھر کی دونوانیاں میرے پاس آ کر سوتی تھیں۔ ان سے پوچھو۔۔۔ ارے میں تو تھوکوں بھی نہیں۔۔۔ اس پر۔۔۔ کیوں ! کیا میں تمہاری ستی ساوتری استری نہیں ہوں !" اور پھر کنگالی کا رہا سہا شک اس وقت دور ہوا جب وہ اسپتال سے واپس آنے کے بعد ہلدر بابو کے گھر ملنے گیا۔ وہاں تو جسودھا کی پاکدامنی اور پوترتا کے ڈنکے بج رہے تھے۔ ہر ایک کی زبان پر اس کی پتی ورتا کے قصیدے تھے کہ پتنی ہو تو ایسی ہو۔ کیسا اس نے دیوی کا دوار پکڑا تھا، وہ تو بس دیوتاؤں اور سادھی سنتوں کے چرنوں میں پڑی رہتی تھی۔ بھوانی دیوی کے مندر کی پوجا پاٹ کے سارے بھوگ برتاوے پورے کئے اور بھوانی کے مندر کے دوارے بھوکی پیاسی ان اور جل کھائے پیئے بنا ہی دھرنا دے کر بیٹھ گئی تھی اور وہاں سے اس سمے تک نہ ٹلی جب تک کہ دیوی اس کے سپنے میں ایک دائی کا روپ دھار کر نہ آ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں دائی جنائی کے کام کا سامان سے بھرا ہوا تھیلا تھا۔ دیوی نے وہ تھیلا جسودھا کے ہاتھ میں تھمایا اور بولی:

" گھبراؤ نہیں کوئی چنتا والی بات نہیں تیرا آدمی جلدی ٹھیک ہو کر واپس آ جائے گا"۔

یہ باتیں سن سن کر کنگالی کے تو ہوش ہی ٹھکانے نہ رہے۔۔۔ اوپر سے ہلدر بابو بولے:" کنگالی۔۔۔۔ تو میری بات پر وشواس کرے نہ کرے، پر میں یہ ضرور کہوں گا یہ جو سورکھ لوگ ہیں نا وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر بھوانی کو اس کے سپنے میں آنا ہی تھا تو پھر دائی کا روپ دھارن کی کیا ضرورت تھی۔ آخر وہ اپنے ہی روپ میں کیوں نہ آئی۔ پر میں تو ان سے یہ کہتا ہوں

کہ بھئی دیکھونا کہ دیوی ماں ہونے کے ناطے گربھ وتی ہوتی ہے اور بچے پیدا کرتی ہے۔۔۔۔۔ اور دائی جو ہے نہ تو بچے جنوانے کا کام ہے اس کا تو۔۔۔۔۔اور پھر وہ ان کی دیکھ بھال بھی کرتی ہے۔بس اس نے سپنے میں آنے کے لئے یہی روپ دھارنا پسند کیا"۔کنگالی ان کی یہ ساری منطق سننے کے بعد بولا:

"ہلدر بابو۔۔۔۔اب میں حلوائی کی دکان پر کام کیسے کرسکوں گا۔آپ ہی سوچیں کہ میری بغل میں تو بیساکھیاں دبی ہوں گی، میں کڑھاؤ میں سے پوریاں نکالنے کے لئے کرچھا کیسے چلاؤں گا۔۔۔۔اب میرے لئے تو آپ دیوتا سمان ہیں۔کتنے لوگوں کے پالن ہار ہیں تو اب مجھ پر بھی آپ کرپا کریں۔۔۔۔۔ میں آپ سے بھیک نہیں مانگتا مگر آپ اتنی کرپا کریں کہ میرے لئے کسی ایسے کام کا بندوبست کردیں کہ میں بیٹھے بیٹھے کچھ کمائی کرلیا کروں۔میں آپ کی نیک دلی اور دیالوپن سے کوئی غلط فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا۔بس میری تو یہی اچھا ہے کہ پیٹ بھرنے جوگا ہو جاؤں"۔ہلدر بابو بولے۔۔۔۔۔"ارے ہاں ہاں کنگالی، یہ بات تو پہلے ہی میرے من میں تھی اور میں نے پہلے ہی یہ بات سوچ رکھی ہے کہ تمہارے لئے چھوٹی موٹی دکان ڈلوا دوں یہ جو میرا سامنے والا برآمدہ ہے نا۔اس میں تم بیٹھ جانا۔وہ ہوتے ہیں نا اپنے چڑوے، مرمرے اور وہ کیا ہے اپنے کھانڈ کے کھلونے اور مٹھائیاں اور کچھ اور سوکھی کھانے والی چیزیں رکھ لینا۔۔۔۔۔تم بکری کی فکر نہ کرنا۔خوب اچھی بکری ہوگی، ارے وہ کیا۔سامنے ہی تو مندر ہے بھوانی کا۔صبح سے رات تک تو یاتریوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔تمہیں گاہکوں کی تھوڑ نہیں ہوگی۔مزوں میں چلتا رہے گا تمہارا دھندا۔اب تم یہ دیکھو ان دنوں میرے ساتویں بیٹے کا بیاہ ہے۔اس لئے کچھ دن صبر کر لینا۔ بیاہ برات کا بھوج اور پکا پکایا کھانا اتنے دن تمہارے گھر پہنچتا رہے گا۔

اتنی بات سن کر جب کنگالی چرن گھر جانے کے لئے اٹھا تو وہ تو جیسے خوشی سے جھوم رہا تھا۔وہ اس تیزی سے گھر کی اور بھاگا چلا جاتا تھا، جیسے چیونٹیوں کا قافلہ برکھا رت کے آنے کی سن گن پا کر اپنے مسکنوں کی طرف بھاگتا جا رہا ہو۔گھر پہنچتے ہی اس نے جسودھا کو پکارا:"ارے سن رہی ہے نا۔۔۔۔۔ وہ کیا کہہ گئے کالیداس کہ "تم کو جو کچھ ملے گا وہ جب ہی تو ملے گا جب تمہارے پاس کچھ نہیں ہوگا۔کچھ ہوگا تو دیا ہی کیوں جائے گا۔ہاں بھئی سچ ہی تو کہا ہے نہوت کی ہوت ہے۔نہیں ہوگا جب ہی تو آئے گا۔۔۔۔ وہ کیا ہے کہ ہمارے ابھاگ سے ہی ہمارے

MashalBooks.org

بھاگ کھل گئے ہیں۔ آج ہلدر بابو نے بولا ہے کہ اپنے بیٹے کے بیاہ سے نبڑ کر وہ مجھے دکان ڈلوا دیں گے۔ ہاں اپنے گھر کے اگلے برآمدے کا کچھ حصہ بند کر کے دکان کھلوا دیں گے اور اس وقت تک بھوجن کا تیل ان کے گھر سے ہر روز ہمارے یہاں آیا کرے گا۔۔۔۔۔۔اب ذرا سوچو کہ اگر میں اپنے پیروں پر کھڑا ہوتا تو یہ سب ہم کو مل سکتا تھا؟ ارے! یہ تو سب اسی مہان ماتا کی کرپا ہے"۔

اپنی بیساکھیاں بغل میں دابے ان پر کھٹا کھٹ چلتا ہوا وہ اپنی خوش نصیبی اور بھاگوانی کی خبر یہاں وہاں تک پھیلاتا پھرا۔ جدھر جاتا یہی کہتا:

"ارے میرے تو بھاگ کھل گئے۔ یہ میرے پیر مجھے دے کیا رہے تھے"۔ بات چلتے چلتے اس کے پہلے جمباں حلوائی کی دکان تک پہنچی وہاں سے نبین پانڈے اور پھول بیچنے والے کیشو مہنتی کی دکان سے لے کر مندر کے مستقل ڈھولچی الہاس بابو تک پہنچی جس نے بھی سنا واہ واہ کرنے لگا۔ "بڑے بھاگوان ہو تمہارے تو بھاگ کھل گئے ارے بھائی یہ تو دیوی کا کرشمہ ہی ہوا نہ۔ اس کا تو یہ ہے نا کہ ایک ہاتھ سے لیتی ہے دوسرے سے دیتی ہے۔ اب ہر بات کو کلجگ کہہ کر تو نہیں ٹالا جا سکتا۔ پھر یہ تو مہان ماتا دیوی کا راج ہے کہ وہ تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے والی ہے۔ یہاں تو بھلائی اور اچھائی کا راج ہوگا، برائی کا منہ کالا ہوگا، بھلے کا بھلا اور برے کا برا ہوگا۔

اب یہی دیکھ لو کہ کنگالی چرن کے پیر کا ہے کو ضائع ہوتے اور جو ایسا ہوا بھی تو ہلدر بابو کو کیا پڑی تھی کہ وہ باہمن کے سراپ سے ڈر کر اس کی اتنی چنتا، اتنی رکھشا کرتے اور پھر سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ جسودھا کے سپنے میں دیوی آخر دائی کا ہی روپ دھار کر کیوں آئی۔۔۔۔۔ بھئی یہی سب تو دیوی کی اچھا اور کرنی ہے۔

اب حیرت تو اسی بات پر تھی کہ بھوانی جس نے ڈیڑھ سو سال پہلے اپنے درشن دیئے تھے اور سپنے میں آ کر اس جگہ مندر بنانے کا آدیش دیا تھا۔ وہ اب اس صدی کی پانچویں دہائی میں کنگالی چرن پر اپنی چھایا کرنے کو ظہور میں آ گئی ہے اور یہ جو ایک دم ہی بڑے ہلدر بابو کی سوچ بدلی ہے تو ان کے دل اور حوصلے کی اس تبدیلی میں بھی دیوی ماتا کی مرضی اور ارادہ ہی شامل ہے۔ خیر یہ بات تو سبھی مانتے تھے کہ ہلدر بابو اتنے دیالو نہیں تھے کہ یونہی منہ اٹھا کر ہر کسی کی رکھشا

کرتے پھرے۔ وہ تو اس معاملے میں بہت سوچ پرکھ کر ہی قدم اٹھانے والوں میں سے تھے۔ وہ تو آزاد ہندوستان کے باسی تھے جہاں کہا جاتا ہے کہ طبقے، مرتبے، علاقائی اور لسانی فرق اور ذات پات کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ پر ہلدر بابو نے تو برطانوی سامراجی دور میں دھن دولت جوڑ جوڑ کر ڈھیر لگائے تھے۔ انگریز حکومت کی بنیادی پالیسی لڑاؤ اور حکومت کرو تھی، یعنی لوگوں کو فرقوں مذہبوں علاقائی اور لسانی جھگڑوں میں الجھاؤ اور اپنی حکومت چلاؤ۔ تو ظاہر ہے کہ اب ان کا من بدلتے بدلتے بھی کتنا بدل سکتا تھا، وہ اسی پرانی ڈگر پر چلتے تھے۔ سو ان کا من اگر ترس کھاتا بھی تھا تو ذرا دیکھ بھال کر۔ کسی پنجابی بہاری یا گجراتی پر اعتبار تو کر سکتے نہیں تھے، نہ ہی کسی مرہٹے یا مسلمان پر اپنا دھن دولت لٹاتے۔ نہ ہی ان کا چربی کی دبیز تہوں اور بیالیس سائز کی واسکٹ تلے دبا ہوا دل کسی بہاری بچے کی خستہ حالی پر دھڑکنے کے لئے تیار تھا اور نہ ہی کسی اوڑی بھکاری کو بھکشا دینے کے لئے تڑپ اٹھتا تھا۔

بات یہ ہے کہ ہلدر بابو تو باریسال کے، جواب بنگلہ دیش میں ہے، کے رہنے والے تھے اور انہیں اپنے دیش کے سوا مغربی بنگال کی کوئی چیز بھاتی ہی نہ تھی، وہ تو یہاں کی مکھیوں کو بھی اڑتا دیکھ کر آہیں بھرنا شروع کر دیتے۔ ارے کیا مریل مکھیاں ہیں یہاں کی، ایک اپنے دیش کی مکھیاں ہوتی تھیں کیا پلی پلائی موٹی تازی مکھیاں ہوتی تھیں۔ ارے یہاں کی تو ہر چیز ہی سوکھی جھرکٹ، کال ماری ہے۔ اس جنم جلی جگہ میں کوئی چیز ڈھنگ کی نظر نہیں آتی۔۔۔۔۔ ان کی انہی باتوں کے کارن اب مندر کے باسیوں اور اس کے آس پاس کے لوگوں کو حیرانی اور اچنبھا تھا کہ اچھا اب ایک دم یہ کیا انقلاب آ گیا ان کے اندر ہی اندر کیسی تبدیلی آ گئی کہ کالی چرن پر جو گنگا کے ڈیلٹا کا باسی ہے۔ ان کو اتنا ترس آ گیا کہ اس پر رحم و کرم کی بارشیں ہی کر دیں۔ یہ بات تھی تو سوچنے کی اور اسی پر لوگوں کو حیرت تھی۔

لوگوں کو تو باتیں بنانے کا بہانہ چاہیے، وہ یہی تو کہتے تھے یا تو ہلدر باپو کی کٹھورتا اور کٹڑ پن کا یہ عالم کہ جب اپنے بھانجے بھتیجوں اور پوتے پوتیوں کو دیش کے بڑے لوگوں کے جیون کے بارے میں پڑھتے دیکھتے تو بڑا جلتے کڑھتے اور اپنے نوکروں سے کہا کرتے: "ارے یہ کیا بات ہوئی کہ ان کو پڑھائی جارہی ہیں ڈھاکہ میمن سنگھ اور جید قسم کے بڑے لوگوں کے جیون کی باتیں۔ بھئی ان کو تو باریسال کے لوگوں کی شکتی اور بڑائی کے بارے میں پڑھائیں۔ باریسال کے لوگوں کی

MashalBooks.org

بات ہی کیا ہے، وہ ان کی طرح بے ہڈی کے نہیں ہوتے، بڑی پکی ہڈیوں والے لوگ ہوتے ہیں۔ارے،ہم بولتے ہیں کہ کچھ ہی دن گزرنے دو تب جا کر کھلے گی یہ بات کہ یہ جتنے اپنشد اور وید ہیں نا سب باریسال والوں ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ہاں تو اور کیا !دیکھ لینا ایک سمے ایسا آئے گا کہ یہ بات سامنے آ کر رہے گی۔ہاں تم دیکھو گے ادھر ہلدر بابو کے چمچوں نے ان کو جھنڈے پر چڑھانا شروع کر دیا، وہ ان سے بنگالی اور انگریزی کے مضحکہ خیز حد تک ملغوبے میں کہتے۔آپ کا تو دل ہی بدل گیا ہے اور نہیں تو آپ کاہے کو اس پچھمی بنگالی پر اتنی دیا اتنی کرپا کرتے۔دیکھ لیجئے گا۔پرماتما کوئی بڑا کام لینا چاہ رہا ہے۔اس کی تو کچھ اور ہی بھاونا ہے، ان کی چکنی چپڑی باتیں مالک کو خوش کر دیتیں اور وہ دانت نکال کر ہنستے ہوئے فرماتے۔"دیکھو بھائی برہمن تو برہمن ہی رہے گا چاہے وہ کہیں کا بھی باسی ہو۔پوربو بنگالی ہو یا پچھمی کوئی فرق نہیں پڑتا۔اس کی بڑائی اپنی جگہ۔بھائی باہمن کا تو یہ ہے کہ اگر تم اس کو موتتے ہوئے دیکھو تو اس کے موت کی دھار کو بھی پرنام کرو۔۔۔۔۔"اور یہ کہتے ہوئے وہ اپنے ہی گھڑے ہوئے چٹکلے پر ٹھٹھا مار ہنس دیئے۔

ان کی نیکی اور بھل منساہٹ کی مہک پھولوں کی خوشبو کی طرح چاروں اور دور دور تک پھیل رہی تھی۔جیسے پورے ماحول اور فضا میں یہ نیکی اور دیا رچی ہوئی ہو۔یہ سب مہاماتا دیوی کی اچھا اور کرپا ہی تو تھی۔

نبین پانڈے جب بھی مہاماتا بھوانی دیوی کے بارے میں سوچتا تو وہ اس کے تصور میں بھری بھری چھاتیوں اور بڑے بڑے بھاری چوتڑوں والی جسودھا ہی کے روپ میں دھارن کرتی۔جیسے بادلوں میں تیرتی اس کے من مندر کی اور اڑی چلی آتی ہو۔اب یہ بھی عجیب اور سوچنے کی بات ہے کہ جب وہ جسودھا کے سپنے میں آئی تو دائی کا روپ دھار کر آئی اور اب جب وہ اس کے بارے میں سوچتا یا اس کے سپنے میں آتی تو جسودھا کے روپ میں۔جب اس نے اپنی الجھن کا ذکر بڑے پجاری سے کیا جو مندر کے چڑھاوے میں آدھے حصے کا حق دار تھا تو اس نے اس سے یہ کہا کہ بھئی تم پر تو پری کا سایہ ہو گیا ہے۔ یہ ایک ایسا روگ ہے جو کسی بھی عورت مرد کو لگ سکتا ہے۔تم ایسا کرو کہ اپراجیت کی جڑ اپنے کان سے لپیٹ لیا کرو، پیشاب کرتے وقت۔

نبین پانڈے بڑے پجاری کی باتوں میں کب آنے والا تھا۔ایک روز اس نے کنگالی کو گانٹھا اور یہ پٹی پڑھائی کہ دیکھو بھئی میں تو دیوی ماتا کا سیوک اور پجاری ہوں سو اب میں شکتی

MashalBooks.org

کے نام سے تو کوئی ڈھونگ رچا نہیں سکتا۔سو اب تم ایسا کرو کہ یہ بات سارے میں پھیلا دو کہ تمہارے سپنے میں گوپال کرشن آئے تھے، انہوں نے سپنے میں تم کو درشن دیئے۔ میری موسی ایک بار شری کھشیتر اپوری سے میرے لئے جو گوپال کی ایک پتھر کی مورتی لائی تھیں وہ میں تم کو دیئے دیتا ہوں۔ یہ بات کہ گوپال نے سپنے میں تم کو درس دیئے ہیں جنگل کی آگ کی طرح پھیل جائے گی۔ سارے میں ہلچل مچ جائے گی۔تم پر روپے پیسے اور ہر چیز کی بارش ہو جائے گی اور پھر تم خوب پیسہ بٹورنا۔آخر تم کو اور تمہارے پریوار کو پیٹ بھرنے کو روٹی تو چاہیے ہی ہوگی اور پھر دیکھنا کہ کمائی کے ساتھ تمہاری بدھی بھی بڑھے گی، ایسے پاک پوتر خیال تمہارے من میں براجیں گے کہ تم خود حیران رہ جاؤ گے۔

اس کی تجویز اور باتوں پر کنگالی نے اس کو جھاڑا اور شرمندہ کیا۔" کچھ تو شرم کرو دادا! ارے تم کو دیوتاؤں سے ہاتھ کرتے ڈر نہیں لگتا"۔ظاہر ہے کہ اس قسم کے جواب نے نبین پانڈے کو آگ بگولہ کر دیا ہوگا۔اس نے بھی اسے بری طرح دھتکار دیا۔

"ارے تو اتنا بول کیوں رہا ہے نہیں مانتا میری بات، تو میری بلا سے، جا تو نرک میں۔ اچھا اب یہاں سے دفع ہو۔ پر بعد کی باتوں سے پتہ چلا کہ آخر ہو کر وہی رہا۔یعنی کنگالی چرن کو نبین پانڈے کی بات پر کان دھرنا ہی پڑا، اس کے مشورے پر عمل کرنا ہی پڑا۔ ہوا یوں کہ اچانک ہی بڑے ہلدر بابو کا ہارٹ فیل ہوا اور انہوں نے پران تیاگ دیئے۔ان کی موت کنگالی اور جسودھا پر بجلی بن کر گری، ان کی تو دنیا ہی اجڑ گئی۔سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔

ہلدر بابو کی موت سے کنگالی تو بالکل ہی کنگال ہو گیا۔خالی ہاتھ جیسے دیوالیہ ہو کر رہ گیا۔کنگالی کے بارے میں دیوی کی وہ ساری اچھائیں اور کرپائیں دھری کی دھری رہ گئیں، جن کو کنگالی تک پہنچانے کا وسیلہ اور واسطہ لوگوں کے بقول دیوی نے ہلدر بابو کی ذات میں ڈھونڈا تھا۔اب تو وہ سارے سبز باغ اور مستقبل کے سہانے سپنے ہوا میں ایسے تحلیل ہوئے جیسے الیکشن کے دنوں میں کئے گئے نیتاؤں اور سیاسی پارٹیوں کے وعدے ان کے اقتدار میں آنے کے بعد معدوم ہو جاتے ہیں۔اب تو کنگالی اور جسودھا کا یہ حال تھا کہ دن میں تارے نظر آ رہے تھے، جسودھا کا تو بالکل فلم کی اس ہیروئن جیسا حال تھا، جو منزل کی تلاش میں اڑی چلی جاتی ہو، بے تکان دوڑی چلی جا رہی ہو کہ ایک دم ہی کوئی جادوئی طاقت اس کی راہ کھوٹی کر دے، اور وہ حق حیران کھڑی آسمان

کی اور تک رہی ہو۔ان کے خیالوں کا رنگین غبارہ جو مزے مزے سے اوپر اور اوپر کو اٹھتا ہی جا رہا تھا۔ایسے پھٹاک سے پھٹ کر چیتھڑے چیتھڑے ہو گیا جیسے کسی یورپی جادوگرنی کی چھڑی کی نوک سے پھٹ گیا ہو اور اب تو بری طرح پھنس کر رہ گئے تھے۔جیسے دلدل میں پھنس گئے ہوں۔ اب تو یہ نوبت تھی کہ اس کے بچے گوپال، نیپال اور رادھا رانی بلک بلک کر روٹی اور بھات مانگتے۔ ان کے جواب میں انہیں ماں کے فضیحتے اور کٹے کٹے کوسنے ہی ملتے۔اس کی تو ایسی زبان چلتی کہ سننے والے کانوں پر ہاتھ دھرتے، اس میں بچوں کا کیا قصور تھا کہ وہ کھانے کے لئے روتے اور مچلتے تھے، بات یہ ہے کہ جب سے کنگالی چرن کی ٹانگیں کٹی تھیں ہلدر بابو کے بنگلے سے آنے والے مزیدار کھانے انہیں ملتے تھے اور وہ اسی کے عادی تھے۔اب تو کنگالی بھی مٹھی بھر بھات کو ترستا تھا اور جب پیٹ کی آگ سے بوکھلا کر عجب سا طفلانہ پیار اس کے اندر سر اٹھاتا تو وہ گوپال کی طرح جسودھا سے لپٹ کر اس کی چھاتیاں چچوڑنے لگتا۔ وہ اس کو بھی دھتکار دیتی اور بڑی ہولناک گالیوں سے اس کی تواضع کرتی۔

جسودھا ٹھیٹ ہندوستانی عورت تھی۔ سچی اور کھری ہندوستانی گرہستن کی جیتی جاگتی مثال۔اپنے پتی پر جان دینے والی پتی ورتا بیوی۔بچوں پر دم چھڑکنے والی بچوں اور گھرہستی کے سلسلے میں اس کے وہی آدرش اور وہی سوچ تھی جو شروع سے چلی آتی ہے، جو دنیا کی ہر دلیل اور منطق سے ماوری اور قطعی بے نیاز ہے۔وہی آدرش جو ہندوستانی عورت کی گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں، جو اس کی ذہنیت اور سائیکی بن چکے ہیں۔سدا سے یعنی ستی ساوتری سیتا سے لے کر آج تک ہمارے وقتوں کی نروپارائے اور چاند عثمانی تک ویسے کے ویسے ہی چلے آ رہے ہیں۔ایسی کسی عورت کو دیکھ کر ہر کس و ناکس یعنی بدیسی لوگ بھی جان سکتے ہیں کہ ہندوستان کے پرانے ریت اور رواج آج تک اسی طرح چلے آ رہے ہیں بالکل زندہ، پوری قوت سے فعال اور کسی کی کیا مجال جو ان کو پیچھے ہٹائے۔پچھلے زمانوں سے عورت کے صبر، حوصلے، برداشت اور وفا کے بارے میں جو اقوال کا خزانہ موجود ہے وہ سب کی سب باتیں آج کی ہندوستانی عورت پر بھی صادق آتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جسودھا اپنے کنبے کی بدنصیبی اور مفلسی کے لئے اپنے شوہر کو ذرا بھی دوش دینے کو تیار نہ تھی۔اس کا تو یہ حال تھا کہ اپنے پتی کا خیال کرتی تو وہی ممتا اور پیار اس کے دل میں بھر آتا جو وہ اپنے بچوں کے لئے اپنے من میں محسوس کرتی تھی، وہ چاہتی تھی کہ کاش اس کا وجود

دھرتی ماں میں تبدیل ہوسکتا کہ وہ اناج اور پھلوں کی لہلہاتی فصلیں اپنے اندر سے نکال کر باہر لاسکتی اور اپنے معذور پتی اور بچوں پر نچھاور کر دیتی تا کہ ان کو کھا کر ان کے تن اور من دونوں ہی تازے ہو جائیں، ان کے من رج سکیں۔

پرانے رشیوں، منیوں نے عورت اور مرد کو فطرت کے دو عناصر ترکیبی نر اور ناری کا نام دیا ہے۔ جو ہر چیز کی پیدائش کی اساس اور بنیاد ہیں لیکن کسی نے بھی ممتا اور پیار کے اس جذبے کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا جو جسودھا کے دل میں اپنے پتی کے لئے ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ پہلے زمانوں میں اس جزیرہ نما کے ساحل پر کئی علاقوں اور قوموں کے لوگ آئے اور بسے تو ان میں جو نر یعنی مرد تھے وہ تو زمین کے بیٹے کہلائے اور جو ناریاں تھیں وہ مائیں بن گئیں، یعنی اس سرزمین کی خاصیت اور مٹی میں یہ بات ہے کہ یہاں جتنے بچے جنم لیں گے وہ تو بال گوپال بن جائیں گے اور جو ناریاں یعنی لڑکیاں جنم لیں گی ان کے بھاگ میں نندارانی بننا ہی ہوگا۔ ہاں نندارانی جو گوپال کرشنا کی منہ بولی رضاعی ماں تھی، جس نے بال کرشن کو اپنا دودھ پلا کر اپنی گود میں کھلا کر پالا پوسا تھا اور اب نندارانی کے مقابلے میں ذرا آج کی ان ابدی اور لازوال ناریوں پر بھی نظر ڈالئے جن کی تصویروں کے بڑے بڑے پوسٹر سائن بورڈوں پر اور جا بجا لگے نظر آتے ہیں۔ کہیں مونالزا مسکراتی ہوئی، کہیں سموں دیوار پدھار رہی ہیں اور ان کے شائقین کے شوق کا یہ عالم کہ پوسٹر پر پوسٹر لگائے چلے جاتے ہیں۔ ایک خراب وخستہ ہو جائے تو اس پر دوسرا نیا نکور چمچماتا پوسٹر نظر آنے لگے گا۔

اسی کارن تو اب اس نئے سماجی فریم ورک میں پڑھے لکھے بابولوگوں کا یہ چلن ہے کہ وہ جیون ساتھی ڈھونڈتے ہیں تو پہلے تو ان کا آئیڈیل نئے زمانے کی وہی آزاد خیال اور نئے آدرشوں میں ڈھلی ڈھلائی عورت ہوتی ہے، اپنے کنبے ناطے کی لڑکیوں کو وہ اس قابل نہیں سمجھتے کہ وہ ان کی جیون ساتھی بنیں۔ اچھا پھر ان کو ٹھکرا کر جب اپنی مرضی کی موڈرن عورت لاتے ہیں تو بہورانی کے گھر میں قدم رکھتے ہی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور اب ان کو ایسی عورت کی آرزو اور تمنا ستانے لگتی ہے جو نندارانی جیسے چال چلن اور سوچ کی مالک ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو ان کو پڑھی لکھی موڈرن پتنی چاہیے ہوتی ہے اور دوسری طرف اس سے ان کا یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ وہ پراچین وقتوں کی خاص الخاص گھر ہستن بن کر ان کی گھر ہستی چلائے۔ اب یہی تو کومپلکس ہے

جس کے اثر کے تحت سرت چندر بوس کے ناولوں کی ہیروئنیں اپنے پتی دیو کے آگے مزے مزے کے کھانوں کے تھال پروستی تھیں۔ مردوں کے اس کومپلکس کو سرت چندر بوس اور ان کے قبیل کے ناول نگاروں نے اچھی طرح سمجھا اور قبول کیا تھا۔ ان کے ناولوں کی ہیروئنیں ایسے ہی کردار کی مظہر ہوا کرتی تھیں۔ پر بات یہ ہے کہ ایسے کرداروں کو جتنی سادگی اور آسانی سے لکھا جاسکتا ہے اس قدر سادگی سے اصلیت اور زندگی میں ان کو پانا اور ان کا لگانا ممکن نہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ایک بہت پیچیدہ اور الجھا ہوا مسئلہ ہے۔ جس کے بارے میں ٹھنڈے دل سے سوچنے کی ضرورت ہے۔ پوری ایک شام ٹھنڈے ٹھنڈے بیل پانا (بیل کے شربت) کے گلاس سے مزے مزے کی چسکیاں لے لے کر پیتے ہوئے غور وفکر کرنے کی بات یہ ہے کہ مغربی بنگال کے زیادہ تر اہل قلم اور دانش ور جن کو سوچ وچار میں اپنا مغز کھپانا پڑتا ہے عموماً پیچش کے مریض بن کر رہ جاتے ہیں اور آنتوں کی شدید پیچش کا روگ ان کو بیل پانا کے شربت کا سہارا لینے پر مجبور کر دیتا ہے اور سبب اس کا یہ ہے کہ اس دور میں ہم اپنی بیل بوٹیوں سے بننے والی دواؤں کے استعمال اور افادیت سے لاعلم ہوتے جارہے ہیں اور ان کو ترک کرتے وقت یہ دھیان نہیں رکھتے کہ وہ اس طرح کس نعمت سے محروم ہو رہے ہیں۔

اچھا تو خیر ان باتوں کا جسودھا کے قصے سے کیا تعلق اور اگر ہو بھی تو ان تفصیلات میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ پڑھنے والوں کے صبر کو اس درجہ آزمانے سے فائدہ؟ آخر اس کا دماغ ہے کلکتہ کی سڑکوں کے گڈھے تو نہیں کہ ان کو پاٹنے کے لئے چاہے جتنا کوڑا کرکٹ ڈالتے جاؤ۔ ان کا پیٹ نہیں بھرتا۔ پڑھنے والے کا تو جی اوبھ بھی سکتا ہے اتنی غیر متعلق اور ادھر ادھر کی باتوں سے۔ اصل میں ان باتوں کا جسودھا کے قصے سے اتنا ہی ناطہ بن سکتا ہے کہ وہ اس تمام صورت حال کے نتیجے میں بری طرح پھنس کر رہ گئی تھی۔ بڑے ہلدر بابو کے مرنے کے بعد ان کے کرپا کرم کی رسمیں پوری ہونے تک ان کے تیجے دسویں اور چالیسویں تک اس کا اور اس کے بچوں کا بھوج پتل ان کے گھر پہنچتا رہا اور وہ سب خوب سیر ہو ہو کر کھاتے رہے۔۔۔۔۔ اس کے بعد ایک روز جسودھا ہلدر بابو کی پتنی کے پاس گئی اور رادھا رانی کو اپنے سینے سے چمٹا کر رو رو کر اس نے التجا کی کہ اس کی رسوئی کی ملازمت برقرار رہنے دیں۔

ہلدر بابو کی پتنی کا دل پتی کے مرنے سے بہت ٹوٹا ہوا اور نراش ہو رہا تھا، پر ان ہی

MashalBooks.org

دنوں ان کی فیملی کے وکیل نے انہیں خبر دی تھی کہ ہلدر بابو یہ مکان ان کے نام کر گئے ہیں، اس کے علاوہ چاول کی آڑھت کا ہول سیل بزنس بھی ان ہی کی ملکیت کر گئے ہیں، اس خبر سے ان کے دل کو بڑی تقویت ملی ان کا حوصلہ اور زندہ رہنے کی خواہش پھر سے تازہ ہوگئی اور انہوں نے گھر گرہستی کے کاموں میں نئے سرے سے دلچسپی لینا شروع کر دی۔ پتی کے مرنے کے بعد شروع شروع میں تو وہ یہ سوچ سوچ کر بہت دکھی ہوگئی تھیں کہ اب ان کو من بھاتا اور من چاہا کھانا خصوصاً مچھلی کے بہترین حصے مثلاً مچھلی کے سروں کا شوربہ جیسی نعمتیں نصیب نہ ہوں گی۔ ایسی عیاشیوں اور لذتوں کے لئے اب وہ سدا ترسا ہی کریں گی۔ پر اس خبر کے ملنے کے بعد ان کو پتہ چلا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ اب تو گائے کے دودھ سے نکلا ہوا خالص گھی، گائے کے نفیس اور گاڑھے گاڑھے دودھ کی کھیر، اعلیٰ قسم کے کیلوں اور میٹھے دہی اور گنگو رام کی دکان کے مشہور اور معروف سندیشوں کے سہارے زندگی گزاری جاسکے گی۔

سو اب جیون کا یہ طور اور چلن تھا کہ ہلدر بابو کی ودھوا آرام سے پیڑھی پر ڈھٹی بیٹھی ہیں اور امن چین سے اندر باہر حکم چلا رہی ہیں۔ خوش حالی اور مرغن کھانوں کے اثر سے چہرا دمک رہا ہے گود میں چھ مہینے کا پوتا لئے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ اب تک وہ اپنے چھ پوت بیاہ چکی تھیں اور جنتری اور جنم پتریوں کی ہدایتوں کے مطابق ہر جوڑے کو مہینے کی ایک مخصوص تاریخ کو ہمبستری لازماً کرنا ہوتی۔ اس کے نتیجے میں ظاہر ہے ان کی نچلی منزل میں ایک لائن سے بنے ہوئے کمروں میں زچہ خانے سدا تیار رہتے تھے۔ یہ کمرے خاص طور پر اسی مقصد سے بنائے گئے تھے اور شاید ہی کوئی زچہ خانہ خالی اور فارغ نظر آتا تھا۔ دائی سرلا اور لیڈی ڈاکٹر کا ہلدر ہاؤس میں مستقل آنا جانا رہتا تھا۔ پھر مالکن کی چھ عدد بیاہی بیٹیاں بھی تو تھیں جو ہر آٹھویں مہینے زچگی کے لئے زچہ خانے اور گود کے بچوں کے پورے ساز و سامان سے لدی پھندی پہنچ جاتی تھیں۔ ہلدر ہاؤس میں جدھر دیکھو پوتڑے، ڈائپرز، دودھ کی بوتلیں، ربر شیٹیں، چسنیاں اور بے بی جانسن پاؤڈر کے ڈبے وبا کی طرح پھیلے نظر آتے تھے۔

ہوا یوں کہ مسز ہلدر پوتے کو گود میں لے کر ہلا ہلا کر بہلا بہلا کر دودھ پلانے کی جدوجہد کرتے کرتے اتنی پست اور بے حال ہو چکی تھیں کہ جیسے ہی انہوں نے جسودھا کو آتے دیکھا سکھ کی سانس لی اور چلا کر کہا: "اری جسودھا ! تو مجھے بھگوان کی دین معلوم ہو رہی ہے۔ ذرا

MashalBooks.org

اس کو پکڑ اور تھوڑا دودھ تو پلا دے اس کو، کب سے بھوکا رو رہا ہے۔ ماں اس کی بیمار ہے، میں تیری بنتی کرتی ہوں، اس کو ذرا سا دودھ تو پلا دے۔ کیسا بلک رہا ہے۔ ضدی اتنا ہے کہ بوتل کو ہرگز ہرگز منہ نہیں لگائے گا"۔

ان کے کہنے پر جسودھا وہیں رک گئی اور رات کے نو بجے تک بچے کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنا دودھ پلاتی رہی۔ اس کے بدلے میں مالکن نے رسوئیے کو حکم دیا کہ اس کے بچوں کو اور پتی کو ہانڈی بھر کے بھات اور بھاجی وغیرہ بھیج دے۔ دن بھر میں کئی بار جسودھا نے بچے کو اپنی چھاتی سے لگا کر دودھ پلاتے ہوئے مالکن کے آگے یہ سوال اٹھایا:

"ماں، ہم بولتے کہ مالک جندہ رہے، تو بولتے تھے کنگالی کو ہم یہ کرادیں گے وہ کرادیں گے۔ پر اب وہ تو رہے نہیں، میں پچھلی بات کو دہرانا بھی نہیں چاہتی۔ جو بات اور جو سمے گجر گیا سو گجر گیا۔ وہ باتیں تو اب مالک کے ساتھ ہی ختم ہو گئیں۔ پر یہ تو آپ کے سوچنے والی بات ہے کہ یہ آپ کا دکھیا باہمن بیٹا جو دونوں ٹانگوں سے اپاہج ہوا بیٹھا ہے، اس کا کیا بنے گا۔ ماں مجھے اپنی نہیں اپنے پتی اور بچوں کی چنتا کھائے جاتی ہے کہ اسی کھاترتو میں آپ کے آگے بنتی کرنے آ گئی ہوں کہ ہم پر اور ہمرے بچوں پر دیا کر کے ہمیں کوئی تو نوکری دے دیں اور کچھ نہیں تو اپنی رسوئی میں پکانے کے کام پر ہی رکھ لیں"۔

اس کی بات سن کر وہ سوچ میں پڑ گئیں، بولیں: "اچھا تھوڑا صبر کرو، کچھ سوچتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ یہ ہلدر جننی کے دل میں باہمنوں پنڈتوں کے لئے وہ عقیدت اور احترام تھا ہی نہیں جو ہلدر بابو کے دل میں تھا۔ دوسری بات یہ کہ کسی طرح بھی اپنے لاڈلے پوت کی ذات سے کنگالی چرن کے حادثے کا تعلق ماننے کو تیار نہ تھیں کہ اس دوپہر کے سمے والی دھما چوکڑی اور شوق کا نتیجہ تھا۔ ان کا تو یہ کہنا تھا کہ یہ تو کنگالی چرن کے بھاگ کا لیکھ تھا، پرماتما کی یہی اچھا تھی، ورنہ کاہے وہ اتنی بھری گھام اور چڑھتی دوپہر میں منہ چیرے ہنستا کھل کھلاتا ٹھیک اسی جگہ جا کھڑا ہوا جہاں سے بچے کو گاڑی چلاتے ہوئے گزرنا تھا۔ اب یہ تو کرم کی کرنی ہے اس میں کسی اور کا کیا دوش۔ ہونی تھی ہو کر رہی۔ کچھ دیر چپ بیٹھی خالی خالی نظروں سے وہ جسودھا کو دودھ پلاتے دیکھتی رہیں، پھر ایک دم ہی کچھ کر دودھ کچھ جلن اور کچھ تعریف بھری آواز میں چلا اٹھیں ۔۔۔۔۔۔ "واہ۔۔۔ واہ۔۔۔۔ ارے جسودھا تجھے تو ایشور نے اوپر سے ہی "کامادھینو" بنا کر بھیجا ہے۔ دودھیل

دیوی گیا ماں سمان جنم دیا ہے۔ ذرا دیکھو چھاتیوں سے کیسا سر سر دودھ بہتا ہے۔ بس بچے کے منہ لگانے کی دیر ہوتی ہے۔۔۔۔۔ ارے ایک میرے گھر میں یہ کال ماریاں آئی ہیں۔ مجال نہیں جو کسی کی چھاتی میں دودھ اترتا ہو۔ بچے چھاتیاں چچوڑ چچوڑ کر پیٹ بھر دودھ بھی نہیں پاتے۔ بالکل سوکھی چٹانیں ہیں ان کی چھاتیاں تو"۔

اب یہ ساری تعریف سن کر جسودھا کو بڑی تسلی سی ہو گئی۔ اس نے بڑا اطمینان سا محسوس کیا۔ اس نے فخر یہ یہ بتایا۔ "یہ کوئی کہنے والی بات تو نہیں پر ماں ہم بتائیں کہ یہ گوپال تین برس کا ہو گیا۔ ابھی یہ چھوٹی والی ہمرے پیٹ میں آئی بھی نہیں تھی کہ ہماری چھاتیاں اسی طرح دودھ سے چھلکا کرتی تھیں۔ میں تو حیران ہوں یہ اتنا ڈھیروں ڈھیر دودھ بنتا کیسے ہے۔ ہمیں تو اپنے دھندوں میں اپنی سدھ بدھ نہیں ہوتی۔ پھر کھانے پینے میں کوئی ایسی چیز بھی نہیں جڑتی جو طاقت دے، ہماری جان بنائے"۔

رات ہوتے ہوتے جسودھا کے دودھ کے چرچے گھر بھر کی عورتوں کی زبان پر تھے، جس کو سنو ایک ہی بات۔ جسودھا کے دودھ کی دھاروں کے قصے ہوتے ہوتے یہ بات مردوں کے کانوں تک بھی پہنچی۔ ہلدر جنّی کا دوسرا بیٹا جس کی بیوی ان دنوں بیمار تھی، اس کے بچے کو جسودھا دودھ پلانے بیٹھ گئی تھی۔ وہ غضب کا زن مرید تھا۔ بالکل ہی بیوی کے پلو سے بندھا ہوا۔ اس کے دوسرے بھائیوں کا یہ تھا کہ بیوی سے صحبت اور بچے پیدا کرنے کے لئے اپنے ازدواجی معاملات میں جنتری اور جنم پتریوں سے صلاح مشورہ کئے بغیر کوئی قدم نہ اٹھاتے تھے۔ وہ تو بیوی سے ملنے اور بچہ پیدا کرنے کے لئے مناسب سمے کا انتظار کرتے جو جنتری کے حساب سے ان کے لئے شبھ اور مناسب ہوتا۔ ان وقفوں میں وہ اپنے کاروبار اور دھندوں کی جوڑ توڑ اور مول تول میں الجھے رہتے یا پھر اس شبھ گھڑی کی گھڑیاں گنتے گنتے ان کے دلوں میں اپنی اپنی پتنیوں کی چاہ اور زیادہ ہو جاتی۔ پر یہ دوسرا والا تو ہر گھڑی اپنی پتنی کی جان کو لگا رہتا۔ اس کے پیٹ میں بچہ ہو یا وہ کسی بھی حال میں ہو وہ اس کا پنڈ نہ چھوڑتا تھا۔ بچے کی پیدائش بیوی کے گربھ اور پیر بھاری ہونے کے معاملے میں وہ کسی جنتری یا شبھ گھڑی کی کامنا کا قائل نہ تھا، وہ تو اس سب کو بھگوان کی اچھا اور ایشور کی دین پر محمول کرتا تھا۔ بس اس کا تو ایک دردسر تھا کہ اس کی بیوی دیکھنے میں اچھی لگے۔ ایک دم نازک بدن اور تر و تازہ۔ وہ ہر وقت اسی بارے میں سوچتا اور پریشان رہا کرتا تھا کہ بچوں

MashalBooks.org

کی تلے اوپر پیدائش کے ساتھ ساتھ بیوی کو جوان اور تر و تازہ رکھنے کی کیا ترکیب ہوسکتی ہے اور اب جو اس کی بیوی نے جسودھا کے دودھ کی افراط کی بات کی تو وہ ایک دم چونک کر بول اٹھا:

"ارے واہ۔۔۔۔۔۔کیا بات ہے۔ترکیب سمجھ میں آ گئی۔مشکل کا حل مل گیا"۔

"کیا مل گیا؟۔۔۔۔۔۔کیسی ترکیب سمجھ میں آ گئی؟"

"ارے بھئی وہی تمہاری مشکلوں کا حل"۔

"لو اور سنو ! میری مشکل کا حل اور میری تکلیفوں سے نجات تو اسی وقت ممکن ہو گی جب میں شمشان کو سدھاروں گی۔ یہ بتاؤ کہ میری صحت کس طرح ٹھیک ہوسکتی ہے کہ سال پیچھے تو جایا ہوتا ہے۔سال پیچھے بچہ جن کر صحت کیسے اچھی رہ سکتی ہے"۔

"ارے بھائی وہی تو ترکیب سوجھی ہے کہ جس سے تمہاری صحت پر اچھا اثر پڑے گا۔ بھلے تم ہر برس بچہ پیدا کرتی رہو۔ پر ایک ایسی خداداد مشین ہاتھ لگی ہے کہ تم چاہے جتنے بچے جنو گی تمہارا فگر ذرا نہیں بگڑے گا۔تم ویسی کی ویسی ہی نظر آؤ گی"۔

چنانچہ میاں بیوی نے بہو کی بیماری اور ناتوانی کی ایک من گھڑت کہانی تیار کی اور اگلے ہی دن سویرے سویرے بیٹے صاحب ماں کے کمرے میں پہنچ کر ان سے بڑی راز داری میں کھسر پھسر کرتے رہے۔ پہلے تو ماں بیٹے کی بات اور تجویز پر کان دھرنے کو تیار ہی نہ تھیں۔ پھر کچھ دیر کی سوچ وچار کے بعد انہیں یہ تجویز بہت ہی قیمتی معلوم ہونے لگی۔ سچ تو ہے کہ بہوئیں گھر میں آتی ہیں بیٹوں کی دل بستگی کے لئے اور پھر قانون قدرت ہی یہ ہے کہ وہ بچے بھی جنیں گی سال پیچھے۔ بچے ہوں گے تو وہ ان کو دودھ بھی پلائیں گی اور پھر دوسرے کھکیڑ سے بچنے کے لئے وہ اس کا دودھ چھڑانے کے بجائے جس قدر دیر تک ممکن ہوا سے دودھ پلاتی رہیں گی۔اس طرح بہت جلد ان کا جوبن اور رعنائی ختم ہو جائے گی اور پھر ان کے بیٹوں کو باہر کی لگائیوں کے پیچھے بھاگنا پڑے گا اور کچھ نہیں تو گھر میں کام کرنے والی نوکرانیوں ہی سے آنکھ مٹکا شروع ہو جائے گا اور اس میں وہ کسی کو بھی الزام نہیں دے سکتیں کیونکہ فطرت کا یہی تقاضہ ہے کہ جانور بھی ہری بھری گھاس پر ہی منہ مارتا ہے۔سو کیا برائی ہے جو جسودھا کو دودھ پلانے کے کام پر مستقل لگا لیا جائے۔گھر میں جنم لینے والے سارے بچے اس کا دودھ پی کر پل بڑھ جائیں۔جسودھا کی غریبی اور بھوک کا حل بھی یہی ہو سکتا ہے۔ دودھ پلائی کے کچھ معاوضے کے علاوہ ہر روز کھانے سے بھری ٹوکری اس کے گھر پہنچ

MashalBooks.org

جایا کرے گی تو اس کے پریوار کا پیٹ بھی بھرے گا، ایک بات یہ بھی ہے کہ گھر میں چوبیس گھنٹے ایک اونچی ذات کی برہمنی موجود رہے گی تو تیج تیوہار کے وقت بھی اسی سے کام چل جایا کرے گا۔ باہر سے پنڈت، برہمن بلانا نہیں پڑیں گے۔ ان کے بجائے پرشاد اور دکھشنا بھی جسودھا ہی کو مل جایا کرے گا اور خاص خاص موقعے پر دیئے جانے والے جوڑے بھی اسی کو مل جائیں گے، اس طرح ہمارا کام بھی چلتا رہے گا اور جسودھا کے پریوار کی سہائتا بھی ہو جائے گی۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ جسودھا اور اس کے پریوار کو اس حال کو پہنچانے والا بھی تو ان کا چھوٹا بیٹا ہی تو ہے۔ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی تو تھی نہیں۔ وہ بھی جانتی تھیں، منہ سے نہ کہیں وہ بات دوسری تھی۔

جسودھا کو جب ہلدر جننی کی جانب سے یہ پیش کش ہوئی تو اس کو تو یوں لگا جیسے اسے حکومت میں وزارت کی پیش کش کی گئی ہو۔ اچانک ہی اس کو اپنی بھری بھری اور بڑی بڑی چھاتیوں کے قیمتی اور ان مول ہونے کا احساس ہوا۔ اس رات جب کنگالی چرن نے ان سے چھیڑ چھاڑ شروع کی تو اس نے اس کو ٹوک دیا:

"دیکھ رے۔۔۔۔۔ ان ہی کے بل بوتے پر تو میں اور یہ گھر اور پریوار چلا رہی ہوں۔ ذرا سنبھل کر دھیرج سے ہاتھ لگایا کر"۔ اس رات تو کنگالی چرن کا منہ لٹک گیا تھا۔ وہ بے دلی ہی سے اس کے ساتھ پڑا رہا تھا، پر جب چاولوں، دال، بھاجی اور تر تراتے گھی کی کٹوریوں سے لبالب بھری ٹوکری گھر بیٹھے ملنے لگی تو اس کے جذبات بدلنے لگے۔ اب وہ اپنے اور جسودھا کے درمیان محبت کے نرم و نازک جذبوں سے عاری ہو گیا تھا۔ لگتا تھا اب اس کے اندر گوپال (کرشن) کے بجائے برہما، جو سنسار کا خالق ہے آ براجا ہو۔ اس نے جسودھا کو سمجھایا کہ جانتا ہوں تمہاری چھاتیاں سدا دودھ سے چھلکتی رہیں گی، اس لئے کہ یہی دیوی ماں کی اشیر باد اور اچھا ہے۔ پر چھاتیوں میں دودھ تو جب ہی اترے گا نا جب تمہاری کوکھ میں بچہ ہوگا۔ اس کے لئے تم کو کچھ کشٹ اٹھانا پڑے گا۔ تم کو گربھ اور جاپے کا کشٹ دکھ اور درد بھوگنا تو پڑے گا تا کہ تم ان کے بچوں کو دودھ پلاتی رہو۔ یاد ہے تم کو دیوی ماں نے درشن دیئے تو یہی بات بولی تھی کہ تم اپنے بچے جنتی اور دوسروں کے بچوں کو دودھ پلاتی رہو گی۔ اسی کر کے وہ تمہارے سپنے میں دائی کا روپ دھارن کر کے آئی تھی"۔

جسودھا چپ بیٹھی کنگالی چرن کی بات سنتی رہی تھی۔اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ یہ سب سن کر بولی: "پتی دیو۔۔۔۔۔۔۔تم میرے مالک ہو، دیوتا ہو اور تم ہی میرے گرو۔۔۔۔۔۔ہو۔۔۔۔۔۔۔مجھ سے جو کوئی بھی بھول چوک ہو تو تم ہی مجھے ٹوکو گے اور سیدھی ڈگر پر ڈالو گے۔تمہارے آگے میں کیا ہوں یہ مجھے معلوم ہے، جب جب میں لڑکھڑاؤں گی، تم ہی مجھے سنبھالو گے اور سہارا دو گے اور سوامی جی، یہ تم نے کیا کہہ دیا۔گربھ اور جاپے میں کشٹ ہو گی۔ بالکل نہیں۔ دیکھو نا ہلدر جننی نے تیرہ بچے کوکھ میں رکھے اور جنمے، ان کو کیا دکھ ہوا، کون سا کشٹ اٹھایا انہوں نے۔ارے کہیں پھل دار پیڑ کو پھل دینے سے کوئی دکھ ہوا ہو گا"۔

چنانچہ اب یہ بات طے ہو گئی۔کنگالی چرن پیشہ ور باپ اور جسودھا پیشہ ور ماں بن گئے۔ ہلدر ہاؤس کی نچلی منزل کے احاطے میں کوئی درجن کے قریب تندرست چکنی چپڑی دودھیل گائیں بندھی رہتی تھیں۔ان کی سیوا کی خاطر دو بھوج پوری لا کر رکھے گئے تھے، جن کے نزدیک گئو ماتا۔ پوتر ماں کا درجہ رکھتی تھی اور وہ گئو ماتا کی سیوا ہی کو اپنا دین دھرم جانتے تھے۔ وہ ان کی سیوا بڑی لگن اور عقیدت سے کرتے۔ گیئوں کے کھانے کو منوں چارہ سبز گھاس اور چری آتی تھی۔اس کے علاوہ کھل بنولہ کچی کھانڈ کی راب ہر وقت موجود رہتی تھی کہ ہلدر جننی کا یہ اصول تھا کہ جو گائے جتنا زیادہ دودھ دے گی، اتنا ہی اس کو کھلانے کی ضرورت ہو گی۔

اب جسودھا کی پوزیشن ان مقدس گئیوں سے بہت زیادہ بن چکی تھی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ ہلدر جننی کے بیٹے بچے پیدا کرنے میں اپنی آپ مثال تھے۔ وہ تو اس سنسار کے جنم داتا سے مقابلہ کر رہے تھے اور ان کی پیدا کی ہوئی مخلوق جسودھا کی دودھ کی دھاروں پر پروان چڑھ رہی تھی۔ بڑی ماں کا یہ تھا کہ وہ جسودھا کی خوراک اور ہر بات کا خیال رکھتی تھیں۔ایک دن انہوں نے کنگالی چرن کو گھر پر بلوایا اور اس سے کہا:

"دیکھو !تم تو حلوائی کی دکان پر پوری بھاجی ہی بنایا کرتے تھے۔اب تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ تم اپنے گھر کا چوکا چولہا سنبھال لو۔ دیکھونا !اب وہ اپنے بچوں کو دودھ پلا رہی ہے اور تین بچوں کو یہاں دودھ پلاتی ہے تو اگر تم چوکے برتن کی ذمہ واری اٹھا لو تو ہماری لڑکی کو گھڑی بھر آرام کرنے، وقت ہی مل جائے گا۔اب دیکھونا !یہاں سے جا کر اس کے لئے چوکا چولہا کرنا تو مشکل ہے"۔

MashalBooks.org

اب کنگالی چرن کو عقل آئی اور وہ بہت کچھ سمجھ گیا۔ نیچے اترا تو دونوں بھوج پوریوں نے اس کو تھوڑی تمباکو چبانے کو دی اور کہا:

"مالکن ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔ دیکھو نا ہم ان دودھیل گئیوں کی کتنی سیوا کرتے ہیں۔ ارے، ہم تو ان کو ماتا سمان مانتے ہیں اور اب تم دیکھو کہ تمہاری گھر والی تو ماتا ہی ہے ساروں کی ماتا۔ مانو سنسار کی ماتا ہے"۔

چنانچہ اب یہی ہوا کہ مالکن ہلدر جننی کے حکم پر کنگالی چرن نے گھر پر رسوئی کرنا شروع کر دی۔ دھیرے دھیرے اپنے بچوں سے چولھے چوکے کے کاموں میں مدد لے لیتا اب وہ بہترین بنگالی ترکیبوں سے دالیں، بھاجیاں اور چٹ پٹے مزے دار کھانے تیار کرتا۔ خاص طور پر کیلے کی کچی گاچھ ہری اور سوکھی دونوں ہی طرح سے چٹ پٹا سالن بناتا۔ یہاں تک کہ مندر پر چڑھاوے چڑھنے والے بکروں کی سریاں گرم مصالحے ڈال کر ایسا سالن بناتا کہ کھانے والا انگلیاں ہی چاٹتا رہ جائے۔ وہ یہ مزے مزے کے چٹ پٹے کھانے اپنی زبان کے چٹخارے ہی کے لئے نہیں بناتا تھا بلکہ اس کے پیچھے ایک مقصد بھی تھا اور اس ترکیب سے اپنا کام نکالنا چاہ رہا تھا۔ ان مرغن اور چٹ پٹے کھانوں کے تھال کے تھال جب اس نے نبین پانڈے کے آگے لگا کر اس کے حلق کے راستے اس کے دل میں اترنے کی کوشش کی تو یہ کام بڑی آسانی سے ہو گیا۔ اس کے ہاتھ کے چٹ پٹے مرغن اور مصالحے دار کھانوں کے ساتھ ساتھ بھنگ ہیروئن اور شراب کے نشے میں دھت رہنے والا نبین پانڈے کنگالی سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اس کو شیو کے مندر میں لگوا دیا۔

ادھر جسودھا کا یہ حال کہ اس کا وجود پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کے افسروں کے بینک بیلنس کی طرح پھولتا اور پھیلتا جا رہا تھا۔ بات یہ تھی کہ گھر جاتی تو کنگالی کے ہاتھ کے گرما گرم ترتراتے چٹ پٹے مصالحے دار کھانے اس کی راہ دیکھتے ہوتے اور وہ بھی خوب ڈٹ کر کھاتی اور پر سے ہلدر جننی بڑی تاکید سے اس کو دودھ پلواتیں، گاڑھے گاڑھے دودھ کا گلاس اور پھر جیسے ہی ان کے کان میں بھنک پڑتی کہ جسودھا کا پیر بھاری ہے پھر سے گربھ ہے اسی دن سے وہ اس کو ہر طرح کی چٹنیاں، اچار، چاٹیں اور مربے ہر قسم کی کھٹی میٹھی چیزیں بھجوانا شروع کر دیتیں۔ اس کی یہ آؤ بھگت اور ٹھاٹ دیکھ کر تو دیکھنے والوں کے دلوں میں یہ بات پکی طرح بیٹھ گئی کہ نہیں بھئی یہ

MashalBooks.org

کوئی انسان کے بس کی بات نہیں۔ جسودھا پر تو دیوی کی سہائتا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو ماتا دیوی اس کے سپنے میں کاہے دائی کے روپ میں پدھارتی۔ وہ اس کے سپنے میں آئی تو بغل میں دائی جنائی کا کام کرنے والیوں جیسا تھیلا دبا ہوا تھا اور نہیں تو کیا، دیکھا ہے کبھی کسی عورت کو اتنی جلدی جلدی گر بھ وتی ہوتے۔ ہم نے تو کبھی دیکھا نہ سنا کہ عورت کا لگا تار امید سے ہونا اور پھر چھاتیاں بھی دودھ سے بھری رہیں۔ بھلا کس میں یہ بوتا ہے کہ بچے بھی جنے جائے۔ پرائے بچوں کو دودھ بھی پلائے جائے اور آئے دن گر بھ کا کشٹ بھی اٹھاتی رہے۔ دیکھو نا دوسروں کے بچوں کو گیا کی طرح دودھ کی دھاروں پر پالتی ہے۔ نہیں بھئی اس میں کوئی بھید ہے۔ دیوی ماتا کی کرپا اور اچھا ہی کا تو کرشمہ ہے، اب جو ایسی باتوں کا چرچا علاقے اور آس پاس میں پھیلنے لگا۔ نبین پانڈے کی وہ بکواس اور خرافات جو اس کے بارے میں کرتا تھا۔ جھاگ کی طرح بیٹھتی گئی اور آپ ہی آپ دم توڑنے لگی۔ نبین پانڈے کا تو یہ تھا کہ مزے دار گھر میں تر تراتے چٹ پٹ مزے دار کھانے اور خاص کر کے دیوی ماتا کے مندر کے چڑھاوے والے بکرے کی سری کا تیز اور گرم مصالحوں والا سالن کھا کھا کر اوپر سے شراب اور بھنگ پی کر اتنا دھت رہنے لگا تھا کہ اس کے اندر کے وہ فاسد اور فحش جذبے اور خیال جو جسودھا پر نظر پڑتے ہی مچلنے لگتے تھے، اب ٹھنڈے پڑنے لگے تھے۔ اس کے اندر ایک جمود اور بے خودی کے عالم میں اب پوترتا اور تقدس کا احساس جاگنے لگا تھا۔ اب وہ اس کو ماں سمان معلوم ہونے لگی تھی۔ اس کو دیکھ کر دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتا۔ بندگی، ماتا۔۔۔۔۔۔ دیوی ماں"۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورے علاقے میں دیوی بھوانی کے اس روپ کا ہی چرچا ہونے لگا۔ اسی کے نام کی مالا جپی جانے لگی۔ اس دیوی کی عظمت اور شان کے مداحوں کا حلقہ برقی رو کی طرح یہاں سے وہاں تک پھیل گیا۔ جسودھا کا اتنا اونچا درجہ تھا کہ وہ ہلدر ہاؤس کے علاوہ پورے علاقے میں بڑی اہم سمجھی جاتی تھی۔ ہر تقریب اور ہر رسم، مرنے جینے کی ہر رسم، شادی بیاہ، بچے کی پیدائش، جینو جیسی رسومات اسی کے ہاتھوں انجام پاتی تھیں۔ جسودھا کے ساتھ ساتھ اس کے اپنے بچوں کی اہمیت اور عزت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے لڑکے نیپال، گوپال، نینو، بونچا اور پٹیل سب ہی لوگوں کی نظروں میں معزز اور معتبر تھے اور اب تو وہ دھاگے گنڈے کا کام بھی کرنے لگے تھے۔ یاتریوں کو گھیر گھار کر وہ مندر میں لانے لگے۔ کنگالی کو اپنی بیٹیوں رادھا رانی، آلتا رانی اور پدما رانی کے لئے بر بھی کھوجنا نہیں پڑے، یہ کام نبین پانڈے نے بڑی دیکھ بھال کے ساتھ کر دیا

MashalBooks.org

تھا۔ پاک پوتر ماں کی ستی ساوتری بیٹیاں اپنے اپنے شیومہاراج کے گھر بسانے جا بیٹھیں۔ ادھر ہلدر ہاؤس میں جسودھا کی اہمیت اور ہر دلعزیزی کا تو پوچھو ہی نہ کہ اب ان کی بہویں اپنے خاوندوں کو ملن اور ملاپ کی شبھ گھڑی کے لئے جنتری کو ٹٹولتے دیکھ کر بوکھلاتی نہ تھیں، نہ ہی ان کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑنے لگتے تھے، اس چنتا میں کہ ابھی ایک گود میں ہے، اس کا دودھ پلا رہی ہے تو ایک کوکھ میں آ کودے گا۔ اب تو یہ تھا کہ وہ ہلدر ہاؤس کے بیٹوں کو ہر سمے راضی کرنے کو تیار تھیں کہ بچے تو پل ہی رہے تھے، جسودھا کے دودھ پر۔ ان کی ماؤں اور باپوں کو گوپال، گوپی کرشنا کا ناٹک رچانے کی چھوٹ ملی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ اب وہ کس بہانے اپنے پتی دیو کے اشارے کنائے، نہ سمجھتیں۔ چنانچہ یوں ان کے خاوند بھی مطمئن اور خوش نظر آتے تھے۔

ادھر ان کی بیویوں کو یہ سکون تھا کہ اب وہ اپنے فگر بنا سکیں گی اور نئے فیشن کی چولیاں اور نئے اسٹائل کی بریزیر بڑے آرام اور بے فکری سے پہن سکیں گی۔ شیوراتری کے موقع پر پوری پوری رات اطمینان سے بیٹھ کر فلم دیکھ سکیں گی کہ پہلے تو یہی دھڑ کا لگا رہتا کہ بچہ نہ جاگ جائے اور یہ کہ اٹھ کر اس کو دودھ پلانا ہے۔ یہ ساری بے فکری اور آزادی جسودھا ہی کے دم سے تو تھی۔

ادھر جسودھا بھی اپنی اہمیت سے خوب آگاہ تھی۔ اس کی اپنی ایک رائے تھی، جس کا اظہار وہ موقعے موقعے سے کرتی رہتی تھی۔ اب حالت یہ تھی کہ مزے سے بڑی مالکن کے کمرے میں بیٹھی کسی نہ کسی بچے کو دودھ پلاتے پلاتے کسی پر اعتراض کر رہی ہے کسی پر طنز کر رہی ہے، غرض کہ کسی نہ کسی بات پر اپنی رائے اور خیالات کا اظہار کرتی رہتی۔ بیچ میں پٹر پٹر بولتے رہنا اس کی عادت سی بن کر رہ گئی تھی۔ کبھی کہہ رہی ہے:

"ارے ماں ہم کہتے ہیں عورت تو پیدا ہی بچہ جننے کے لئے ہوئی ہے۔ اب یہ تو ہم نے سنا نہیں کہ گھڑی گھڑی ڈاکٹر بلایا جائے، بلڈ پریشر چیک کرنے کے لئے۔ ارے ہمارے بھی سال پیچھے بچہ پیدا ہوتا ہے پوچھو ہماری صحت پر کیا اثر پڑ گیا۔ لو اور سنو دودھ خشک کرنے کے انجکشن لگوائے جا رہے ہیں لو اور ہوئی بھلا کیا ضرورت ہے دودھ سکھانے کی۔ ہم نے تو سنی نہیں ایسی بات۔۔۔۔۔ انہیں شرم بھی نہیں آتی۔ لاج نہیں لگتی"۔

ہلدر ہاؤس میں نوعمر لڑکوں کا یہ وطیرہ رہا تھا کہ ابھی مسیں بھیگنے ہی لگتیں۔ یعنی ذرا قد نکالا نہیں کہ گھر میں ملازم نوعمر چھوکریوں اور نوجوان عورتوں سے چھیڑ چھاڑ، آنکھ مٹکا شروع کر

دیتے۔ پراب نوعمر ٹین ایجرلڑکوں میں بڑی تبدیلی محسوس کی جاسکتی تھی اوراس تبدیلی کا سہرا جسودھا ہی کے سرجاتا ہے۔سارے ہی نئے نویلے جوانی کی حدوں میں قدم رکھنے والےلڑکے تو جسودھا کا دودھ پی کر پروان چڑھتے، وہ اس کو ماں سمان سمجھتے تھےاوراس کی موجودگی کی وجہ سے گھر میں کام کرنے والی ساری عورتیں انہیں ماں جیسی لگنے لگی تھیں۔ وہ ان کی بھی عزت کرتے تھے۔اب گھر میں ملازم عورتوں اورلڑکیوں سے پھاگ کھیلنے کے بجائے انہوں نے گرلز اسکول کے آس پاس منڈلانا شروع کر دیا۔گھر کی نوکرانیوں کوبھی ان کی بادل ناخواستہ توجہ اور چاکری سے چھٹکارا ملا تو انہوں نے سکھ کی سانس لی۔ان کا کہنا تھا جوشی۔تم تو مہان ہو بڑی بھاگوان یہ تمہارے قدموں ہی کی برکت ہے کہ ہمیں ان نئے نویلے جوان لڑکوں کی خرمستیوں سے نجات ملی ہے۔تمہاری وجہ سے تو اس گھر کا چلن ہی بدل گیا ہے۔ایک روز ایسا ہوا کہ ہلدر ہاؤس کا چھوٹا بیٹا جسودھا کے قریب بیٹھا ہوا تھااوراس کوایک چھوٹے شیرخوار بچے کو دودھ پلاتے ہوئے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس سے کہنے لگی: "بیٹا میری ساری خوشی اور سکھ چین کا کارن تم ہو کہ نہ تمہاری گاڑی تلے آ کر میرا پتی اپاہج ہوتا نہ ہی مجھے یہ سب کچھ ملتا جو آج مل رہا ہے۔ میں پوچھتی ہوں کہ اس پورے معاملے میں کس کے ارادے کا دخل ہے"۔

لڑکے نے جواب دیا: "دیکھو یہ تو سب بھوانی دیوی کی اچھا اور کرپا ہے۔ دراصل وہ خود جاننا چاہتا تھا کہ آخر کنگالی چرن میں دونوں ٹانگیں کٹ جانے کے بعد بھی باپ بننے کی قوت اور صلاحیت کس طرح برقرار رہی، بلکہ عام لوگوں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ وہ کیا راز اور کونسی قوت ہے جس نے اس میں یہ طاقت اور اس درجے تولیدی صلاحیت پیدا کر دی ہے۔لیکن بات چونکہ روحانیت اورعقیدے کا رخ اختیار کر چکی تھی، سو وہ اسی قدر کہہ کر رہ گیا کہ یہ ساری ماتا دیوی کی کرپا ہے"۔

کنگالی کی ٹانگیں پچاس کے عشرے میں کٹی تھیں۔اس سمے سے اب تک کوئی پچیس برس تو گزر چکے ہیں اوراگر دیکھا جائے تو تیس ہی برس بنتے ہیں۔اس درمیان جسودھا کے تقریبا بیس زچگیاں تو ہو چکیں۔آخری دو جاپوں کا یہ ہے کہ وہ اس مقصد اور خدمت کے قابل نہ سمجھے گئے۔ وجہ اس کی ہلدر ہاؤس کے نئے چلن اور نئے زمانے کی ہوا کا اثر ہے وہاں بڑی تبدیلیاں آ رہی تھیں،کونوں کھدروں میں لگے ہوئے جالوں کو اتارا جارہا تھا۔

اچھا اس سب کے تفصیلی بیان سے پہلے میں چاہتی ہوں کہ اس درمیانی مدت کے دوران ہلدر ہاؤس میں واقع ہونے والے ان بڑے اور اہم واقعات کے تناظر کو سامنے لاؤں جو آج اور کل، یعنی ماضی اور حال کے درمیان پیدا ہوتے رہے اور ایک نئے دور کے آغاز کا کارن بھی بنتے رہے۔

پہلے، یعنی کنگالی چرن کے حادثے اور اس قصے کے آغاز سے قبل جسودھا کے تین ہی بچے تھے۔ اس کے بعد اس کے سترہ بچے اور پیدا ہوئے۔ اسی زمانے میں یعنی اس کے سترہ جاپوں کے درمیان بڑی ہلدر رانی سورگباش ہو گئیں۔ ان کی ایک زبردست خواہش یہ تھی ان کی بہو اس تجربے سے گزرے جو ان کے من میں تھا۔ اس گھرانے کی ریت یہ تھی کہ اگر کوئی جوڑا بیس بچے پیدا کر لیتا تو اس کی پھر سے شادی ہوتی، اسی شان اور دھوم دھام سے جس سے وہ پہلے بیاہے گئے تھے۔ پر ان کی کوئی بہو بھی اس تجربے سے گزرنے کو تیار نہ تھی۔ وہ تو درجن کے نام ہی پر کانوں پر ہاتھ دھرنے لگی تھیں۔ انہوں نے جانے کن الٹی سیدھی باتوں سے اپنے خاوندوں کے کان بھرے اور کون سی بدشگونیوں کے ڈراوے دیئے کہ وہ ان کے ساتھ ہسپتال جا کر ضروری اور احتیاطی اقدامات پر راضی ہو گئے۔ بڑی ہلدر رانی کہتیں کہ یہ سب تو نئے زمانے کے ہوا ہے، اس کے کارن تو سماج کی ساری ریتیں ہی بدل گئیں۔ پرانے زمانوں میں سیانے اور گیانی دھیانی لوگوں نے ایسی ہی ہواؤں کو اپنے پریواروں اور کنبوں کے قلعوں میں داخل ہونے کی اجازت کبھی دی ہی نہیں۔ میری دادی ماں مجھے ایک کہانی سنایا کرتی تھیں، کہتی تھیں، ہمارے گھر ایک صاحب آئے ان کے ہاتھ میں ایک رسالہ تھا، جس کا نام تھا" سانی بار کی چٹھی "انہوں نے اس رسالے میں لکھی ہوئی باتیں پڑھ کر سنائی تھیں۔ وہ کہنے لگے میں تو کبھی ایسے رسالے کو اپنے گھر میں آنے کی اجازت نہ دوں گا۔۔۔۔۔ کیوں؟ کس وجہ سے؟ اس کو جو جو مائیں بہنیں اور بیویاں پڑھیں گی، ان کے مغز ہی پھر جائیں گے، وہ یہ کہنا شروع کر دیں گی کہ پہلے ہم عورتیں اور ہماری بھی انفرادیت اور اپنی مرضی ہے، اس کے بعد کچھ ہیں اور ہم اس دنیا میں صرف ماں، بہن، بیٹی اور بیوی بن کر تو نہیں بھیجی گئی ہیں۔ جب وہ یہ کہہ رہے تھے تو ان سے پوچھا گیا تو اس سب کا نتیجہ کیا

ہو گا؟ تو جھٹ بولے:

"ارے بھائی ہونا کیا ہے، دیکھ لینا کچھ دن گزرنے دو۔ مرد رسوئی میں ہنڈیا ڈوئی لئے کھڑے نظر آئیں گے۔ ان کے خیال میں عورتوں کا گھریلو کام کاج کے لئے ہی وقف ہو کر ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کا کردار قبول کرنا چاہیے۔ یہ ہے نیا زمانہ، نئے چلن اور نئے رواجوں کا دور"۔

بہرحال ہلدر ہاؤس میں ابھی تک سولھویں صدی کے رواجوں اور چلن ہی کا دور دورہ تھا۔ یہاں زندگی اسی پرانے ڈھرے پر چل رہی تھی۔ پھر اچانک ہی نا اتفاقیوں اور اختلافات کی وجہ سے کچھ دراڑیں پڑنے لگیں، گھرانے کے چند مردوں نے پرانے گھر سے الگ ہو کر اپنے علیحدہ گھر بنا لئے اور الگ الگ رہنا شروع کر دیا اور ایک دوسرے سے دور خاصے فاصلوں پر۔ اس طرح پرندے اپنے آشیانے سے پرواز کرنا شروع ہو گئے۔ چلو یہاں تک تو خیر تھی، پر اب تو یہ ہوا کہ دادی ماں ہلدر جننی کی کچھ پوت بہوویں ایسی بیاہ کر آئیں جو سرے سے ماں بننے اور بچے پیدا کرنے کے ہی خلاف تھیں۔ وہ ہلدر جننی کے خیالات سے بالکل ہی اتفاق نہیں کرتی تھیں، ان کے نظریات اور خیالات دادی ماں سے بہت مختلف تھے۔

ان کا اپنی پوت بہوؤں سے بحث مباحثہ بے سود اور لاحاصل تھا، وہ لاکھ ان کو سمجھاتیں۔ "ارے اس گھر میں کچھ کمی ہے کھانے پینے یا کسی چیز کی۔ بھگوان کا دیا سب کچھ ہی تو ہے، پھر یہ دیکھو تمہارے دادا ہلدر بابو کی تو یہ خواہش تھی کہ آدھا کلکتہ ہلدر گھرانے سے ہی آباد ہو بلکہ آدھا کیوں پورا کلکتہ بھر جائے۔ ان بیٹوں پوتوں کے پریواروں سے"۔ پر توبہ کرو سنتا کون تھا بڑھی اماں کی بات۔ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ آپ کی خوشی کی خاطر ہم وہ سب کچھ تو نہیں کر سکتیں جسے ہم اصولاً غلط سمجھتے ہیں۔ دو تو ایسی سرکشی پر اتر آئیں کہ گھر ہی چھوڑ چھاڑ کر اپنے خاوندوں کو لے جا کر الگ گھر بسا لئے۔

ان ہی دنوں یاترا کے لئے آنے والے یاتریوں کا ایک گروہ ایسا بھی آیا جنہوں نے دیوی کی مورتی کا رخ پھیر دیا۔ یہ جونا معلوم اور اجنبی لوگ تھے، انہوں نے دیوی کے منہ کی طرف تو پیٹھ کر دی اور منہ دوسری طرف کر دیا۔ دیکھنے والوں کو یہ لگتا تھا جیسے وہ منہ پھیر کر سب کی طرف سے پیٹھ موڑ کر بیٹھ گئی ہو۔

دیوی کے منہ موڑ کر بیٹھ جانے کی خبر آنا "فانا" ہر طرف پھیل گئی۔ اس خبر کا کہ دیوی نے اپنے پجاریوں سے اپنا مکھ ہی پھیر لیا اور ان کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئی ہے۔ بوڑھی ہلدر جنتی پر ایسا دھا کا بیٹھا کہ ایک دن بیٹھے بٹھائے اس نے سنسار سے منہ موڑ لیا۔ ہوا یوں کہ ایک دن انہوں نے تھالی بھر بھات پر کٹھل کا سالن ڈال ڈال کر خوب جی بھر کر کھا تو لیا پر اس کے بعد گیسٹرو انٹرائٹس کا ایسا دورہ پڑا کہ جان لے کر ہی ٹلا۔ سو ہلدر جنتی نے تو اس سنسار کے انیائے اور لو بھ بھار سے جیون تیاگ کر نجات پائی اور سکھ کی سانس لی۔ اس جیون کے دکھوں اور نئے زمانے کے الٹے چلن سہنے سے تو کہیں اچھا تھا کہ وہ ان سب سے منہ موڑ کر دور کہیں چلی جائیں۔ ان کی موت کا اصل اور حقیقی غم تو جسودھا ہی کو ہوا کہ اس کے رونے اور پیٹنے نے تو لبینی کے پیٹنے کو بھی مات کر دیا تھا۔ لبینی اس گھرانے کی بہت پرانی آیا تھی۔ کسی کے مرنے پر اس کے رونے پیٹنے اور بین کرنے کا دور اور نزدیک شہرہ اور چرچا تھا۔ مگر ہلدر جنتی کے ماتم اور تڑپ تڑپ کر چھاتی پھاڑ کر رونے میں لبینی کو اس نے بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ بات یہ ہے کہ اس کے رونے اور تڑپنے میں ایک سچا درد اور غم تھا۔ ہلدر جنتی نے اس سنسار سے منہ موڑ کر اس کو تو مانو نرک میں ڈال دیا تھا۔ اس کے تو منہ کا نوالہ چھن گیا تھا، وہ تو ایسا تڑپ تڑپ کر بلک بلک کر روئی کہ دھرتی تو دھرتی آکاش بھی ہل گیا۔

لبینی نے اونچی اونچی آوازوں میں رونا اور بین شروع کئے۔

ہائے ماں! کہاں چلی گئی ہو۔ ہائے ماں تم کتنی دھن وان تھیں۔ ماں کیسا راج تھا تمہارا۔ ارے تم تو اس راج پاٹ کے مکٹ کا ہیرا تھیں۔ ارے مالک کے بیکنٹھ سدھارنے کے بعد تم ہی نے اتنی بڑی باڑی کو سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ ارے کیسا قابو کیا ہوا تھا سب کو، کیسا کس کر رکھے ہوئے تھیں۔ ہائے پریوار کو کیسے جوڑ کر رکھے ہوئے تھیں۔ ہائے ماں! ہم سے ایسا کونو (کونسا) پاپ ہوئی گوا تھا۔ ارے۔ اس دن میں نے کتنا کہا کتنی ٹمری بنتی کری تھی ماں اتنا کوٹھل بھات نہ کھاؤ ارے یہ پچے گا نہیں پر تم کب سنتی تھیں۔ ارے ہمری بات پر کان ہی نہ دھرا۔

لبینی اپنے بین پورے کر کے دم لینے کو رکی ہی تھی کہ جسودھا نے اپنی آواز اٹھائی۔ بڑی المناک لے سر میں۔

"ارے ماں تم تو دیوی سمان تھی، ایک دم پاک پوتر۔۔۔۔۔ اتنی نیک معصوم ارے

کاہے اس پاپی سنسار کے بکھیڑوں میں الجھی بیٹھی رہتیں۔۔۔۔۔ ارے تمہارے جیسے نردوشوں کے لئے یہ سنسار کب ہے، تم کو تو ہمیں چھوڑ کر جانا ہی جانا تھا۔۔۔۔۔ ارے تم تو اس پریوار کی رانی بن کر اتری تھیں۔ ہائے یہ گھر تو تمہاری راج دھانی تھی۔ اس راج نو اس میں تو تمہارا راج تھا۔ پر دیکھو تمہاری بہو نے کیسی کھنڈت ڈالی اس میں۔ ارے دیکھو یہ پاپ نہیں تو اور کیا ہے۔ کبھی سنا ہے کسی نے کہ پھل دار درخت پھل لانے سے ہی انکاری ہو جائے۔ یہ تو مہا پاپ ہوا نہ۔ پھر تم کاہے اس پاپ کی نگری میں رہتیں۔ یہ تمہارے رہنے جوگا رہ کب گیا تھا۔ ارے میں تو دیکھتی تھی، سمجھتی تھی نا کہ جب مالک پرلوک سدھارے تو تم ان سے جا ملنے ہی کے سپنے دیکھ رہی ہو، تمہارا من تو جب ہی اس سنسار سے اچاٹ تھا۔ پر تم نے اپنے پریوار کو سپھل رکھنے کی کھاطر اپنی آتما، کایا اور کابعد سب کو جوڑ جوڑ کر رکھا تھا"۔

روتے روتے جسودھا نے مالکن کی بہوؤں سے کہا: "ارے کہیں سے آلتا لاکر ان کے چرنوں کی چھاپ لے لیو۔ تاکہ تم ان کی ڈگر پر ہی چلتی رہو جیون بھر۔ ان چرنوں کی چھاپ ہی پورے پریوار کے لئے جادو کا اثر بن کر کام کرے گی۔ تمہارے گھرانے پر سدا لکشمی دیبی کی چھایا رہے گی۔ ارے جو سویرے سویرے اٹھ کر ان چرنوں کی پوجا کر لیا کرو گی تو تمہارے گھر میں کوئی دکھ درد پیر نہ رکھ سکے گا"۔

روتی دھوتی جسودھا ارتھی کے سنگ سنگ شمشان گئی تھی۔ جلتی چتا کے پاس کھڑی آنسو بہاتی رہی۔ اپنی مالکن اپنی پالنہار کے لئے جی بھر کے روتی رہی۔ واپس آئی تو اس نے گلا پھاڑ پھاڑ کر دعوی کیا: "ارے ہم نے اپنی ان آنکھوں سے دیکھا کہ جیسے ہی چتا کو آگ دکھائی۔ اسی سمے آکاش کی اور سے ایک رتھ اتر کر چتا کے پاس آن رکا، جیسے کسی نے ایک دم ہی مالکن کے شو کو چتا پر سے اٹھا کر رتھ میں ڈالا اور رتھ یہ جا وہ جا۔ بس دو سکنڈ پلک جھپکنے کی دیر ہی میں سب کچھ ہو گیا"۔

ہلدر بابو کی پتنی کی آخری رسومات ادا ہو چکیں اور سوگ کی وہ مدت بھی پوری ہو گئی جو پرانون میں بتائی گئی ہے تو گھر کی بڑی بہو نے جسودھا کو بلا کر کہا۔ "باہمن دیدی مجھے آپ سے بڑی ضروری بات کرنا ہے۔ وہ ایسا ہے کہ اب پریوار کے بندھن ٹوٹ رہے ہیں۔ اب یوں کہ منجھلا اور سنجھلا بابو تو اپنے اپنے پریوار کے سنگ بیلیا گھاٹ والے گھر میں رہنے چلے جائیں گے۔ ان

سے چھوٹا چوتھا اور پانچواں بھائی مانک ٹالا باگ ماری جا رہے ہیں اور سب سے چھوٹا والا انجھی ہمارے داکنسیشو روالے گھر میں جا کر رہے گا"۔

"تو بہورانی یہاں اس گھر میں کون رہے گا؟"

"اس گھر میں تو ہم ہی رہیں گے پر اوپر والی منزل میں اٹھ جائیں گے۔ نیچے والا گھر ہم کرائے پر اٹھا رہے ہیں۔ اب ہم اپنے رہن سہن کے پھیلاوے کو سمیٹ رہے ہیں اور گھر کے خرچے بھی کم کر رہے ہیں کہ اب اس کی بڑی ضرورت ہے، خرچے کم کریں اور پہلے کی طرح پھیل پھیل کر نہ رہیں۔ سو بات یہ ہے کہ تم نے تو اس پریوار کے سارے ہی بچوں کو دودھ پلایا ہے۔ سب کی انا (دائی) رہی ہو اس کے بدلے اتنے سال سے تمہارے پریوار کے لئے ٹوکری بھر کھانا جاتا رہا ہے اور اب دیکھو نا آخری بچے کو دودھ پلائے بھی آٹھ برس ہو گئے۔ لیکن میری ساس ان آٹھ سالوں میں بھی بھر بھر تھال تمہارے پریوار کے لئے بھوجن بھیجتی رہی تھیں۔ پر اب یہ میرے بس کی بات نہیں۔ ان کی بات اور تھی۔ اپنے وقت میں انہوں نے جیسا چاہا کیا۔ ان کی خوشی اس میں تھی اس پر نہ کبھی ان کے بیٹوں نے اعتراض کیا نہ ہم نے، پر اب سمے بدل گیا ہے اور یہ چلن نباہ نہ سکوں گی۔ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔

"تو بہودی ! ہمارا کیا بنے گا؟"

"تمہارا ! ہاں ! تم اگر ہماری رسوئی کا کام سنبھال لوگی اور ہمارے چوکا برتن کر دوگی تو یہ ہے کہ ہمارا کام بھی چلتا رہے گا اور تمہارے کھانے پینے کا آسرا بھی بنا رہے گا۔ پر سوال یہ ہے کہ تمہارے بال بچوں کا کیا بندوبست ہوگا؟ ہاں ان کا کیسے پورا ڈالو گی؟ "

"ارے تو ہم کیا کریں گے؟"

"اب یہ تو تمہارے اپنے سوچنے کی بات ہے۔ دیکھ لو، تم بارہ بچوں کی ماں ہو۔ تمہاری بیٹیاں بیاہ گئی ہیں اور سنا ہے تمہارے بیٹے یاتریوں کو مندر میں لانے لے جانے کا دھندا کرتے ہیں۔ مندر کا پرساد اور چڑھاوا کھاتے ہیں اور مندر کے احاطے میں ہی سوتے ہیں۔ اب رہ گئی تمہارے آدمی باہمن کی بات تو وہ بھی نکلیشور کے مندر میں بیٹھے ہیں اور بہت مزے میں ہیں۔ اب رہ گئیں تم تو تم اپنی فکر کاہے کرتی ہو۔ تمہاری پور پڑتی رہے گی تمہیں تھوڑ نہیں ہوگی"۔

جسودھا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: "اچھا دیکھو اپنے پتی سے صلاح کر کے بتاؤں

گی"۔

کنگالی چرن والا مندر بڑا ہیجانی مندر تھا، ایک تھرتھلی سی مچی رہتی تھی۔ شورغل اور ہر طرح کے دھندے۔ جب جسودھا نے کنگالی چرن سے مندر میں بیٹھنے کی بات کی تو وہ رکھائی سے بولا: "تو کیا کرے گی مندر میں بیٹھ کر؟"

" کیوں نبین کی بھتیجی مندر میں بیٹھ کر کیا کرتی ہے؟"

"وہ تو مندر کے بھنڈارے کو سنبھالتی ہے، پرساد بناتی ہے۔ ارے بڑا کام ہوتا ہے اور تو نے نہ جانے کب سے رسوئی کا منہ نہیں دیکھا، بھوجن خاک بنائے گی۔ گھر پر بھی بھوجن تو میں بناتا ہوں پھر تو کیسے مندر کے بھنڈارے کا اتنا کام سنبھال سکے گی؟"

اور وہ جو پکے پکائے کھانے کی ٹوکریاں اب نہیں ملنے کی، وہ بند ہو گئیں تو کیسے کرو گے پیٹ پوجا۔ آیا کچھ اس کھوپڑی میں، ایک وقت بھوجن نہ ملے گا تو دن میں تارے نظر آئیں گے"۔

" تجھے اس کی چنتا کرنے کی ضرورت نہیں"۔ کنگالی چرن نے جواب دیا۔

اچھا اب مجھے چنتا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، تو پہلے کیوں مجھے دبدھا میں ڈال رکھا تھا۔ کتنے سال کتنے دن میں نے تمہاری مدد کی ہے۔ لگتا ہے اب تم مندر کے پیسے میں کھیل رہے ہو۔ بہت پیسہ آنے لگا ہے ہاتھ میں۔ پر تم نے تو مجھے ایک جھنجی کوڑی بھی نہ دکھائی کبھی میری ہی بوٹیاں نوچ نوچ کر گدھ کی طرح کھاتے رہے کہ میرے خون پسینے ہی کی کمائی پر تو اینڈتے رہے"۔

"اچھا! یہ بتا گھر میں چوکا برتن کون کرتا رہا تھا؟"

جسودھا نے اس کی بات کے جواب میں بڑی حقارت سے کہا: "ہونہہ دنیا بھر میں آدمی کما کر لاتا ہے تو پتنی ہانڈی روٹی کرتی ہے، یہی اس سنسار کا دستور ہے پر میرے لئے تو ہر بات ہی الٹی رہی، تم نے اتنے تمام برسوں میں میری کوئی ذمہ داری نہ اٹھائی تو اب کیا تم میرے پیٹ کو ٹکڑا دو گے۔ کبھی کھلایا تم نے کما کر مجھے؟"

کنگالی چرن جھلا کر بولا: "بڑی آئی تو مجھے اپنی کمائی کھلانے والی۔ کبھی یہ بھی سوچا تو نے کہ ہلدر بابو کی باڑی میں تو گھسی کیسے؟ تو بڑی بھاگوان تھی نا کہ تیرے لئے کوٹھی کے دروازے

کھول دیئے گئے۔اری جو میرے پاؤں نہ کٹتے تو دیکھتا کہ تجھ پر وہ تھوکتے بھی نہیں۔ارے یہ میرے پیروں کا بلیدان تھا۔اری اب تو کیوں یاد رکھنے لگی۔ تجھے تو کچھ بھی یاد نہیں رہا۔نخرے! چوٹی،حرافہ،بھڑوی"۔

بھڑوا ہوگا تو۔ بھلا جس آدمی نے جیون بھر اپنی کمائی کا ایک نوالہ بھی پتنی کے منہ میں نہ ڈالا ہو،اس کی کوئی جے واری (ذمہ داری) نہ اٹھائی ہو۔اس کو مرد کون بولے گا،ارے تو تو دھگڑا ہے"۔دونوں کے درمیان ایسی چیخ چلی کہ گالی گلوچ اور کوسنے پیٹنے کی نوبت آ گئی۔کنگالی چرن پھٹ پڑا۔"اچھا چل جا دفع ہو جا۔اب کبھی مجھے اپنی شکل نہ دکھانا"۔

غصے میں جلی بھنی جسودھا مندر کی کوٹھڑی سے نکل گئی۔کچھ دنوں بعد ایسا ہوا کہ دیوی کے مندر کے پجاریوں نے جو اس مندر کی سیوا اور دکھشنا پرساد کے حصے دار تھے،آپس میں صلاح کر کے دیوی کے استھان پر اس کا رخ بدل دیا۔اب پھر دیوی کا منہ یاتریوں کی طرف ہو گیا۔اس کرشمے پر مندر میں بڑی خوشیاں منائی گئیں،بڑی دھوم دھام سے پرائشچت پوجا کا جشن منایا گیا۔ دیوی کا جلوس نکالا گیا۔غرض ایک کھلبلی سی مچ گئی۔

جسودھا تو دیوی کے چرنوں میں جا گری اور لگی دھاڑیں مار مار کر رونے ایسا لگتا تھا کہ غم سے اس کی چھاتی پھٹ پڑے گی۔جیسے ڈھلتی عمر کی دبیز اور بے شیر چھاتیاں خشک چٹانوں کی طرح پھٹ پھٹ کر چیخ چیخ کر دیوی سے شما مانگ رہی ہوں،فریاد کر رہی ہوں۔وہ دیبی میا سے رو رو کر پوچھ رہی تھی۔اب تم ہی بتاؤ ہم کیا کریں اور کدھر جائیں۔تم سے ہمارا حال چھپا تو نہیں۔ ہماری بات تم نہیں سمجھو گی تو اور کون سمجھے گا،وہ چاہتی تھی کہ دیوی ماں بھوانی اس کو کسی ڈگر پر ڈال دے اور جیون بتانے کا کوئی رستہ نکال دے۔

تین دن اور تین راتیں جسودھا سب کچھ تیاگ کر مندر میں دھرنا دیئے پڑی رہی۔پر لگتا تھا کہ نئے یگ اور نئی ہوا کے چلن کا دیوی پر بھی اثر پڑ گیا تھا۔شاید یہی وجہ تھی کہ وہ جسودھا کی بنتی اور ساری پوجا پاٹھ کے باوجود اس کے سپنے میں درس دینے نہ آئی۔تین دن سے اس کے منہ میں ایک کھیل بھی اڑ کر نہ گئی۔اس نے تو برت رکھا ہوا تھا۔تیسرے دن بھوکی پیاسی،نڈھال گھر لوٹی تو بیٹے نے باپ کا پیغام دیا۔"پتا جی بول رہے تھے وہ گھر نہیں آئیں گے اب مندر ہی میں رہیں گے۔انہوں نے مجھ کو بولا ہے کہ وہاں ان کے مندر میں گھنٹے بجا دیا کرو تو تم کو پرساد بھی مل

جایا کرے گا اور بھوجن بھی۔ کچھ پیسہ الگ ملے گا۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔ ہے کہاں اس وقت تیرا باپ؟ "وہ وہاں لیٹے ہوئے ہیں اور نا گولا پی ماسی وہ ان کی پیٹھ کے گرمی دانوں کو کھجلا رہی ہیں۔ انہوں نے ہمیں پیسے دیئے تھے کہ جاؤ اپنے لئے لولی پاپ خرید لو اور میری جان چھوڑ دو۔ جسودھا کو اب جا کر یہ احساس ہوا کہ اب ہلدر باڑی والوں ہی کو نہیں بلکہ کنگالی کو بھی اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اس نے شکر کے بتاشے اور پانی کے دو گھونٹ سے برت توڑا اور پیٹ کی آگ مٹانے کے بعد وہ کنگالی کی شکایت لے کر نبین کے پاس پہنچی۔۔۔۔ یہ دیوی کا رخ موڑ کر اس کی پیٹھ آ گے اور مکھ دوسری طرف موڑنے والی حرکت نبین ہی کی تو تھی اور اس نے دیوی کا رخ اس وقت تک ٹھیک نہ کیا تھا جب تک مندر کے دوسرے پجاریوں سے مندر کے چڑھاووں اور پرساد کے حصوں بخروں کے بارے میں ہونے والے مذاکرات خاطر خواہ طور پر طے نہ ہو گئے اور جب ساری باتیں اور شرائط تسلی بخش اور اس کے من چاہے طور پر انجام پا گئے تو پھر ایک تہوار کے دن اس نے دیوی کو اسی پرانی پوزیشن میں چپکے سے رکھ دیا، جیسی پہلے ہوتی تھی۔۔۔۔۔ اب جبکہ اس طرف سے پوری تسلی ہونے کے بعد وہ مطمئن ہو چکا تھا تو اس نے اپنے بدن پر شراب کی مالش کی اور خوب گھونٹ کر بھنگ چڑھائی تھی۔ اس وقت وہ بڑی ترنگ میں اٹھا اور الیکشن کے مقامی امیدوار کو ڈرا دھمکا دیا تھا۔ "دیکھو جی تم مندر کے چڑھاوے اور پرساد کی تو کبھی بات ہی نہیں کرتے۔۔۔۔ چلے ہیں الیکشن لڑنے۔۔۔۔۔ ہاں سوچ لو اچھی طرح اب تو دیوی ماں کی شکتی بھی واپس آ گئی ہے۔ اب دیکھتا ہوں میں بھی کہ تم اس بار کیسے جیتتے ہو"۔

بات یہ ہے کہ کرشموں اور کرامات کا زمانہ ابھی گزرا نہیں ہے۔ کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی صورت میں یہ موجود رہتا ہی ہے۔ مندر میں رونما ہونے والا کرشمہ گرد و نواح میں آس پاس کے علاقوں میں ہر طرف ہی پھیل چکا تھا۔ نبین اس بات کا گواہ تھا اور بھئی وہ نہ ہوتا تو ہو بھی کون سکتا تھا کہ اسی نے تو دیوی کا رخ دوسری طرف پھیر کر رکھ دیا تھا۔ دوسرے پجاری اس بارے میں کاہے کو بول کر برے بنتے۔ وہ اس قصے سے الگ ہی رہنا بہتر سمجھ رہے تھے اور بھئی الیکشنوں کے دنوں میں ایسی باتیں اور کرشمے ظہور پذیر ہوتے ہی رہتے ہیں۔ پھر ان کو کیا پڑی تھی کچھ بول کر نبین سے پنگا لینے کی۔ سو دیکھتے دیکھتے چاروں اور یہ بات پھیلتی چلی گئی کہ دیوی ماتا نے اپنے

سیوکوں اور داسوں سے مکھ موڑ لیا ہے اور اب وہ سنسار کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئی ہیں۔ جیسے یہ چرچا پلک جھپکتے سارے میں پھیلا تھا، اسی طرح یہ چرچا بھی چاروں اور ہونے لگا کہ دیوی نے اپنا آسن پھیر لیا۔ اب وہ پھر سے پہلے ہی آسن سے آ بیٹھی ہے۔ اس کی شکتی واپس آ گئی ہے۔۔۔۔ یہ بات وہ پورے وثوق اور وشواس سے کہتا تھا، اتنا کہ خود اس کو بھی یہی یقین آ تا گیا کہ دیوی نے یہ آسن اپنی اچھا سے بدلا ہے۔ پر جسودھا نے اس کو جھڑکا اور کہا:

"ارے کاہے بکواس کرتا ہے۔ نری گپ بازی"۔

"ہم دیوی ماتا اور اس کی شکتی کی بات کر رہے ہیں۔ دیوی کی مہانتا کی بات کر رہے ہیں"۔ نبین نے کہا۔

"ارے جاؤ یہ چکر بازی کسی اور سے کرنا۔ تم سمجھتے ہو، ہم کچھ جانتے ہی نہیں۔ ارے تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہی تو ہے دیوی کا مکھ ادھر کر دیا جب من چاہا ادھر کر دیا"۔ جسودھا نے جھپٹ کر کہا۔

تو نبین بھی چلا اٹھا: "جرا جبان سنبھال کر بات کر جوشی ! میں کہتا ہوں چپ کر جا۔ ارے یہ دیوی کی شکتی نہیں تھی تو کیا تھا کہ اس نے سپنے میں آ کر تیری کھوپڑی میں سوجھ سمجھ دی کہ ہاں بھئی۔۔۔۔۔ نہیں تو۔۔۔۔۔ اور کیا میں آپ ہی آپ تو اتنی بدھی دے نہیں سکتا تھا"۔

"ارے جا تو مجھے کیا بدھی اور گیان دے گا، پر اتنا جانتی ہوں کہ دیوی ماتا کی شکتی تیرے ہاتھوں ٹوٹی"۔ جسودھا نے تڑاخ سے جواب دیا۔

"اچھا تو بولتی ہے دیوی کی شکتی بھنگ ہو گئی، ہونہہ ! پر یہ بول جو بجلی کا پنکھا مندر کی چھت سے لٹکا ہوا تیرے سر پر چل رہا ہے اور تو اس کی ٹھنڈی ہوا کے مزے لے رہی ہے تو یہ سب کیا ہے دیوی کی شکتی نہیں تو کیا ہے۔ کبھی دیکھا سنا تھا کسی نے اس مندر میں بجلی کا پنکھا چلتا ہوا؟"

"ہونہہ۔۔۔۔۔ بڑا آیا۔ پر یہ بتا کہ میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا جو تو نے میرا جیون نشٹ کر دیا، اجاڑ کر رکھ دیا مجھے"۔

"اچھا تو بات کیا ہے۔ کاہے پٹن ڈال رہی ہے، ارے کنگالی تو ابھی جندہ ہے، مر تو نہیں گیا"۔

"ارے وہ کاہے مرنے لگا۔ اس کے تو اس سے بھی بڑھ کر لچھن سامنے آ رہے ہیں۔

مرجاتا تو چھٹی نہ ہوجاتی۔ یہ دکھ تو نہ دیا ہوتا"۔

"ارے تو ہوکیا گیا۔۔۔۔بات کیا ہے؟"

جسودھا نے اپنے آنسو پونچھے اور آنسوؤں میں ڈوبی گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔ "تو۔۔۔۔۔تو دیکھنے والا ہے، میں نے اتنے بچے جنے۔۔۔۔۔کاہے یہ کشٹ بھوگی کہ ہلدر باڑی کے بچوں کو دودھ کی تھوڑ نہ ہو۔۔۔۔۔ارے میں تو دودھ کی دکان بنی ہوئی تھی۔ میں ہلدر باڑی میں کس کارن دائی انا بنی ہوئی تھی، یہ میرے دودھ کی دھاریں تھیں، جن کی وجہ سے میری انا گیری پکی ہوگئی تھی۔تم ننھے تو نہیں ہو، پر ایک بات کی جانکاری ہے۔تم نہیں جانتے کہ میں وہاں کیسے لگی رہی"۔

"اوہو۔۔۔۔۔ بھگوان چھما کریں۔ رام رام بھگوان کی کرپا رہے۔ میرے اوپر۔۔۔۔اری آج کیسی باتیں کررہی ہے۔تو تو دیوی کی اوتار ہے"۔

"ہاں تو دیوی تو مجھ میں ہے نا، مار پرساد چڑھاوے پوجا پاٹھ سب ہی کچھ تو ہے ملا ہوا اس کو۔ اس کی اوتار تو اب بھوکوں مرے گی نا۔۔۔۔۔ پتا ہے ہلدر والوں نے ہمارا کھانا بند کر دیا"۔

"پرنتو تم کنگالی سے کاہے لڑنے پہنچ گئیں، آخر کو وہ بھی مرد بچہ ہے، جب تم اس کو الہنے دوگی کہ تم اس کو کھلاتی تھیں، یہ تمہاری کمائی تھی جو اس کا پیٹ بھرتی تھی پھر تم ہی سوچو کہ وہ یہ سب کیسے برداشت کرے گا"۔

"چلو مانتی ہوں تم سچ کہتے ہو۔ پر تم یہ بتاؤ کہ تم نے اپنی بھتیجی کو وہاں کیوں دھانس دیا۔ بولو نا اسے کاہے گھسیڑا ہے اس مندر میں؟"

"لو اور ہوئی۔ اس کو میں نے گھسیڑا ہے کہ دیوی ماں کی اچھا ہی یہی تھی۔ وہ ایسا تھا کہ گولاپی مندر میں پوجا اور دیبی کے درشن کو آتی تھی اور گھنٹوں گھنٹوں دیبی کے چرنوں میں بیٹھی رہتی۔ اب کنگالی کے من میں یہ آئی کہ وہ خود بھیرو ہے اور گولاپی بھیروی رواج کے مطابق یہ بات ٹھیک تھی"۔

"ارے بھاڑ میں جائے بھیروی۔ میں تو اب بھی اتنا دم رکھتی ہوں کہ اسے مار مار پرخچے اڑا دوں گی اور اپنے پتی کو گھسیٹ کر لے آؤں گی"۔

"نانا۔۔۔۔اب یہ ہونہیں سکتا۔کاہے کو کہ کنگالی ہے پکا نر بچہ۔۔۔۔۔اور اب تم سے تو اس کی مانگ پوری ہونے سے رہی اور پھر گولا پی کا بھائی ہے چھٹا ہوا بدنام غنڈا۔اس نے وہاں پر اپنے آدمیوں کا پہرہ بٹھایا ہوا ہے اب تم دیکھونا میں اگر چرس کے دس سوٹے لگاتا ہوں تو وہ لگاتا ہے بیس سوٹے اور اس نے تو ایک باری مجھے اٹھا کر پٹخ دیا تھا۔ایسی لات ماری تھی کہ میں تو چکرا کر رہ گیا تھا۔تم جانو کہاں ماری تھی۔ایک بار میں نے صرف تمہارا نام ہی منہ سے نکالا تھا اور میں گیا تھا کنگالی کو سمجھانے۔۔۔۔۔وہ تو ہتھے پر سے اکھڑ گیا۔بولا نام نہ لو اس کا میں تو اس کا نام بھی سننا نہیں چاہتا، وہ اپنے پتی کی کب پرواہ کرتی ہے۔وہ تو اس گھر کے مالکوں پر جان دیتی ہے۔وہ تو اس کے لئے دیوتا سمان ہیں۔ان داتا ہیں۔چھوڑو وہ وہیں ٹھیک ہے"۔

"اچھا تو پھر ٹھیک ہے۔اب میں یہ کر کے بھی دکھادوں گی"۔

یہ آخری بات اس کے منہ پر مار کر جسودھا باؤلی سی ہو کر وہاں سے اٹھ آئی۔پر اب جائے کہاں، پورا جیون کھپانے کے بعد اس بے انصافی نے اس کا جی کھٹا کر دیا تھا۔خالی ڈھنڈھار گھر میں بیٹھنا مشکل تھا۔تنہائی اور ایک گہرے خلا کا احساس اسے سونے نہیں دیتا تھا کہ اس کو تو عادت تھی کہ پہلو میں ننھا سا بچہ جب تک چھاتی سے نہ لگا ہو نیند آتی ہی نہ تھی۔یہ ممتا اور ماں بننے کی بھی ایک لت ہی تو ہو جاتی ہے۔بس ایک بار گود بھر جائے تو پھر ایک چاٹ سی لگ جاتی کہ بچہ گود میں یا چھاتی سے چمٹا ہو، تو ہی شانت ہوگی۔اس سے غرض نہیں کہ چھاتی میں دودھ ہے بھی یا سوکھی پڑی ہے، اصل بات تو یہ ہے کہ بچہ کلیجے سے چمٹا ہوا ہو"۔

اب جسودھا نے ساری لاج لجا کو تو اٹھا کر طاق پر دھرا اور آنکھوں پر ٹھیکری رکھ کر وہ ہلدر باڑی کی نئی مالکن بڑی بہو کے پاس گئی اور کہنے لگی:"ٹھیک ہے مالکن میں نے سوچ لیا ہے، میں آپ کی رسوئی چوکا سنبھال لوں گی اور آپ کا کھانا پکا دیا کروں گی۔آپ کی سیوا کروں گی۔اب اگر آپ کا من چاہے تو مجھے تنخواہ دے دیا کرنا۔بس اتنی بنتی ضرور کروں گی کہ مجھے یہیں اپنے دوار رہنے کا ٹھکانہ دے دیں کہ وہ میرا نکما نکھٹو پتی تو مندر جا بیٹھا ہے اور وہ ناشکرے بے دید دونوں چھوکرے باپ کے سنگ رہنے کو کہتے ہیں۔ماں۔۔۔۔!انہوں نے ہماری سنگت چھوڑ دی اسی کے ہو رہے ہے، اب بولو نا ہم کس کارن گھر لے کے بیٹھیں گے"۔

مالکن نے بڑی فراخ دلی سے حامی بھر لی اور بولیں:"ارے کیوں نہیں، تم ضرور آ

جاؤ۔تم نے تو ہمارے بال بچوں کو دودھ پلایا ہے پھر یہ کہ تم برہمنی ہو۔بس ایک بات کا دھیان رہے کہ اب وہ پہلے والی بات تو رہی نہیں تم کو لبینی اور دوسری عورتوں کے ساتھ ہی گزارا کرنا ہوگا اور ان سے بات بات پر جھگڑا کرنے کی عادت بدلنا ہوگی۔تم کو تو پتہ ہے بڑے بابو کا مزاج گرم ہے، ایک تو وہ باڑی میں لڑائی دنگے ہی پر غصہ ہوتے ہیں پھر ایک بات یہ ہے کہ ہمارا تیسرا بیٹا بمبئ چلا گیا ہے اور اس نے وہیں کی ایک چھوکری سے بیاہ کر لیا ہے، ایک تو وہ پہلے ہی اس وجہ سے جھنجھلائے ہوئے ہیں اور اگر اوپر سے تم لوگوں کے لڑائی جھگڑوں کی ہاہا کار مچے گی تو پھر تو وہ آپے سے باہر ہی ہو جائیں گے"۔

بات یہ ہے کہ جسودھا کی گود جب تک ہری بھری رہی اور وہ بچے پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے بچوں کو اپنے دودھ کی دھاریں پلا کر پروان چڑھانے کے قابل رہی، وہ یہاں کی عورتوں کے درمیان لالوں کی لال بنی رہی اور جیسے ہی بانجھ ہوئی اس کے اندر ابلتے دودھ کے سوتے خشک ہوئے اس کی کوئی اوقات ہی نہ رہی۔وہ اگلی سی خوش حالی اور بے فکری باقی نہ رہی اور تنگی ترشی کے دن آ گئے۔۔۔۔۔اس کا تو مقدر ہی بگڑ گیا، اب تو جیسے وہی ماضی کے دن لوٹ آئے تھے۔گئے دنوں کی تنگی، فاقہ کشی اور بے کسی کا سامنا تھا، مگر وہ جو انسان کے اندر کی انا ہوتی ہے وہ یوں آسانی سے ہار ماننے پر تیار نہیں تھی۔اس کا ذہن قسمت کے لکھے کو ماننے اور اس کے آگے ہتھیار ڈالنے پر ہرگز راضی نہیں ہوتا تھا، اپنے پچھلے طنطنے اور غرور کو خاک میں ملتے دیکھنے کا اس میں ذرا بھی حوصلہ نہیں ہوتا۔ایسی تلخ حقیقت کو وہ شربت کے گھونٹ کی طرح اپنے حلق سے اتارنے پر تیار نہیں ہوتا، بلکہ انتقام کے طور پر اس کی انا کی تسکین ہی یوں ہوتی ہے کہ وہ ذرا سی بات پر بھڑک کر اگلے کی ناک زمین میں رگڑ کر ہی دم لیتا ہے۔اپنے سے اونچے اور بڑی حیثیت والوں پر کیچڑ اچھال کر ہی اپنی تسلی کرتا ہے۔جسودھا کی تقدیر نے بھی ایسا ہی پلٹا کھایا تھا۔پہلے تو لبینی اس کے آگے دم نہ مارتی، وہ اور اس کے ساتھ کام کرنے والی دوسری عورتیں اس کے آگے پیچھے ہی پھرتی تھیں، اس کی ہونہہ پر ہاں کرتی تھیں اور اب جو اس کے وقت بگڑا تو لبینی نے تو وہ آنکھیں پھیریں کہ مانو آنکھیں اٹھا کر ماتھے پر ہی رکھ لیں اور صاف صاف کہہ دیا کہ تم اپنی تھالی اور گلاس آپ ہی دھولیا کرو، ہم تمہارے نوکر تو نہیں جو تمہاری جوٹھ دھوئیں۔ارے، ہم کاہے تمری ٹہل سیوا کرتے پھریں۔جیسے ہم نوکر ہیں۔ویسی تم نوکر، بولو ہم میں تم میں کیا فرق ہے۔

MashalBooks.org

"یہ مت بھولو کہ میں کون ہوں"۔ غصہ سے کھولتی جسودھا چیخ اٹھی۔ لیکن اسی وقت نئی مالکن نے اس پر اس کی حیثیت اور مرتبہ واضح کر دیا۔

"ارے یہی تو میں ڈرتی تھی۔۔۔۔ بھئی میری ساس نے تو تمہارے دماغ آسمان پر چڑھا دیئے۔ اتنے ناز نخرے اٹھائے کہ حد ہی نہ رہی پر دیدی سن لو۔ میں کہے دیتی ہوں کہ دیکھو ہم نے تم سے نہیں کہا تھا کہ بھگوان کے لئے ہمارا کام کر دو اور ہماری رسوئی سنبھال لو۔ یہ تو تم نے خود اپنی مرضی سے کام مانگا تو ہم نے دے دیا ہے، تم نے خود اپنی مرضی سے ملازمت کی ہے تو اب یہ سب جھگڑے کس بات کے۔ تم جانو تمہارا کام۔ ہمیں اپنے لڑائی جھگڑے سے پریشان نہ کرو"۔

جسودھا پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ اب اس گھر میں اس کی کوئی شنوائی نہیں ہو گی کوئی اس کی بات پر کان دھرنے کو تیار نہ ہو گا۔ اس وقت تو اس نے چپ چاپ کھانا بنایا اور سب کو پروسا۔ دن ڈھلے شام پڑے وہ مندر کی اور چلی اپنی بگڑی ہوئی تقدیر پر آنسو بہاتی ہوئی۔ پر وہاں مندر میں پوجا کر کے بھی اس کا جی ہلکا نہ ہوا اور جی بھر کر اور کھل کھل کر رونے کے بعد بھی اس کے من کا بھار ویسے کا ویسا ہی رہا۔ نکیشور کے مندر کی پوجا شام ڈھلے ختم ہوئی تو جسودھا مندر کے گھنٹے اور ڈھول کی باج اور مجیدوں کی تال سن چکی تو اس نے اپنے آنسو پونچھے اور اٹھ کر گھر واپس آ گئی اس نے چپکے چپکے پرارتھنا کی۔ "مہا ننا ماتا مجھ پر کرپا کرو۔ یہ بتاؤ کہ میں بڑھاپے اور جیون کے انت میں سڑک کے کنارے بیٹھ کر ہاتھ میں پیالہ پکڑ کر بھیک مانگوں گی، کیا تمہاری یہی اچھا ہے"۔

ہو سکتا تھا کہ جسودھا تقدیر کے آگے سر جھکا کر جیون ہلدر گھرانے کی خدمت کر کے اور ان کا کھانا بنا کر ہی بتا دیتی پر تقدیر تو کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ اتنی زیادہ محنت اور مشقت اب جسودھا کے بس میں نہیں رہی تھی۔ اس کے شریر کی شکتی ٹوٹ رہی تو۔۔۔۔۔۔ اب وہ یہ بھی نہیں بتا سکتی تھی کہ آخر ذہنی کیفیت اور نراشا کی کیا وجہ ہے۔ کس وجہ سے وہ اتنا ٹوٹتی جا رہی ہے۔ بس اس کا دماغ الجھا ہوا رہتا۔ جتنی دیر وہ کھانا تیار کرتی اس کا دماغ ایک ہی سوچ میں ڈوبا رہتا۔ "دیکھو، کبھی میں اس گھر میں انا ہوا کرتی تھی، ان کے بچوں کی دودھ ماں"۔

پچھلی یادیں اور گزرے دن ہیولے بن بن کر خالی تصویروں اور منظروں کے روپ

دھار دھار کر اس کی آنکھوں کے سامنے ناچتے۔ کبھی دیکھتی کہ وہ چوڑے کنارے والی اجلی کلف لگی ساڑھی باندھے، کھانوں سے بھرا ناشتے دان اٹھائے گھر کی طرف چلی جا رہی ہے۔ کبھی اس کو اپنی مرجھائی خشک چھاتیوں کا خیال آتا۔ کبھی بھری بھری دودھ کی کٹوریوں جیسی چھلکتی چھاتیاں یاد آنے لگتیں۔ ہائے رام اس کی گود تو کبھی خالی نہ رہی تھی ایک نہ ایک بچہ ان سے لپٹا چسڑ چسڑ دودھ پیتا ہوتا تھا۔

اس نے تو کبھی سپنے میں بھی نہ سوچا تھا کہ اس کی یہ بھری گود کبھی خالی اور سونی سونی رہ جائے گی۔ اپنی سوچوں اور کھلی آنکھوں دکھائی دینے والے سپنوں میں وہ ایسی گم اور کھوئی کھوئی رہنے لگی تھی کہ سارے گھر کو کھانا پروستی اور سب کو کھلا پلا کر اپنے آپ کھانا ہی بھول جاتی۔ کبھی کبھی وہ نکلیشور سے پرارتھنا کرتی ہے ! پربھو اب اگر ماؤں کو میری پرواہ نہیں رہی اور میں ان کے کام کی نہیں رہی تو پھر تم کاہے مجھے اپنے پاس نہیں بلا لیتے۔ کاہے ایک بار ہی دکھوں سے مجھے چھٹکارا نہیں دلا دیتے۔ اب میں اور زیادہ جینا نہیں چاہتی۔

ہوتے ہوتے ایک دن اس کی اس حالت کا اندازہ نئی مالکن کے سب سے چھوٹے بیٹے کو ہوا۔۔۔۔۔۔ وہ کہنے لگا: "ماں ! ہماری دائی انا کچھ بیمار ہے کیا؟ ایسا لگتا ہے کہ کچھ دن سے وہ بہک گئی ہے۔ اپنے آپے میں نہیں ہے"۔

"اچھا ! میں دیکھوں گی"۔ ماں نے بچوں کو تسلی دی۔

"ہاں بھئی"۔ ان کے پتی نے ان کی بات کاٹ کر۔ "ضرور دیکھو اور معلوم کرو۔ بات یہ ہے کہ وہ برہمن ہے۔ اسے اگر یہاں ہمارے پاس کچھ ہو ہوا گیا تو یہ تو پاپ ہوگا"۔

مالکن رسوئی میں پہنچیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ جسودھا نے بھات کی ہانڈی چولھے پر چڑھا رکھی ہے اور خود اپنی ساری رسوئی کے فرش پر پھیلا کر اس پر لمبی لیٹی ہوئی ہے۔

مالکن نے اس کو یوں ننگے بدن لیٹے دیکھا تو ان کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ "ارے دیدی یہ کیا ہے؟ "انہوں نے اس کی چھاتی پر ایک سرخ نشان دیکھ کر پوچھا۔

"مجھے پتہ نہیں، ہوسکتا ہے یہ بچوں کو دودھ چسانے کی وجہ سے پڑ گیا ہو"۔

" کیا فضول بات کرتی ہو، وہ اور ہوتی ہے دودھ کے چڑھاؤ کی سرخی یہ اور طرح کی سرخی ہے، ایک دم لال سرخ اور اب تم کونسا دودھ پلا رہی ہو، کسی بچے کو۔ تمہارے تو سب سے

چھوٹے والے کو بھی پیدا ہوئے دس سال گزر چکے ہیں"۔ ارے پھر ہم کا جانیں، لگتا ہے ہماری چھاتی پتھر کی طرح سخت ہو رہی ہے۔ مانو پتھر کی ہی ہو یا پھر اندر پتھر بھر گئے ہوں۔ وہ چھوٹا والا تو پیدا ہوتے ہی گجر گیا تھا، اچھا ہی ہوا۔ یہ سنسار رہنے کے قابل ہی کب ہے"۔

"اچھا ٹھہرو کل ہمارے پوتے کو دیکھنے ڈاکٹر آئے گا تو اس سے پوچھوں گی۔ مجھے تو یہ کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا ہے"۔

جسودھا نے آنکھیں موند لیں اور بولی: "ارے ہماری چھاتی تو پتھر ہو گئی ہے۔ پہلے تو یہ گٹھل سا پھرتا معلوم پڑتا تھا پر اب تو پتھر کی طرح سخت ہو کر ایک جگہ جم گیا ہے۔ پوری چھاتی بوجھل پتھر ہوئی پڑی ہے"۔

"اچھا تو پھر ڈاکٹر آ جائے تو میں اس سے کہہ دوں گی کہ تم کو دیکھ لے؟"

"ارے نہیں، نہیں بہودی۔۔۔۔۔ میں ڈاکٹر کو نہیں دکھاؤں گی بھلا پرائے مرد کے آگے اپنا آپا کھول دوں"۔

رات کو جب ڈاکٹر بچے کو دیکھنے آیا تو مالکن نے اپنے بیٹے کے ذریعہ جسودھا کی تکلیف اس کو کہلوائی کہ ویسے تو بظاہر کوئی دکھ درد نہیں پر وہ دن بدن کمزور اور تھکی تھکی رہنے لگی ہے۔

ڈاکٹر نے کہا ذرا دیکھ کر بتائیں کہ نپل تڑخا ہوا تو نہیں، اس کے آس پاس گلٹیاں تو نہیں ہیں یا بغل کے اندر کوئی گلٹی پھول کر گیند کے برابر تو نہیں بن گئی ہے۔

ڈاکٹر کا سوال سن کر مالکن نے دل ہی دل میں کہا۔ "اے ہے کتنے بے دھڑک اور بے شرمی سے بات کر رہا ہے۔ پر انہوں نے جا کر جسودھا سے پوچھا تو ڈاکٹر سے آ کر کہا کہ وہ یہ کہتی ہے کہ یہ ساری علامتیں تو بہت دنوں سے موجود ہیں"۔

"اس کی عمر کیا ہے؟"

"اگر آپ اس کے سب سے بڑے بیٹے کی عمر سے حساب لگائیں تو اس کی عمر پچپن سال بنتی ہے"۔

"اچھا ٹھیک ہے، میں دوا لکھ دیتا ہوں، منگوا کر استعمال کروائیں"۔ ڈاکٹر نے باہر جاتے ہوئے کہا۔

باہر جا کر اس نے ہلدر باڑی کے مالک سے کہا۔ مجھے معلوم ہوا کہ آپ کی مہاراجن

(باورچن) کی چھاتی میں کچھ گڑبڑ ہے۔مناسب یہی ہے کہ آپ اس کا معائنہ کینسر ہسپتال میں کروالیں، میں نے اس کو دیکھا تو نہیں پر جو حال سنا ہے، مجھے یقین ہے کہ یہ چھاتی کا کینسر ہے۔
اس موقعہ پر اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ اس گھرانے کے سب سے بڑے بیٹے ہلدر صاحب ابھی تک سترھویں صدی میں ہی جی رہے تھے۔بیسویں صدی میں تو اب کچھ ہی دن ہوئے انہوں نے قدم رکھا تھا۔اپنے تیرہ بچوں میں سے لڑکیوں کو انہوں نے بیاہ دیا تھا،لڑکوں کا یہ تھا کہ جو پل بڑھ چکے تھے وہ بھی اور جو ابھی جوانی کے دروازے پر تھے،سب ہی اپنی اپنی راہ اور مرضی کے مالک تھے۔پر ان کے بابا مسٹر ہلدر کا ذہن احیائے بنگال کے پچھلے دور کے طلسم سے آزاد نہ ہو پایا تھا۔وہ اپنے زمانے اور عہد کے نئے تقاضوں کو قبول کرنے پر تیار ہی نہ ہو پا رہے تھے۔نئے چلن سے حد بھر بدکتے اور اس کے خلاف بولتے تھے۔اب یہی دیکھئے کہ بچوں کو خسرہ یا چیچک کے ٹیکے لگوانے کے بالکل قائل نہ تھے۔ان کا کہنا تھا:

"ارے بھائی ہم۔۔۔۔۔یہ ستیلا کھسرا جیسی بیماریوں سے نہیں ڈرتے، یہ بیماریاں تو نیچ لوگوں کو ہوتی ہیں۔ان کا بھلا ہم لوگوں سے کیا واسطہ، ہمارے بچوں کو ٹیکے لگوانے کی کیا ضرورت یہ تو نیچ گندے لوگوں کی بیماریاں ہیں،ان ہی کے بچوں کو پکڑتی ہیں۔ارے ہم دیوتاؤں اور باہمنوں کے سیوک اور عزت کرنے والے گھرانوں میں ان کا گزر بھی نہیں ہوتا۔ بھلا یہ اچھوتوں،شودروں کی بیماریاں ہمارا کیا بگاڑ سکتی ہیں۔

انہوں نے ڈاکٹر کی بات پر بڑی ناک بھنوؤں چڑھائی۔"ہونہہ۔۔۔۔لو بھلا اور سنو۔کینسر کینسر اور کچھ نہیں،اس سے بڑی بیماری سوجھی۔ارے بھئی نہیں معلوم اس نے کیا بولا ہوگا اور تم نے کیا سنا۔ایسا کرو کوئی اچھا سا مرہم لکھ دو نسخے میں۔ مجھے پکا بھروسہ ہے کہ ٹھیک ہو جائے گا۔کہے دیتا ہوں میں تمہارے کہنے پر ایک برہمن عورت کو اسپتال میں تو ڈال نہیں سکتا"۔

اسپتال کا نام سن کر جسودھا بھی اکھڑ گئی۔کہنے لگی:"لو اور سنو ہم ہسپتال جائیں گے۔ایسا نہیں ہوسکتا۔ہم مرجائیں گے پر ہسپتال نہیں جائیں گے۔ہاں اسپتال جانے سے تو اچھا ہے کہ مر ہی جائیں۔ارے میں نے اتنے بچے جنے تو ایک بار بھی استپال کا منہ نہ دیکھا۔تو اب آپ چلی ہیں مجھے اسپتال میں ڈالنے۔ارے وہ ناس مارا ہسپتال ہی تو گیا تھا نا اپنی دونوں ٹانگیں کٹوا آیا"۔

MashalBooks.org

مسز ہلدر نے اس کو تسلی دی اچھا تم گھبراؤ نہیں میں تم کو ایک مرہم لا دوں گی۔ ایک سادھو بناتا ہے جادو کی طرح کام کرتا ہے۔ ایک دو بار لگا کر اس کا منہ کھل جائے گا۔

پر وہ جادوئی مرہم ناکام رہ گیا، اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ کچھ دن اور گزرے تو جسودھا کی بھوک مر گئی اور کھانا پینا بالکل ہی چھٹ گیا۔ بڑی تیزی سے کمزوری بڑھنے لگی، وہ نڈھال ہو کر رہ گئی۔ اب تو وہ اپنی بائیں چھاتی کو ڈھک بھی نہیں پاتی تھی۔ اس پر اپنی ساری کا پلو بھی نہ ڈال سکتی تھی۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا تھا جیسے آگ بھڑک رہی ہے، اندر اس کی کھال جگہ جگہ سے تڑخ رہی تھی، پوری چھاتی ایک بڑا سا گھاؤ بن گئی تھی۔ وہ پوری طرح چارپائی سے لگ گئی۔

اس کی حالت دیکھ کر ہلدر بابو تو بوکھلا گئے۔ ان کے تو ہاتھ پیر پھول گئے۔ بھلا ان کی چھت تلے ایک برہمنی پران چھوڑ دے گی۔ یہ تو پاپ مہاپاپ ہوگا، ان کے سر پر۔ یہی سب سوچ کر انہوں نے جسودھا کے بیٹوں کو بلا کر خوب ڈانٹا پھٹکارا۔ "ارے بے شرمو یہ تمہاری ماں ہے۔ اس نے تم کو جنم دیا، پالا پوسا، پروان چڑھایا اور اب مرنے کو پڑی ہے تو تم پلٹ کر اس کی خبر نہیں لیتے۔ اچھا چلو اب تو اس کو گھر لے جاؤ۔ یہ کتنی بری بات ہے کہ ایک باہمنی ایک کائستھ کی چھت تلے پران چھوڑے"۔

جسودھا کا حال سن کر کنگالی روتا بلکتا اس کے پاس آیا۔ جسودھا اپنی کوٹھریا میں پڑی تھی، اندھیری کوٹھری میں روشنی کی کوئی کوئی کرن جو آ رہی تھی وہ بھی اب غائب ہو رہی تھی، اس نے رو رو کر اس کی منتیں کیں۔ "اری مجھے کیا ہو گیا۔ میں نے بھی تجھ سے بدسلوکی کر کے بڑا دکھ بھوگا۔ دو سال کے اندر اندر سب خاک ہو گیا۔ مندر کی پلیٹیں چوری ہو گئیں تو پیٹھ پر میرے پھوڑے نکل رہے ہیں اور وہ جو ہے نا کتیا گولاپی۔ ارے وہ تو نیپال کے سنگ نکل گئی اور جاتے سمے مندر کا گلہ توڑ کر سارا پیسہ بٹور کر لے گئی اور اب تاوا کیشور میں دکان ڈال کر بیٹھی ہے۔۔۔۔۔۔ اچھا اب چل چھوڑ گھر چل، میں ہر طرح تیری سیوا کروں گا، مجھ سے جیسے بھی بنے گا تجھے آرام دوں گا"۔

جسودھا چپ چاپ اس کی باتیں سنتی رہی، پھر بولی:

"دیا جلا دے کنگالی۔ تیل کا دیپ"۔ روشنی ہو گئی تو اس نے اپنی بائیں چھاتی کھول کر دکھائی۔ "یہ دیکھو پورا کا پورا گھاؤ ہو گیا ہے۔ اب تو مجھے گھر لے جا کر کیا کرے گا۔ مجھ سے کیا پائے گا؟ مجھے لینے کیوں آیا ہے؟"

"مالک کا حکم ہے اس نے ہم سے کہا ہے"۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔ مالک اب مجھے اپنی باڑی میں رکھنا نہیں چاہتے"۔ جسودھا نے ایک گہری آہ بھری۔ "ٹھیک ہی تو ہے میں اب کسی کام کی تھوڑا ہی رہی ہوں۔ ارے تو مجھ کو گھر لے جا کر کیسے سنبھالے گا"۔

" کوئی بات نہیں تو چنتا مت کر۔ کل میں آ کر لے جاؤں گا تجھے۔ آج میں کوٹھری صاف کر لوں گا، سب ٹھیک ٹھاک کر کے لے جاؤں گا۔ پکی بات ہے ایسی ہی جیسے میں اس سمے تیرے سامنے کھڑا ہوں"۔

"لڑکے تو سب ٹھیک ٹھاک ہیں نا۔ پہلے تو نوال اور گوبر آگے پیچھے کبھی نکل بھی آتے تھے۔ پر اب تو کتنے دنوں سے دکھائی نہیں صورت بھی"۔

"خود غرض ہیں۔ حرامی سب کے سب۔ ہیں کس کے آخر کو میرا ہی تخم تو ہیں۔۔۔۔۔ میری ہی طرح بے حس اور سنگدل ہیں"۔

"اچھا پھر کل تو آئے گا نا"۔ جسودھا بولی۔

"آؤں گا۔۔۔۔۔ آؤں گا۔۔۔۔۔۔ آؤں گا یہ میرا وچن ہے"۔ اچانک جسودھا مسکرا دی تھی۔ یہ بڑی دل آویز مسکان تھی۔ دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والی جو بیتے سموں اور گزرے دنوں کی کھوئی ہوئی یادوں کو دوبارہ کھوج لانے کی شکتی رکھتی ہے۔ مسکراتے مسکراتے اس نے تھوڑا الجھا کر کہا:

"تجھے یاد ہے نا؟"]["کیا یاد ہے؟"

"یہی کہ کبھی تو ان چھاتیوں کو کیسے چاؤ سے سہلایا کرتا تھا۔ ایسا کئے بنا تم کو نیند نہیں آتی تھی اور میری گود کبھی خالی نہ ہوتی تھی۔ دودھ پینے والوں کا تانتا ہی بندھا رہتا تھا اوپر سے مالکن کے گھر کے بچے۔ کچھ پتہ نہیں کیسے۔ میں سب کا پورا ڈالتی تھی۔ کس طرح کام چلاتی تھی"۔

"سب یاد ہے۔ ایک ایک بات یاد ہے"۔ یہ کہتے کہتے اس کی نظر جسودھا کے کمزور نڈھال وجود پر پڑی۔ افسوس اور رحم سے اس کا دل بھر آیا۔ وہ جو اپنے ہی من کی اور تن کی لوبھ اور لابھ کے آگے کسی طرف دیکھتا ہی نہ تھا نہ کوئی اور بات سوچتا تھا۔ جسودھا کا حال دیکھ کر بہت اداس ہو گیا۔ ایک خاموش اداسی اس کے تن اور من دونوں ہی پر اترتی چلی گئی۔ اس نے جسودھا کا ہاتھ

MashalBooks.org

تھام لیا۔

"ارے تم کو تو تپ چڑھی ہوئی ہے"۔

"ہاں شائد اس پھوڑے کی وجہ سے ہے"۔

"اور یہ اتنی سڑی ہوئی بدبو کہاں سے آ رہی ہے؟"

"میرے زخم سے آ رہی ہے"۔ جسودھا نے جواب دیا اور آنکھیں موند لیں۔

پھر بولی:"دیکھو اگر کوئی سنیاسی وید یا حکیم مل جائے تو اچھا ہے تم کو یاد ہے نا گوپال کا ٹائی فائڈ اسی نے ٹھیک کیا تھا، ہومیو پیتھ دوا سے"۔

ٹھیک ہے میں بلا لاؤں گا۔ پہلے تجھے کل گھر تو لے جاؤں"۔

اس دن کنگالی چلا گیا۔ پر جسودھا کے کانوں میں اس کی بیسا کھیوں کی کھٹ کھٹ سنائی نہیں دی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ایسا لگتا تھا جیسے کنگالی ابھی موجود ہے۔ سو وہ دھیمی دھیمی آواز میں بولتی رہی۔ کہتے ہیں کہ اگر کوئی بچہ ایک بار بھی تمہارا دودھ پی لے تو تم اس کی ماں بن جاتی ہو اور ذرا میرے بچوں کا حال تو دیکھو گوپال، نیپال سے لے کر سارے بچے اور ہلدر باڑی کے سارے پوت میرا ہی دودھ پی کر پلے بڑھے پر مجال ہے جو کسی نے آنکھ اٹھا کر میری اور دیکھا ہو یا میرا حال پوچھا ہو۔

لگتا تھا جسودھا کا کھلا ہوا زخم اور اس کے آس پاس تیزی سے بڑھتے ہوئے اور ٹپکتے ہوئے سوراخ منہ کھول کر ہنس دیئے ہوں۔ اس کا مذاق اڑا رہے ہوں۔۔۔۔ سنو !یہ کہتے کہتے اس نے آنکھ کھول کر دیکھا تو کنگالی جا چکا تھا۔ اس رات اس نے لیبنی سے لائف بوائے صابن کی ایک بٹی لی اور دوسری صبح اس نے صابن اچھی طرح مل مل کر اشنان کیا۔ کیسا تعفن تھا، کتنی بدبو تھی، کچھ ایسی ہی بدبو جیسے مرے ہوئے کتوں اور بلیوں کی سڑے بسے پنجروں سے اٹھتی ہے۔ جیسے محلے اور علاقے کے تابدانوں اور کوڑوں کے ڈرموں سے اٹھتی ہوئی سڑاند۔ صابن سے مل مل کر وہ اپنی ذات کو اس تعفن اور بدبو سے نجات دلانا چاہ رہی تھی۔۔۔۔۔ بات یہ ہے کہ اس نے ہلدر باڑی کے بچوں کو اپنا دودھ پلایا تھا۔ اپنی چھاتیوں کی صفائی اور طہارت کا وہ پورا پورا خیال رکھتی تھی۔ تیل سے خوب اچھی طرح مالش کرنے کے بعد صابن مل مل کر ان کو دھوتی، خصوصاً نپل کی صفائی تو بہت ہی توجہ اور احتیاط سے کرتی تھی اور وہی چھاتیاں جن کی اس نے مدتوں دیکھ بھال اور

رکھ رکھاؤ کیا تھا، اب آخر میں اگر ایسے وقت میں اسے دھوکا دے گئی تھیں، جب وہ کسی قابل نہیں رہی تھی۔ آخر کیوں؟ یہ بات اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ اتنا تیز کٹیلا صابن لگنے سے اس کی کھال جل اٹھی، جیسے کسی نے زخموں پر انگارے رکھ دیئے ہوں، وہ چکرا کر رہ گئی تھی، پھر بھی جس طرح ہو سکتا تھا اسی قدر مل مل کر اس نے اپنا بدن صاف کیا۔ نہا دھو کر اٹھی تو یہ حال تھا کہ آنکھیں تلملا رہی تھیں، سارے بدن میں آگ سی بھڑک رہی تھی، سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا تھا۔ اندھیری کوٹھری کا فرش دیکھ کر ٹھنڈک کا احساس ہوا تو وہ وہیں اپنی ساڑی کا پلو بچھا کر اسی پر پڑ گئی۔ اب اس کی چھاتی اتنی بوجھل ہو رہی تھی جیسے منوں بوجھ بھرا ہوا اس میں۔ اس بوجھ تلے وہ دبی اور پسی جا رہی تھی، اتنی کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکتی تھی۔ فرش پر گرتے ہی وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

اگلے دن اپنے وعدے کے مطابق کنگالی اسے لینے آیا تو اس کا حال دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ آخر نبین آ گیا، لیکن اس نے بھی اس سے بڑھ کر چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ "ارے ان لوگوں کو بھی کوئی آدمی بول سکتا ہے، آدمی ہیں کہ پتھر۔ ارے اس عورت نے اس گھر کے بالکوں کو اپنا خون چسا چسا کر پروان چڑھایا۔۔۔۔۔ اس کا دودھ پی پی کر پلے بڑھے اور آج کوئی اس کی اور آنکھ بھر نہیں دیکھتا، ان کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ ڈاکٹر کو بلا لیتے۔ اچھا پھر میں ہی جاتا ہوں۔ ہری ڈاکٹر کو لے کر کے آتا ہوں۔

"ہری ڈاکٹر نے آتے ہی کہہ دیا فورا ہسپتال لے جاؤ۔ عام طور پر ایسی حالت میں آنے والے مریضوں کو ہسپتال والے داخل نہیں کرتے اور لینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ لیکن چونکہ جسودھا کو ہلدر بابو کے حوالے سے لائے تھے، اس لئے اس کو اسی وقت داخل کر لیا گیا۔

"اسے کیا ہوا ہے؟ ڈاکٹر بابو۔۔۔۔۔ بولو نا تم ہم کو بتاؤ نا۔۔۔۔۔۔ اس کو کیا ہوا ہے؟ "وہ چھوٹے سے لڑکے کی طرح بلبلا بلبلا کر پوچھ رہا تھا۔

"کینسر"۔

"ارے تو کیا چھاتی میں بھی کینسر ہو سکتا ہے؟"

"تو پھر اور کیا ہو سکتا ہے؟"

"ڈاکٹر صاب۔۔۔۔۔یہ کیسے ہوا۔اس نے تو بیس اپنے اور تیس ہلدر بابو کے بالکوں کو دودھ پلایا ہے، یہ تو۔۔۔۔۔دودھ کا بھرا ہوا کنستر تھی"۔

" کیا کہا تم نے کتنے بچوں کو اس نے دودھ پلایا ہے؟"

"پچاس۔۔۔۔پورے پچاس بچوں کو"۔

"ہائیں پچاس بچوں کو!"

"ہاں ڈاکٹر صاب"۔

"اس کے بیس بچے پیدا ہوئے؟"

"جی حضور اس کے بیس بچے پیدا ہوئے"۔

"ارے رام رام۔۔۔۔۔۔ہے بھگوان"۔

"بات سنو۔۔۔۔۔۔اب تم کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟"

"میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ اس کارن ہوا ہے کہ اس نے اتنے بچوں کو اپنی چھاتی چسائی تھی؟"

" کچھ کہا نہیں جا سکتا۔کینسر ہو جانے کا کوئی خاص سبب تو نہیں کہا جا سکتا یقین سے۔ یہ بھی بات ہے اکثر وہ عورتیں جو کثرت سے اپنا دودھ پلاتی ہیں۔۔۔اچھا تم یہ تو بتاؤ پہلے تمہیں ہوش کیوں نہیں آیا۔ یہ حالت ایک دن میں تو نہیں ہو جاتی۔رفتہ رفتہ ہی آدمی اس حال کو پہنچتا ہے۔اگر شروع میں خیال کر لیتے اور یہ یہاں آ جاتی تو اس حال کو تو نہ پہنچتی، ٹھیک ہی ہو جاتی شائد"۔

"سرکار یہ ہمارے ساتھ رہ نہیں رہی تھی۔ہماری لڑائی ہو گئی تھی"۔

"اچھا۔۔۔۔۔ٹھیک ہے میں سمجھ گیا"۔

"پھر ڈاکٹر صاب۔۔۔۔۔آپ کیا سمجھتے ہیں یہ ٹھیک ہو جائے گی"۔

"تم پوچھتے ہو یہ ٹھیک ہو جائے گی۔ارے یہ اب اپنے دن پورے کر رہی ہے۔اب تم اس کی سانسیں گنتے رہو۔جتنی سانسیں ہیں وہ پوری کرے وہی بہت ہیں۔تم اسے لائے ہی آخری سٹیج پر ہو۔اس حال کو پہنچ کر کوئی بھی نہیں بچ سکتا"۔

روتا دھوتا کنگالی واپس ہلدر بابو کی کوٹھی پر آ گیا، اس کے آنسوؤں اور آہوں سے گھبرا

MashalBooks.org

کر ہلدر بابو کا منجھلا بیٹا ڈاکٹر سے جا کر ملا۔

ڈاکٹر نے اس سے کہا یہ بیماری تو لمبی اور بہت آہستہ آہستہ جڑ پکڑتی ہے۔ کیوں اور کس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کوئی نہیں بتا سکتا اور چھاتی کے کینسر کا یہ ہے کہ اس کی علامتیں جلدی ظاہر ہو جاتی ہیں اور ان سے اس مرض کو ابتدا ہی میں پکڑا جا سکتا ہے۔ پہلے سینے میں ایک گلٹی نمودار ہوتی ہے، جو کبھی غائب ہو جاتی ہے کبھی ابھر جاتی ہے۔ پھر بڑی ہو کر پھوڑا سا بن جاتا ہے۔ پتھر کی طرح سخت اور سرخ کھال جگہ جگہ سے تڑختی ہے اور نپل جگہ جگہ سے تڑختا ہو تو یہ یقیناً کینسر کی علامت ہے اور بغل میں جو بڑا سا پھوڑا بنتا ہے وہ پک جاتا ہے، اس میں مواد پڑنے لگتا ہے۔ یہ السر بن جاتا ہے، آخری اسٹیج پر بخار بھی ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر پھوڑے کا منہ بن جائے تو پھر حرارت نارمل ہی رہتی ہے اور یہ مرض کی دوسری اسٹیج ہوتی ہے۔ لڑکا یہ تفصیل سن کر جیسے گنگ ہو گیا اور صرف یہ ہی بول سکا تھا۔

"وہ بچ تو جائے گی؟"

"نہیں"۔

"اچھا پھر یہ کتنے دن یہ تکلیف جھیلے گی؟"

"میرا خیال ہے زیادہ دن نہیں لگیں گے"۔

"اچھا اب اگر اس کے بچنے کی کوئی امید ہے ہی نہیں تو آپ اس کا علاج کیسے کریں گے؟"

"بس پین کلرز۔۔۔۔۔سن کر کے درد کم کرنے والی دوائیوں اور نیند کی نشہ آور گولیوں کے ساتھ"۔

"جب اس کی بھوک ختم ہو گئی تھی اور وہ کچھ کھا سکتی تھی نہ پی سکتی تھی تو کسی ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھایا؟"

"دکھایا تھا"۔

"پھر اس نے کیا بتایا؟"

"انہوں نے کہا تھا ہسپتال لے جاؤ، یہ ساری علامتیں کینسر کی ہیں۔ مگر وہ ہسپتال جانے پر راضی نہ ہوئی۔

"وہ ہسپتال جانے پر راضی کیسے ہوتی، سر پر تو موت منڈلا رہی تھی"۔

لڑکے نے گھر واپس آ کر سارا حال بتایا اور کہا: "جب ارون ڈاکٹر نے کہا تھا کہ یہ کینسر ہے اگر اسی وقت داخل کر دیا جاتا تو شاید بچ جاتی"۔ اپنے سر الزام لگتے دیکھ کر اس کی ماں نے چلا کر کہا: "ارے جب تم اتنے ہی سیانے بنتے ہو تو پھر تم آپ ہی کیوں نہ لے گئے۔ میں نے تمہارا ہاتھ تو نہیں پکڑ لیا تھا، بولو میں نے منع کیا تھا کیا؟"

بہرحال ایک احساس جرم اور ندامت تھا جو ماں بیٹے کے ذہنوں میں کلبلا رہا تھا۔ ایک ناقابل بیان شرمندگی اور پچھتاوا تھا جو اندر ہی اندر ایک ابال کی طرح دونوں کے اندر کھل بل پک رہا تھا۔ جیسے گندا پانی کسی نالے یا پائپ میں جمع ہوتے اور سڑتے سڑتے عفونت اور گندی میں گیس بننے لگے اور اس کے دباؤ سے نالہ ہی پھٹ پڑے، ساری غلاظت اور گندی پھٹ کر ابل کر باہر کو نکل پڑے۔ رہ رہ کر دکھ ہوتا تھا۔ "وہ ہماری چھت کے ہی تلے رہ رہی تھی، ہم سے کبھی اتنا نہ ہوا کہ ایک بار تو پلٹ کر اس کی طرف دیکھتے، کبھی اس کے دکھ سکھ کی خبر ہی نہ لی۔ بھگوان! اتنا موذی روگ۔۔۔۔۔ کون جانے کب ہو گیا اور کب سے وہ اس کو سہارتی اور بھوگتی رہی تھی اور اسے پتہ بھی نہ چلا کہ یہ کیسا روگ اس کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ آخر تو اس نے ہم سب کو ہی پالا تھا اپنا دودھ چسا چسا کر، اس اکیلی نے اور ہم کیسے ہیں ہم سب نے مل کر بھی اس کا آگا تاگا نہ لیا۔ آخر ہم سب ہی تو اس کے بچے تھے۔ اس کا ہم پر حق تھا، وہ ہم سب ہی کو تو اپنا سمجھتی تھی اور اب وہ ہسپتال میں تنہا مرنے کو پڑی ہے۔ وہ اس دنیا میں اکیلی تو نہ تھی، پتی تھا اور اتنے بہت سے بیٹے، مگر وہ ہماری محبت میں سب کو چھوڑے ہمارے ہی دوارے پڑی رہی تھی، وہ ہماری ہی تو ذمہ داری تھی، اس کی تندرستی پر رشک آتا تھا لوگوں کو۔

ایک بار یہ سب سوچتے تو دوسری بار اور ہی باتیں شروع ہو جاتیں۔ اپنی بے پروائی اور ایسے سلوک کے بے شمار جواز تلاش کر لئے جاتے، بھئی اب بھاگ کے لکھے کو تو کوئی بدل نہیں سکتا۔ اس کے بھاگوں میں یہی روگ لکھا تھا، یہ تو بھگوان کی اچھا تھی۔ یہی تو ارون ڈاکٹر نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ کینسر ایسا روگ ہے کہ جان لے کر ہی ٹلتا ہے، اب کوئی تقدیر کے لکھے کو تو مٹا نہیں سکتا، نہ ہی قسمت سے لڑ سکتا ہے۔ اب دیکھو نا اگر وہ ہمارے گھر میں مر جاتی تو اس کا پتی اور پوت تو ہم سے سوال کرنے بیٹھ جاتے۔ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ بڑی جواب دہی پڑ جاتی ہمارے سر۔ اب

MashalBooks.org

یہ ہے کہ ہم نے تو اپنے آپ کو اتنے بڑے الزام سے بچا لیا ہے۔ اب ہم کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہیں۔

بڑے ہلدر بابو نے بھی ان کی باتوں پر صاد کیا اور ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولے:

"مجھے تو ارون ڈاکٹر نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ کینسر ہے اور یہ وہ مرض ہے کہ اس کے حملے سے کوئی بچ ہی نہیں سکتا اور اب یہ دیکھو کہ دیدی کے تو کینسر تھا۔ ہسپتال میں تو وہ اس کی چھاتی کا آپریشن کر کے کاٹ ہی دیتے، وہ پھر بھی نہ بچتی، اس لئے کہ یہ روگ تو موت کا سندیسہ ہی بن کر آتا ہے۔۔۔۔اب تم جانو کہ سورگباشی پتا جی ان لوگوں کی کتنی عزت کرتے تھے۔ اس لئے کہ باہمن ہیں۔ ہماری تو یہی کوشش ہوتی ہے کہ پتا جی کے ہی بنائے راستوں پر چلیں۔ آج جو ہم اتنا پھل پھول رہے ہیں۔ یہ ان ہی کی آشیرباد کا نتیجہ ہے۔ اب اگر دیدی ہمارے گھر میں پران چھوڑ دیتیں تو ہم کو ان کے کریا کرم کی ساری ریت رسمیں پوری کرنا پڑتی تھیں۔ بڑی پوجا کا بندوبست کرنا پڑتا۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ کینسر کے مریض ہسپتال میں داخل ہونے کے چند دن بعد ہی قید حیات سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ لیکن جسودھا کے معاملے میں تو ڈاکٹروں کو بھی حیرت تھی کہ وہ پورے ایک ماہ سے بھی زیادہ عرصہ کھینچ لے گئی۔ شروع شروع میں کنگالی اس کے بیٹے اور نبین بڑی پابندی سے روز اس کے پاس جاتے رہے۔ اس دوران میں اس کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا، وہ اسی طرح کوما کی حالت میں بے سدھ تیز بخار میں پڑی رہی۔ دراصل وہ کوما کی حالت میں اپنی سانسیں پوری کر رہی تھی، چھاتی کا زخم روز بروز بڑھتا جاتا تھا اور اب تو پوری چھاتی ایک بڑے اور کھلے ہوئے دہان زخم کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ اگرچہ زخم کی مرہم پٹی بڑی پابندی سے کی جا رہی تھی، زخموں کی ڈریسنگ کرنے والی جراثیم کش دواؤں میں بھیگی ہوئی پٹی، روزانہ تبدیل کی جاتی تھی، لیکن دواؤں کی مخصوص بو جب زخم کے گلتے اور سڑتے ہوئے گوشت کے تعفن سے ملتی تو ایسی ناقابل برداشت تعفن اور بدبو اٹھتی تھی کہ پاس کھڑے رہنا ممکن نہ تھا۔

سب سے پہلے کنگالی چرن نے محسوس کیا کہ وہ اب ہر احساس اور ضرورت سے پورے طور پر بے نیاز اور لاتعلق ہو چکی ہے۔ اس نے ایک دن ڈاکٹر سے کہا کہ ہم اس کو چاہے کتنا ہی پکاریں اس کا جواب تو الگ رہا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

MashalBooks.org

" کیوں کیا تمہارے خیال میں یہ اچھی بات نہیں کہ وہ جس کرب واذیت سے گزری ہے اس سے بے خبر بے سدھ پڑی رہی، ورنہ ایسے زخم کی دردناک کراہیں کون برداشت کر سکے گا"۔

" کیا اس کو معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کو دیکھنے آتے ہیں؟"

" یہ کہنا تو مشکل ہے۔کون کہہ سکتا ہے کہ اس کو کوئی خبر ہوتی ہے یا نہیں"۔

" یہ کچھ کھا پی بھی سکتی ہے؟"

" کھانا پینا کیسے ممکن ہے اس کو تو غذا ڈرپ نالی کے ذریعہ پہنچائی جارہی ہے"۔

" اچھا تو اس طرح کوئی زندہ رہ سکتا ہے؟"

" بھئی اب یہ کیا کھوج کرر ہے ہو اور کیوں؟"

ڈاکٹر کو اس کی باتوں پر غصہ آ رہا تھا۔اس کو احساس تھا کہ اس کا غصہ صرف جسودھا اور کنگالی تک محدود نہ تھا، بلکہ دنیا بھر کی ان تمام عورتوں پر تھا جو سینے کے کینسر کی ابتدائی علامتوں کو نظر انداز کرتی ہیں۔اندر ہی اندر مرض کو پالتی رہتی ہیں، جس کا نتیجہ ایسے مہلک اور اذیت ناک کینسر کے پھوڑے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ہسپتال آنے کا فائدہ ہی کوئی نہیں، اسے تو کوئی سدھ بدھ ہی نہیں۔کون آیا کون گیا۔آنکھ کھول کر پہچاننا تو دور کی بات ہے۔اس کے تو کان میں کوئی آواز ہی نہیں پڑتی"۔

جب کنگالی کو اپنے کسی سوال کا بھی تسلی بخش جواب نہ ملا تو اس نے مایوسی سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔"ڈاکٹر اپنی سی کر تو رہے ہیں۔اب ہمارا تو کوئی کام ہی نہیں"۔اس نے نبین سے کہا۔

ہمت کر کے نبین نے ڈاکٹر سے کہا:"جب یہ پران چھوڑ دے تو یہ ہلدر بابو کا فون نمبر ہے۔اس نمبر پر اطلاع دے دیں، وہ ہم کو خبر دے دیں گے"۔

لیکن نبین نے کنگالی سے کہا:" کنگالی اگر اس نے جاتے سمے آخری بار تم کو دیکھنے کی خواہش کی تو۔۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔۔؟ دیکھو وہ تمہاری پتی ورتا استری تھی۔اب آج کون کہہ سکتا ہے کہ اس نے اتنے بچوں کو جنم دیا اور پروان چڑھایا۔اس نے تم کو کبھی دھوکا نہیں دیا، نہ ہی بے وفائی کی کبھی کسی دوسرے آدمی پر نظر اٹھائی"۔

اتنا کہتے کہتے نبین سوچوں میں ڈوب گیا، اس نے جب سے جسودھا کو اس حال میں بے سدھ پڑے دیکھا تھا اور اس کے سینے میں کھلے ہوئے زخموں پر نظر ڈالی تھی۔ اس کے اوپر عجب طرح کی فلسفیانہ کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ سوچوں کا جمگھٹا سا تھا جو گھٹاؤں کی طرح اندر اٹھ رہا تھا، جو اس کے اندر ناگ سے لہرا رہے تھے وہ آپس میں یوں گڈمڈ کرتے ہوئے گتھے جا رہے تھے جیسے ملن کرتے ہوئے ناگ آپس میں گتھ رہے ہوں۔ اس کا دل عجیب طرح سے اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ عجب سی خواہش اور تاسف تھا کہ یہ اتنی خوبصورت بھری بھری رسیلی چھاتیاں آخر کو یوں ختم ہوئیں۔۔۔۔ اچھا مٹی ڈالو۔ آدمی کے شریر کی بھی کوئی حقیقت ہے، وہ تو بالکل ہی مٹی اور خاک ہے۔ ایک مشت غبار۔۔۔۔ ایک بار ہی جب ترتیب عناصر میں خلل آ جائے تو بس اس کی ساری شادابی اور تازگی ختم ہو جاتی ہے۔ بس فنا ہی فنا ہے۔ نہوت ہی انت ہے۔

کنگالی کے پاس نبین کی نصیحت سننے کا وقت نہ تھا۔ جہاں تک جسودھا کے وجود کا تعلق ہے وہ اب اس کو اپنے ذہن سے نکال دینا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ جب وہ پہلے دن اس کو دیکھنے کے لئے ہلدر بابو کے گھر گیا تھا، جب بھی اور جب شروع شروع میں اسپتال جاتا تھا تو وہ واقعی اس کے لئے دل سے پریشان تھا، وہ اس کی صحت اور زندگی کی آشا لے کر جایا کرتا تھا، پر بعد میں دھیرے دھیرے وہ جوش اور جذبہ ٹھنڈا پڑتا گیا۔ جس دن سے ڈاکٹر نے اس کو بتایا تھا کہ جسودھا بچے گی نہیں اور بہت جلد یہ سنسار چھوڑ جائے گی۔ جب ہی سے اس نے اس کے خیال کو اپنے ذہن سے نکال دیا تھا، اسی وقت وہ اس کے لئے مر چکی تھی۔۔۔۔۔ اس خیال سے اس کو بالکل دکھ نہ ہوا تھا۔ اس کے بیٹے بھی تو آخر اسی کے بیٹے تھے۔ ویسے بھی انہوں نے اپنے اور اپنی ماں کے درمیان ایک دوری اور فاصلہ ہمیشہ محسوس کیا وہ بھی جس ماں سے مانوس تھے، وہ ایک اٹل اور بڑی مضبوط ہستی تھی۔ چمکدار بالوں کا کسا ہوا اونچا سا جوڑا باندھے سفید براق سی کھڑ کھڑاتی کلف دار ساری باندھے۔ وہی ان کی ماں تھی اور یہ اسپتال کے پلنگ پر پڑی مرجھائی ہوئی بے سدھ عورت تو ان کی ماں نہ تھی۔

ادھر کوما کی یہ کیفیت جسودھا کے لئے ایک راحت سے کم نہ تھی۔ اس لئے کہ چھاتی کے کینسر کی جو تکلیف اور تڑپ ہوتی ہے اس کے احساس سے وہ بیگانہ ہو گئی تھی۔ اتنا تو وہ جانتی تھی کہ وہ ہسپتال میں ہے، اس کو یہ بھی احساس تھا کہ وہ ایک غنودگی کے عالم میں پڑی ہے اور یہ غوط،

یہ غنودگی اور ننداسا پن نشیلی داؤں کے اثر سے ہے اور اس کیفیت کی وجہ سے اسے بڑا سکون مل رہا ہے۔ اس کا دماغ اس سکون کی حالت کی وجہ سے اس مغالطے میں تھا کہ شاید ہلدر بابو کا کوئی بیٹا پڑھ لکھ کر ڈاکٹر ہو گیا ہے۔ جب ہی تو وہ اس نرمی اور دھیان سے اس کی دیکھ بھال کر کے اس کو سکون پہنچا کر اپنے دودھ پلانے کا بدلہ چکا رہا ہے۔ پر وہ بچے تو اسکول کی پڑھائی ختم کرتے ہی کاروبار میں لگا دیئے جاتے تھے، پھر یہ ڈاکٹر کیسے بن گیا۔ جو بھی ہو۔۔۔۔۔ میں پوچھوں کہ یہ مجھے اس سڑتی ہوئی چھاتی کی سڑانداور بو سے چھٹکارا کیوں نہیں دلا دیتا۔ ارے کیسی سڑاند ہے کہ بیان نہیں ہو سکتی اور کوئی یقین بھی نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ وہ کتنا دھیان رکھتی تھی اپنی ان چھاتیوں کا کہ وہی تو اس کے رزق اور کمائی کا وسیلہ تھیں اور اس کو پتہ تھا کہ یہ دودھ سے لبالب بھرے ڈبے ہیں، جن کا وہ کاروبار کرتی ہے۔ یہی تو اس کا سرمایہ اور پونجی ہے، سو وہ ان کو بچا بچا کر رکھتی تھی۔ اچھے اعلیٰ درجے کے صابن سے دھو کر صاف ستھرا کر کے رکھتی۔ ان کی حفاظت کے خیال سے اس نے کبھی بلاوز تک تو پہنا نہیں تھا۔ اتنی بڑی بڑی تھیں کہ بلاؤز میں سماتی ہی نہ تھیں۔

جب مسکن اور نشہ آور دواؤں کا اثر زائل ہونے لگتا تو جسودھا درد کی شدت سے تڑپنے اور چیخنے چلانے لگتی تھی۔ آنکھیں بند ہوتیں اور ہائے ہائے پکار رہی ہوتی اور پھر دھندھلائی ہوئی آنکھوں کو کھول کھول کر کسی نرس یا ڈاکٹر کی اور دیکھتی کہ کاش وہ اس کی مدد کر سکیں۔ کبھی ڈاکٹر قریب آتا تو وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی۔ "ارے تو میرا دودھ پی پی کر اتنا بڑا ہوا۔ پر تو اب مجھے اتنا دکھ کیوں دے رہا ہے"۔

اس کے نزدیک ساری دنیا ہی کو اس نے دودھ پلایا اور پروان چڑھایا تھا۔ سو ڈاکٹر بھی اس کا دودھ پی کر پروان چڑھا تھا۔ وہ اس کے قریب آتا، پھر وہی انجکشن پھر وہی مسکن پین کلر۔ یہی چکر چلتا رہتا۔ آخر ایک دن اس کا پھوڑا، آتش فشاں پہاڑ کی طرح ابل پڑا۔ ایسی سڑانداور ایسی بدبو کہ اس کے قریب جانا بھی ممکن نہ رہا۔

ایک رات جسودھا کو لگا کہ اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہوئے جا رہے ہیں۔ بس اب جیون کا انت آ گیا ہے، اس نے اپنی بند آنکھیں کھولے بنا ہی محسوس کیا کہ کوئی اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہے۔ پھر وہ انجکشن کی سوئی چبھی ہے بازو میں۔ اب سانس لینے میں دشواری ہو رہی ہے۔ اب بچنا مشکل ہے۔ ارے یہ کون لوگ ہیں جو اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ کیا یہی بچے ہیں

MashalBooks.org

جنہیں اس نے اپنا دودھ پلا پلا کر پروان چڑھایا تھا۔

جسودھا سوچتی تھی کہ اس نے اپنے بچوں کو اپنا دودھ پلا کر اس لئے پالا کہ وہ ان کو اس سنسار میں لائی، اسی نے ان کو جنم دیا۔ اس نے ہلدر گھرانے کے بچوں کو دودھ پلایا کہ اس کو اپنے پریوار کی روٹی رزق کمانا تھا۔ ان کا پیٹ بھرنا تھا۔ اس کو لگتا تھا کہ اپنے پریوار کا پیٹ پالنے کے لئے اس نے دنیا بھر کو اپنے ہی دودھ پر پالا تھا۔ پھر یہ سب اس کے پاس کیوں نہیں، کیوں اس انتم سمے انہوں نے اس کو اکیلا چھوڑ دیا۔ ارے یہ ڈاکٹر۔۔۔۔۔ اور یہ جو اس پر چادر ڈالتی ہے۔۔۔۔ اور وہ جو اس کے انتم سنسکار کے بعد چادر پر دھر کر کمرے سے باہر لے جائے گا اور وہ بھی جو اس کی ارتھی کو شمشان گھاٹ لے جائے گا اور وہ ڈوم جو اس کی لاش کو اگنی دے گا۔۔۔۔۔ سب اس کے ہی دودھ کی دھاروں پر پل کر اتنے اتنے بڑے ہوئے ہیں وہ سب کیوں اس کو اکیلا اور تنہا مرنے کو چھوڑ گئے۔ پر ہے یوں کہ جو کوئی بھی جسودھا ہوتی ہے وہ جو سارے سنسار کو اپنے دودھ کی دھاروں پر پالتی ہے، اس کو تو اکیلے ہی مرنا ہوتا ہے، پھر بھی کوئی تو ہوتا ہے، کوئی دوست، مہربان، کوئی اپنا۔۔۔۔۔ ایسا اپنا جس کی گود میں سر رکھ کر کوئی اپنے پران چھوڑ دے۔ پر کون؟ کون؟ وہ کون ہوسکتا تھا۔

جسودھا نے رات گیارہ بجے اپنے پران چھوڑ دیئے۔

ٹیلیفون پر ہلدر بابو کی کوٹھی پر اطلاع دی گئی۔ مگر انہوں نے اس رات اپنا فون ڈسکنکٹ کیا ہوا تھا۔ گھنٹی نہیں بجی۔ ہسپتال کے قواعد کے مطابق ایک لاش کو مردہ خانے میں جتنی مدت تک رکھا جانا چاہیے۔ اس مدت کے بعد جسودھا دیوی کی میت کو ایک ہندو مہیلا ہونے کی حیثیت سے ٹھیلے پر رکھ شمشان گھاٹ پہنچا دیا گیا اور وہ ٹھیک وقت پر آگ لگا کر جلا بھی دیا گیا۔ ڈوم نے لاش کو آگ لگائی اور اس طرح جسودھا نے جو کچھ سوچا تھا اپنے کریا کرم کے بارے میں وہ لفظ بلفظ پورا ہوا۔ بات یہ ہے وہ تو ایک دیوتا سمان تھی اور اس سنسار کا یہی دستور ہے کہ جو کوئی بھی دیوتاؤں جیسی ذمہ داری کا اہل ہوتا ہے اور ایسی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے لوگ اسے اپنی غرض سے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں اور کام نکل جانے پر اس سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ اسے اکیلے چھوڑ دیتے ہیں۔ دیوتا کا یہی مقدر ہے۔

☆ ☆ ☆

MashalBooks.org

مراٹھی افسانہ

گڑیاں

سونیتی اپھالے

آخر کوشکن کی ان تھک محنت اور صبر اور برداشت کا صلہ مل ہی گیا۔ وہ صبح سے اپنی بنائی ہوئی نرتکی گڑیا کو ایک خاص بھاؤ میں کھڑا کرنے کے لیے ان تھک کوشش اور محنت کرتی رہی تھی۔ اب جا کر اس نے اطمینان کی سانس لی۔ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر وال کلاک پر نظر ڈالی، اس وقت گیارہ بجے تھے۔ آج وہ صبح سویرے پو پھٹنے سے پہلے جاگ اٹھی تھی تاکہ اپنی ڈیڑھ لٹ کی ناچتی گڑیا کو ایک ٹانگ کے تلوے پر کھڑا کرنے کی کوئی تدبیر اور ترکیب نکال سکے۔ اب جا کر اس کی کوشش سپھل ہوئی اور یہ ناقابل یقین بات تھی کہ اس کو ابھی تک یہ وشواس نہ ہو پا رہا تھا کہ بھرت ناٹیم ناچتی ہوئی پتلی کو ایسے انگ بھاؤ میں کہ کمر اس کی ایک طرف کو جھک کر دوہری ہو رہی ہو، سٹینڈ پر ٹکا سکنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ وہ منہ اندھیرے اٹھ کر اس وقت تک لگاتار کوشش کرتی رہی تھی۔ کتنا سمے لگ گیا تھا۔ بات یہ ہے کہ اس انگ بھاؤ کے ساتھ ناچتی نرتکی کو اس کے ٹیکن پر متوازن طور پر ٹکانا آسان بات نہ تھی۔

اتنی مشقت کے بعد اب اس کے حواس ٹھکانے آئے تھے اور گہرے اطمینان اور شانتی کی ایک لہر سی اس کے اندر دوڑ گئی تھی۔ ارے وہ کتنی بری طرح تھک گئی ہے، اب جا کر اس کو احساس ہوا تھا کہ اسے کتنی سخت بھوک لگی ہے۔

یہ تو روز کی بات تھی کہ وہ جب بھی کوئی گڑیا تیار کرنا شروع کرتی تھی تو اس کی یہی حالت ہو جاتی تھی۔ اس پر محویت کا عجب عالم طاری ہو جاتا، وہ بالکل ہی گم ہو کر رہ جاتی۔ کھوئی جاتی تھی، اپنے گرد و پیش سے بے گانہ ہو کر ساری توجہ اسی کام پر مرکوز کر دیتی۔ آج بھی یوں ہی ہوا تھا کہ اس کو بھوک پیاس اور آس پاس کی سدھ بدھ نہیں رہی تھی اور اب دھیرے دھیرے ایک کے

بعد ایک چیز اس کے دھیان میں آ رہی تھی۔مثلا ارے ارے تازہ دودھ ابھی تک دروازے پر کھلا اور کچا پڑا ہے۔اوہو یہ وقت ہو گیا ہے اور بڈھی پونم ابھی تک کام کرنے نہیں آئی۔۔۔۔۔ہاں یاد آیا۔۔۔۔۔آج تو اتوار ہے۔آج تو پونم چھٹی کرے گی اسے کس بری طرح ایک پیالی چائے کی طلب ہو رہی تھی۔پر اب وہ پھر گڑیا کی طرف متوجہ ہو گئی۔اس کے سٹینڈ کے گرد ساٹن لپیٹنے لگی۔ساتھ ہی بڑبڑانے لگی۔"ارے وہ جو کشوری بھائی ہے نا وہ تو سویرے سویرے ہی آ دھمکے گا اور میں اب ان مہیلا کو کس طرح بنا سنوار کر تیار کر پاؤں گی،اس سمے تک"۔

بمبئی کے مشہور ڈولز لینڈ (گڑیا نگر) کے مالک کشوری بھائی کو یہ گڑیا اپنے ایک امریکن گاہک کے لئے چاہیے تھی۔آج وہ خود بمبئی سے سورت پہنچ رہے تھے،اس گڑیا کو لینے کے لئے۔تاکہ وہ یہ گڑیا گاہک تک خود پہنچا سکیں۔شکن سوچ رہی تھی اگر آج ہی یہ پوری طرح تیار ہو گئی تو کتنا اچھا ہو گا،ورنہ کل تو وہ کلاس میں لڑکیوں کے بیچ بیٹھ ہی نہیں سکے گی۔

پر اب اس وقت تو چائے کی طلب شدت سے ہو رہی تھی۔ایسا جی چاہ رہا تھا کہ کوئی ایک پیالی چائے بنا کر پلا دے،پر پونم کا کوئی پتہ نہ تھا۔

ایک دم ہی دروازہ کھلا اور پونم کے بجائے پڑوسن اندر آ گئی۔سویتا بین کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی،ڈھوکلا سے بھری ہوئی۔

"ارے تم سویرے سے اب تک اسی کام میں لگی ہوئی ہو"۔سویتا بین نے دودھ کے برتن اور پھر گڑیا پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔اچھا تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تم نے نہ تو اب تک چائے پی ہے اور نہ ہی ناشتہ کیا ہے۔میں تو تمہارے لئے یہ ڈھوکلا لائی تھی،آج پکائے تو خیال آیا کہ تم کو تو یہ بہت پسند ہیں۔

"ہاں ذرا ایک میرے منہ میں ڈال دو"۔شکن نے ہاتھ دھونے کے لئے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔اس کے ہاتھوں میں "اسٹک فاسٹ "چپ چپ کر رہا تھا۔"ارے کیا بتاؤں کتنی بھوک لگی ہوئی ہے"۔

سویتا نے ایک نظر گڑیا پر ڈالی۔تعریفی نظر سے دیکھنے کے باوجود وہ ناراضگی سے بولی تھی:

"بھوکی نہیں مرو گی تو اور کیا۔بھلا کوئی بات ہے ایک جو سویرے سے یہ وقت آ گیا

ہے۔اس میں لگے لگے۔ میں کہتی ہوں چھٹی والے دن تو دم لے لیا کرو۔ چین سے بیٹھ جایا کرو۔ کیوں اپنی جان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی رہتی ہو۔ ذرا دھیان نہیں اپنی صحت کا۔ لو بھلا سویرے سے یہ سمے ہونے آیا تو اب بھی بھوک نہ لگتی"۔

" کیا بتاؤں یہ ممکن ہی نہیں"۔ شکن نے ہاتھ دھوتے دھوتے وہیں سے چلا کر جواب میں کہا۔ ''ایک بار یہ گڑیاں بنانا شروع کرو تو پھر تو پوچھو ہی نہ۔۔۔۔۔ پیچھا نہیں چھوڑتیں۔۔۔۔۔ بھوتوں چڑیلوں کی طرح جان کو آ جائیں گی۔ جانو گلے سے پکڑ لیتی ہیں۔ سر پر سوار ہو جاتی ہیں۔ راتوں کی نیندیں اجاڑ دیتی ہیں، ایک پل چین سے بیٹھنے نہیں دیتیں۔ پھر اب میں نے سوچ لیا ہے کہ آئندہ اتنا بڑا آرڈر لوں گی ہی نہیں۔ بس یہ آخری گڑیا ہے اس کے بعد۔۔۔۔۔ چھٹی۔۔۔۔۔"

"یہ بات تو تم ہمیشہ ہی کہتی ہو، پر جیسے ہی کوئی آرڈر ملتا ہے تو لپک کر لیتی ہو"۔

"نہیں واقعی اس بار ایسا نہیں ہوگا یہ بس آخری ہے۔ بات یہ ہے کہ اب میرے اندر دم نہیں رہا۔ پتہ ہے میں نے اپنی کلاس میں لڑکیوں کی تعداد بھی گھٹا دی ہے۔ کہاں چالیس پچاس ساٹھ تک پہنچتی تھیں اب صرف پانچ چھ رہ گئی ہیں۔ یہ جو فلو کا حملہ ہوا تھا، مجھ پر اس نے تو مجھے توڑ کر رکھ دیا ہے، میرے ہاتھوں اور ٹانگوں کے پٹھے ایسی بری طرح کھنچتے ہیں کہ کیا بتاؤں، کچھ کرنے کو جی نہیں کرتا، بس جی چاہتا ہے چپ چاپ پڑی رہوں"۔

شکن بولتے بولتے ایک دم چپ ہوگئی۔ بھئی یہ رام کہانی سویتا سے کہنے کی ضرورت کیا ہے؟ ان دنوں یہی تو ہو گیا ہے ہر ایک سے اپنی بیماری اور روگ کی شکایت کرنے بیٹھ جاتی ہوں۔ حد تو یہ کہ کل لڑکیوں کے آگے بیٹھ گئی اپنے روگ کا دکھڑا سنانے۔ کوئی بات بھی ہوئی؟ ہاں تو اور سارا جیون ہی اس نے اپنے ہی بل بوتے پر بڑی بہادری اور ہمت سے گزار دیا تھا تو اب ایسی کیا ضرورت آ پڑی دوسروں کا آسرا ڈھونڈنے کی۔ اپنی تنہائی اور بے بسی کا ذکر کرنے کی۔ سو اس نے اپنی زبان روک لی۔

"ڈھوکلے خوب پھولے پھولے تھے۔ اس میں تم نے سوڈا ڈالا تھا یا بیکنگ پاؤڈر ملایا تھا۔ سویتا بین؟"

پر سویتا نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی تھی وہ تو گڑیا کے گرد پھیرے ڈال ڈال کر گھور

گھور کر اس کے معائنے میں مصروف تھی۔ دیکھتے دیکھتے اس نے اس کے کمال اور فن کی تعریف کے طور پر اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ اسی دوران پونم کام کرنے آ چکی تھی، وہ بھی آتے ہی سیدھی گڑیا کی طرف چلی گئی اور گھوم گھوم کر اس کو دیکھنے لگی۔ پونم کو دیکھ کر شکن کھل اٹھی اور اس کو تین پیالی چائے بنانے کو کہا۔ ساتھ ہی دوپہر کے کھانے کا مینو بھی بتا دیا کہ دال بھات میٹھیا بنا لے۔ پونم کہنے لگی: "میں ڈاکٹر کی طرف سے آ رہی ہوں اور آپ کے لئے ان کا سندیسہ بھی لائی ہوں۔ آج انجکشن لگنے کی نروپا بین کی باری ہے۔ آپ کو ہسپتال میں بلایا ہے"۔

سندیسہ سن کر شکن مسکرا دی۔ "نروپا ماں اب چالیس کے پیٹے میں آ گئی ہیں، پر اب تک انجکشن کے نام سے جان نکلتی ہے۔ ایسا گھبراتی اور ڈرتی ہیں کہ میرے بنا انجکشن لگوا ہی نہیں سکتیں بھلا کب لگوا سکتی ہیں، توبہ کرو۔ کبھی بھی نہیں"۔

"اچھا تو تم ہر دوسرے دن ان بارشوں میں بھیگتی ہوئی ٹی۔ بی ہسپتال پہنچتی ہو"۔ سویتا بین برہمی سے اس کی طرف گھوم کر پھنکاریں۔

"اچھا میں نہ جاؤں تو سویتا بین یہ بتائیں کہ اور کون جائے نروپا ماں کا میرے علاوہ اور ہے کون؟"

ان کی باتوں پر پونم کے کان کھڑے ہوئے۔ رسوئی میں کھڑے کھڑے وہیں سے اس نے آواز لگائی: "اور ہاں وہ ڈاکٹر نے دوائی کے پیسے مانگے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ تمہاری بہن نروپا ماں کی کیا لگتی ہے؟"

"ڈاکٹر کو کیا پڑی ہے یہ سوال کرنے کی۔ یہ اس کی اپنی ٹوہ لینے کی اچھا ہو گی۔ ارے بھئی کیسا رشتہ کیسا ناتا۔ پر ایک دوسرے کا دکھ درد تو بٹانا ہی پڑتا ہے۔ ہاں تو اور کیا؟"

"پر وہ جو ہے نا اس کا پتی رامنیک وہ کس روگ کی دوا ہے۔ ہے کسی جوگا وہ بھی۔۔۔۔۔ ہونہہ"۔ سویتا بین نے سوال کیا اور ناک چڑھالی۔

"ارے میری پیاری سویتا بین وہ غریب تو اپنی لنگڑی بیٹی کو سنبھالتا ہے"۔ شکن نے رامنیک کی صفائی پیش کرنے کی خاطر عذر تراشا۔ "اس کی خاطر تو اس کو آئے دن مہالکشمی جانا پڑتا ہے"۔

"اور پھر ظاہر ہے کہ وہ اپنی چھوٹی لونڈیا کو تمہارے سر پر چھوڑ جاتا ہو گا۔۔۔۔۔"

MashalBooks.org

میں کہتی ہوں شکن کیوں اپنی جان کھپاتی ہو۔ دوسروں کے کارن کیوں اتنا بھوگ بھرتی ہو۔۔۔۔ اپنی جان کا ہوش نہیں تمہیں"۔ سویتا بین نے پھر ناک چڑھالی۔۔۔۔ دراصل ان کو یہ بات بھولتی نہیں تھی کہ رامنیک کی چھوٹی لڑکی نے ایک باران کے چھوٹے بیٹے کو سیڑھیوں پر سے دھکا دے دیا تھا اوراس کے سر میں کافی چوٹ آ گئی تھی، وہ اس کے نام پر ہی بھنا جاتی تھیں اور ناک بھنوؤں چڑھا لیتی تھیں۔

بڈھی پونم نے چائے لاتے ہوئے سویتا کی ہاں میں ہاں ملائی۔"ارے کرنے سے کرنا کرتی ہیں یہ۔ اتنا تو اپنے کنبے ناتے دار بھی نہیں کرتے، کسی کے لئے۔ میں آپ کو بتاؤں سویتا بین یہ ہماری بہن کا ہی کیا دھرا ہے جو آج یہ لوگ ہمارے سروں پر ناچنے لگے ہیں۔۔۔۔ ارے یہ بات تو سب ہی لوگ کہہ رہے ہیں"۔

شکن اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور ادھر سے ادھر چلنے پھرنے لگی۔ دراصل وہ بڑھیا کو اس موضوع پر بات کرنے سے روکنا چاہ رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی کہ اب وہ ہر ایک کو بتانے بیٹھ جائے کہ وہ کس کے ساتھ کیا کرتی ہے۔

"بات سنو ! مجھے اپنی استری دے سکتی ہو؟ "سویتا نے پوچھا۔۔۔۔"ہماری استری تو سدا خراب ہی رہتی ہے"۔

شکن الماری پر سے استری اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے یہ سوچ رہی تھی تو کیا یہ ڈھوکلے اسی لئے لائے گئے تھے، استری مانگنے کے لئے۔۔۔۔ خیر اس سوچ کے باوجود اس نے اپنی طرار پڑوسن کو اپنے ساتھ چائے پینے کے لئے بٹھاتے ہوئے ذرا اونچی آواز میں کہا۔"ہاں ! کیوں نہیں ضرور لے جاؤ۔ میں تو ان دنوں استری استعمال ہی نہیں کر رہی ہوں۔ چاہو تو اپنے پاس ہی رکھ لینا۔ کپڑے استری کرنے کے لئے"۔ یہ کہتے کہتے وہ بڑھیا ملازمہ کی طرف مڑ کر کہنے لگی:

"ارے ہاں چاول اور ٹماٹر کا سوپ ضرور بنا لینا۔ نیروپا ماں کے لئے۔ میں اپنے ساتھ اسپتال لے جاؤں گی"۔

"ارے اتنی دیر لگا دی۔ سسٹر دو پھیرے لگا چکی ہے انجکشن لگانے کے لئے"۔ نیروپا

ماں نے شمکن کی صورت دیکھتے ہی چلا کر خفگی سے کہا۔ "میں نے اس کو مشکل سے تمہاری خاطر انتظار کرنے کو کہا ہے"۔

"لو بھلا دیکھو"۔ شمکن اندر ہی اندر غصے سے کھولی۔ "جیسے مجھے اس کے سوا اپنا تو کوئی کام ہی نہیں۔ جیسے میرے پاس بڑا فالتو وقت ہے۔ اتنی تیز بارش میں تو گھر سے نکلی ہوں، بھیگ کر چوڑا ہوگئی ہوں، پر اس کو تو جیسے دکھائی نہیں دیتا کچھ۔ بڑی ناشکری ہے کمینی کہیں کی۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ اتنی کھکیڑ اٹھا کر روز روز اس کو دیکھنے آؤں"۔ ذرا چیخ کر بولی۔

"تو تم میری راہ دیکھتی ہی کیوں ہو؟"

"تو پھر کس کی راہ دیکھوں گی"۔ نروپا نے ڈھٹائی سے پوچھا۔ ذرا بھی جھینپ یا شرم نہ تھی، اس کے لہجے میں۔

اس کی اس بات نے شمکن کو ایک دم ہی چت کر دیا۔ سچ وہ جو رامنیک ہے نا بڑا ابنا پھرتا ہے اس کا پتی دیو۔ نہ ہی وہ اور نہ اس کے پہلے خاوند کا بیٹا راسک کبھی اس کو پوچھنے آئے۔ جانے وہ بیٹا کہاں خوار پھرتا ہوگا۔ اس نے کبھی مڑ کر اس کو نہ پوچھا۔ تو اب وہ میرے سوا اور کس کا انتظار کرے گی اور میں فضول ہی اس کی بات کا برا مان رہی ہوں۔ ایک بات یہ بھی تو ہے کہ بیمار آدمی ویسے بھی چڑ چڑا ہو جاتا ہے اور ذرا ذرا سی بات پر جھنجھلانے لگتا ہے۔

شمکن نے خاموشی سے تھرماس اور فلاسک اسٹول پر رکھ دیا۔ اپنی ساری کو جھٹک کر ٹھیک کیا اور اس کے کناروں کو نچوڑتے ہوئے بولی: "دیکھو میں تمہارے لئے سوپ لائی ہوں گرم گرم۔ پی کر دیکھو بڑا مزے دار ہے، میں نے تمہاری پسند کا سوچ کر اس میں ہلدی اور زیرہ بھی ڈالا ہے۔۔۔۔ اچھا میں جا کر سسٹر کو بلا لاؤں"۔ ساری بھیگ کر شمکن کے بدن سے چپکی ہوئی تھی اور اس کو ایک وارڈ سے دوسرے وارڈ میں جا کر سسٹر کو تلاش کرنے اور چلنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔

نروپا ماں کو انجکشن لگنے لگا۔ اس کے کالے ہونٹ لرز رہے تھے اور وہ ایسی گہری گہری سانسیں لے رہی تھی کہ گلے کی وریدیں اور رگیں پھول کر کھڑی ہوگئی تھی۔ اس نے شمکن کا ہاتھ کس کر پکڑا ہوا تھا۔ اس کو سہارا دے کر بٹھاتے ہوئے ایک بار پھر اس نے سوچا کہ اس بے چاری کا تو کوئی حال ہی نہیں رہا اسے میرے سہارے کی سخت ضرورت ہے۔

MashalBooks.org

سسٹر انجکشن لگا کر جا چکی تھی، نرو پا ماں بڑی دیر آنکھیں موندے بے سدھ پڑی رہی لگتا تھا جیسے سو گئی ہو۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور بولی۔ "پرسوں پھر آ جانا اور دیکھو دیر نہ لگانا۔ ہاں اب مجھے تمہاری راہ نہ تکنا پڑے۔ سمجھ گئیں نرو پا ماں نے یہ بات نہ تو کسی ایمرجنسی کے احساس کے سبب کہی تھی نہ ہی ان کے لہجہ میں کسی قسم کی بے چارگی یا بے بسی کا شائبہ تھا۔ بلکہ ایک تحکم تھا۔

ہمیشہ کی طرح شکن اس کے اس لہجہ پر جل گئی اور برا مان کر سوچنے لگی: "پتہ نہیں میں کیوں اس بے لحاظ عورت کو دیکھنے آ جاتی ہوں۔ اس کے ساتھ کچھ بھی کر دو کبھی بھی شکر گزار نہیں ہوتی۔ سمجھتی ہے کہ یہ اس کا حق ہے۔ غلطی تو میری اپنی ہے کہ شروع ہی سے اس کو منہ لگایا اور سر چڑھایا، پتہ نہیں کیوں۔ اس کی عادت تو میں نے ہی بگاڑی ہے"۔

جلی بھنی وہ سوچتی رہی۔

یہ سلسلہ تو جب ہی سے چل رہا ہے جب نرو پا کی پہلی شادی کے بعد راس اس کے پیٹ میں تھا اور اس کو انجکشن لگ رہے تھے، جب بھی وہ انجکشن لگوانے جاتی تو اس کی ڈھارس بندھانے کے خیال سے وہ بھی اس کے ساتھ ڈسپنسری چلی جاتی تھی۔ بس وہی سلسلہ اب تک چل رہا ہے۔ میری تو جیسے ڈیوٹی ہی لگ گئی ہے۔

"یہ وہی بندے ہیں یا نئے لئے ہیں؟ "اچانک نرو پا ماں لاتعلقی سے بولی۔

"نہیں تو وہی پرانے والے ہیں۔ میں نے بہت دن سے پہنے نہیں تھے۔ اب وہ جو میں عام طور پر پہنے رہتی ہوں، ان میں سے ایک کا موتی جھڑ گیا ہے۔ اب دوسرا لگواؤں گی۔ یہ کانوں میں ڈال لئے۔ یہ تو بہت پرانے پہلے کے رکھے ہوئے ہیں"۔

"یہ کہتے کہتے وہ سوچ رہی تھی۔

"ارے میں بے کار ہی یہ سب کہہ رہی ہوں۔ بھلا نرو پا ماں کب وشواس کرے گی۔ کسی بات پر وہ تو بس شک وشبہہ ہی میں پڑی رہے گی۔ کھوج ہی میں رہتی ہے کسی نہ کسی بات کی۔

"بہت پرانے ہیں۔ کئی سال پرانے تو کتنے برس پرانے ہیں"۔ نرو پا ماں نے پھر سوال کیا۔

"یہی کوئی پانچ سال پرانے ہیں"۔

شکن سچ سچ بہت ہی جز بز ہو رہی تھی۔ یہ تو نروپاماں کی عادت ہے کہ میرے پاس جو پرانی چیز دیکھے گی۔ یہی سوچے گی کہ یہ بھی کانتی لال کی دین ہے۔ میری ہر پرانی چیز کا ناتا کانتی لال سے ہی جوڑنے کے لئے ذرا ذرا سی چیز کے بارے میں تفتیش شروع کر دیتی ہے۔ جیسے اس سے بیاہ کرنے سے پہلے کانتی لال نے مجھے سینکڑوں ساریاں اور کئی سیٹ گہنے پاتوں کے دیئے ہوں۔ بس یہی شک اس کے دل میں سمایا ہوا ہے۔

اور بات ساری اتنی تھی کہ کالج کے زمانے میں جب شکن کانتی لال کی محبت میں مبتلا ہوئی تو وہ کبھی کبھار اس کو چھوٹے موٹے تحفے دے دیا کرتا تھا جو بہت ہی معمولی اور سستے قسم کے ہوا کرتے تھے۔ بات یہ ہے کہ ابھی تو وہ پڑھ رہا تھا۔ کوئی کام وام تو کرتا نہیں تھا، تو بڑھیا کے لئے قیمتی تحفے کہاں سے لاتا۔ وہ تو کبھی اپنے پتا کی دکان پر جا کر بیٹھتا نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے پتا اس سے ناراض ہی رہتے تھے۔ اس لئے کانتی لال کا ہاتھ بہت تنگ رہتا تھا۔ اپنے پتا کے دیہانت کے بعد کانتی لال نے پڑھائی چھوڑ دی اور دکان پر بیٹھنے لگا۔ پر دکان داری کا تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے دکان کا بھی بھٹہ بیٹھ گیا۔ اس کے برعکس شکن نے گریجوئشن کرنے سے پہلے ہی گڑیاں بنا کر بیچنا شروع کر دی تھیں، وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ گڑیا سازی کی کلاس میں زیادہ وقت لگانے لگی تھی اور اس کی گڑیاں بکنے لگی تھیں اور اب وہ کانتی لال سے زیادہ کمانے لگی تھی۔

جب اس کو محسوس ہوا کہ نروپاماں اس کے کانوں کے بندوں کو گھورے چلی جا رہی ہے تو وہ غصے سے کھول اٹھی اور بھڑک کر بولی۔ "یہ تم کیا بٹر بٹر گھورے چلی جا رہی ہو۔ یہ چوری کے نہیں میری اپنی کمائی سے خریدے ہوئے بندے ہیں"۔

شکن بھی نیرو کو نیچا دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔۔۔۔ بات یہ تھی کہ وہ نیرو سے کم ذات اور گوت سے تعلق رکھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کانتی کی ماں نے شکن کو اپنی بہو بنا کر لانے کی حد بھر مخالفت کی تھی، اس نے بڑی سختی سے کانتی لال کو اس خیال سے باز رکھا تھا اور اس کے بجائے نروپاماں کو ترجیح دی تھی۔

تو یوں نروپاماں کانتی لال کی بیوی بن کر ان کے گھر پہنچی تھی۔ اگرچہ شکن کو بہت برا لگا تھا، پر کانتی لال کے سنگ اس کی نئی نویلی دلہن کو دیکھنے اس کے گھر جانا پڑا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں دونوں کے درمیان بے تکلفی اتنی بڑھی کہ نروپا اس کو شکن اور وہ اس کو نیرو کہہ کر بلانے لگی تھیں۔ پر

یہ بات اس لئے کھٹکتی تھی کہ شکن کو نروپا ماں کا انداز بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ اس کا نام کچھ ایسے انداز میں لیتی تھی کہ وہ جل بھن کر رہ جاتی۔ یہ سمجھتی کیا ہے۔ جیسے اس کی باندی ہوں اور یہ کوئی مہارانی ہیں۔

پھر کانتی مر گیا اور اس کے بعد اس کے گھر کے مالی حالات اور معاملات کو شکن کو یہ سلجھانا پڑا۔ وہ ان کو سہارا دیتی رہی تھی اور مالی امداد کرتی رہتی تھی۔ پر وہ گاہے گاہے یہ بات نیرو کو بتا دیا کرتی تھی۔

کچھ دیر بعد نیروپا ماں نے پھر چھیڑا۔

"راسک تم سے ملنے کب آیا تھا؟"

اس کے سوال پر چونک کر شکن جو اپنے خیالوں میں گم تھی، پھر بے چین ہو گئی تھی۔

کانتی اور نروپا کا بیٹا اب کالج میں پڑھ رہا تھا تو اب نیروپا ماں یہ سوچنے لگی ہے کہ وہ مجھ سے ملنے آتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہ مجھ سے یہ سوال بھی کرنے لگی ہے کہ کیا وہ مجھ سے ملتا رہتا ہے؟

یہ بات اس سے پوچھنا تھی کہ بھئی وہ تمہارا بیٹا ہے کہ میرا؟ شکن نے جواب دیا:" ہاں ہے تو میرا ہی بیٹا بے شک پر اس نے تو ایک بار بھی مجھے صورت نہیں دکھائی۔ جبکہ اس کو پتہ ہے ماں ایک مہینے سے اسپتال میں پڑی ہے۔ خیر وہ تم سے ملنے تو آتا رہتا ہے نا۔ کیوں کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔ ہاں مجھے پکا وشواس ہے کہ وہ تمہارے پاس آتا رہتا ہے"۔ نیرو نے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ آتا تو ہے۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔ تم ننھی سی بچی تو نہیں۔ تمہیں نہیں معلوم کہ وہ کالج میں پڑھ رہا ہے۔ اس کو پیسے چاہیے ہوتے ہیں۔ کالج کی فیس کتابوں اور کاپیوں کے لئے۔ اب اس کو ٹیوشن لگانے کی ضرورت ہے۔ اس کا یہ آخری سال ہے ٹیوشن لینا ضروری ہے کہ میڈیکل کالج میں داخلہ مل سکے، یہ سب خرچے کہاں سے آئیں گے اور نیرو آج میں تم کو بتا رہی ہوں کہ وہ جو تمہاری دکان بیچ کر ہم نے بینک میں جوائنٹ اکاؤنٹ میں پیسہ رکھا تھا وہ کب کا ختم ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ مکان والی رقم بھی کب کی ختم ہو چکی ہے۔ اب میرے گھر پیسوں کا پیڑ تو لگا نہیں ہے۔ یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو؟"

شکن کی اس بات پر نروپا بڑے تیکھے پن سے مسکرا کر بولی:" بھئی تم اس پھیر میں

کیوں پڑتی ہو کہ کس کا پیسہ کہاں خرچ ہوا۔ کہاں سے آیا۔ کہاں سے نہیں، تمہیں یہ چنتا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم تو بس یہ جان لو کہ اس کا یہ سال میرے لئے کتنا اہم ہے۔ تم تو بس جس طرح بنے اس کا ہر خرچہ پورا کرتی رہو۔ یہ اس کے پورے جیون کا معاملہ ہے"۔

اس دھونس دھکے اور تحکمانہ انداز پر شکن کا خون کھول گیا اور وہ چلا کر بولی۔ "ارے تو کیا تمہارے پورے جیون کا ٹھیکہ میں نے ہی لے رکھا ہے، اور کوئی نہیں تمہیں پوچھنے والا؟"

"ارے تو اتنا بگڑتی کیوں ہو۔ آج کل تم ذرا ذرا سی بات پر ہتھے سے اکھڑ جاتی ہو۔ اچھا تم بتاؤ کہ تم نہیں کروگی تو کون کرے گا؟ ہے کوئی پوچھنے والا؟ ہمارا آگا تاگا لینے والا؟ جب سے میں نے دوسرا بیاہ کیا ہے رام نیک سے۔ اس وقت سے راسیک نے یہ لچھن اختیار کیے ہیں جیسے وہ پہلے ہی سے ٹھانے بیٹھا تھا۔ اپنے جی میں، ہاں اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ دوبارہ شادی کرنے سے میرا تو بیٹا ہی میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس وقت تم کو چاہیے تھا کہ اک ذرا سا اشارہ ہی کر دیتیں تو میں شادی ہی نہ کرتی"۔ نروپا ماں بولے ہی چلی جا رہی تھی۔

ارے میں کر دیتی اشارہ۔ بھئی یہ بھی اچھی رہی۔ ارے بھئی اپنی پہلی اور پھر دوسری شادی کے فائدے اور نقصان تم کو پتہ ہونا چاہیے تھے کہ دوسرے بتاتے؟ کیا تمہیں کوئی تجربہ نہ تھا۔ جب کانتی زندہ تھا۔ چلو آخر میں وہ بستر ہی سے لگ کر رہ گیا تھا تو اس وقت بھی راسیک اتنا چھوٹا بچہ تو نہ تھا۔ نو برس کا تھا۔ اس کا باپ اس پر جان چھڑکتا تھا، وہ اپنے باپ کو بھول تو نہیں سکتا تھا نا۔۔۔۔۔ اب اس کا من رام نیک کو اپنا پتا ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ یہ تو بڑی کٹھن سی بات ہے، اس کے جس پر کیا گزرتی ہوگی"۔

" کیوں کٹھن کاہے کو ہونے لگی۔ وہ میرے بیاہ کے وقت بچہ تو نہ تھا، پورے پندرہ برس کا تھا۔۔۔۔۔ پر نہیں اس کو تو ہمدردی یا سمجھوتے کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ ہاں میں کہہ رہی ہوں نا تم سے۔ رام نیک سے وہ بدتمیزی اور رکھائی سے بات کرتا ہے ہمیشہ اور اس کی لنگڑی بیٹی کو مارتا ہے کبھی چٹکیاں لیتا ہے اور طرح طرح سے ستاتا ہے۔۔۔۔۔ کیوں؟ کیوں وہ ایسا کرتا ہے۔ آخر وہ اتنا کپٹی اور بد طبعیت کیوں ہے؟"

"ہو سکتا ہے کہ وہ ایسا کر کے تم سے بدلہ لے رہا ہو کہ تم نے اس کے لنگڑے معذور باپ کو بھلا دیا اور نئی شادی رچا کر بیٹھ گئی ہو۔ خیر یہ تو صرف میرا اپنا اندازہ ہے۔ بھئی وہ آپ ہی

MashalBooks.org

اپنے من اور سوچ کی بات کو بہتر طور پر سمجھتا ہو گا۔ یہ میں تم تو نہیں جان سکتیں"۔

اس کی اس بات پر نروپا ماں اس کی طرف سے پیٹھ موڑ کر بیٹھ گئی اور بڑبڑانے لگی۔

"میں تو ابھی چکرا کر رہ گئی ہوں۔ میرا دماغ کام نہیں کرتا"۔

شکن اس کو من ہی من میں کوستی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے قریبی سنک پر جا کر نروپا کا گلاس دھویا، فلاسک اچھی طرح دھو کر صاف کیا۔ ہسپتال سے نکلی تو یہی سوچ رہی تھی، کیسی ڈھیٹ اور کٹھور ہے یہ عورت۔ پتہ نہیں میں ہر بار آ کیوں جاتی ہوں اس کو دیکھنے اور اس کا حال پوچھنے۔ کاہے کو میں اس پر اپنی گاڑھی کمائی خرچ کرتی چلی جاتی ہوں۔ کچھ اپنے بڑھاپے کا بھی تو خیال کرنا چاہیے کہ اپنے ہاتھ پیر تھک گئے تو اپنا کیا بنے گا۔ ہے کتنی خر دماغ اور مغرور۔۔۔۔۔ اب کیا وہ اتنی بے وقوف اور بے شرم ہے کہ اس سب کے باوجود وہ اس کے پاس آتی رہے گی۔ توبہ کرو۔۔۔۔۔ اب تو میں یہاں قدم بھی نہ رکھوں گی۔ پڑی رویا کرے۔ اس سے میرا کون سا ناتا ہے جو میں اس کی پرواہ کروں۔ بس اسٹاپ کی طرف جاتے ہوئے شکن بہت ہی دل برداشتہ اور رنجیدہ ہو رہی تھی۔ وہ اپنے سورگیہ پتا کی وہ بات اب تک نہ بھول پائی تھی، وہ برابر یہی کہتے تھے: "دیکھو شکن کانتی تمہاری طرح گریجویٹ نہیں ہے۔ پھر دیکھو اس کا جی تو کاروبار میں بھی نہیں لگتا۔۔۔۔ تم خوبصورت ہو۔ پھر میری اکلوتی بیٹی ہو۔ تمہارے لئے ایک سے ایک اچھا بر مل سکتا ہے۔ اچھے لڑکوں کی کوئی کمی ہے۔ ایسے لفنگے لڑکے سے تمہارا کوئی جوڑ نہیں۔۔۔۔۔ پر اس وقت تو اس نے ان کی کسی بات پر کان نہ دھرا۔۔۔۔۔ بات یہ تھی کہ کانتی دیکھنے میں بڑا خوش شکل تھا۔ ایک تو دیکھنے والے کو اس کی مردانہ وجاہت اور غمزہ ہی موہ لیتا تھا۔ پھر اسکی ادائیں کہ ماتھے پر لہراتی لٹ ایک جھٹکے سے پیچھے کرتا تو اس کی یہی ایک ادا دل لوٹنے کو کم نہ تھی اور ایسے میں جب وہ کوئی بات شکن سے کہتا تو بھلا وہ اس کی بات ٹال سکتی تھی۔

اس کی ان ہی اداؤں پر تو شکن کی جان جاتی تھی۔ اتنی کہ جب وہ اپنی شادی کے بعد بھی اس سے ملتا رہا تو وہ اس کو منع نہ کر سکی، وہ جو کچھ کہتا وہ فوراً مان جاتی۔ اس کی بات ٹال جاتی، یہ ممکن نہ تھا۔ ایک بار جب اس نے چاہا تھا اس سے ملنا جلنا چھوڑ دے تو، تو وہ بڑا بگڑا اور چیخنے چلانے لگا۔ "ارے تو کیا ہے اگر ہمارا بیاہ نہیں ہو سکا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہماری شادی نہیں ہوئی تو پریم تو باقی ہے۔ وہ تو نہیں مر گیا۔ یہ تو میری ماتا جی اور دوسرے تنگ نظر کنبے والوں کا

MashalBooks.org

کیا دھرا ہے کہ ہمارا بیاہ نہ ہوسکا، پر میں تم کو اتنی آسانی سے کھو تو نہیں سکتا۔ سو میں تم سے ملنے آ ؤں گا اور آتا رہوں گا اور تم کو مجھ سے ضرور ملنا پڑے گا، تم مجھ کو ہرگز منع نہیں کر سکتیں۔ بس میں نے کہہ دیا ہے"۔

"پر یہ تمہاری بیوی کیا کہے گی"۔ اس کی اس بات پر اس کا یہی ردِعمل تھا کہ اس نے ماتھے پر آئی ہوئی لٹ کو اسی مخصوص ادا سے جھٹک کر پیچھے کیا۔ گویا کہہ رہا ہو کہ بس یہ سمجھ لو کہ یہ میرا حکم ہے۔

اور اب جا کر اس کو احساس ہوا کہ اس کی مردانہ ہٹ کے آگے جھک کر اس نے کتنی بڑی بھول کی تھی۔۔۔۔۔۔ کبھی کبھی وہ حیران ہوا کرتی کہ ایک طرف تو اتنی دبنگ اور جارحانہ ہے اس کی اور پھر بھی وہ اس کی سوچ سے کتنی مختلف بات کرتا ہے۔ اکثر وہ یوں بھی سوچتی کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ کانتی نے اپنی ماں کی آڑ لے کر اور اس کا ہوا بنا کر اسے اپنے سے دور رکھا ہوا ہے۔ جو بھی ہوا اچھا ہی ہوا ورنہ تو وہ نہ جانے کس کس طرح اس کو خراب کرتا اور کیسے کیسے اپنا مطلب نکالتا۔

پھر ایک بار کانتی ایک حادثے سے دوچار ہو گیا۔ ایک ٹرک اس پر چڑھ گیا اور اس کی ٹانگ کچلتا چلا گیا۔ یہ وہی دن تھے جب راسیک نروپاماں کے پیٹ میں تھا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ کانتی کی تیمارداری کے ساتھ ساتھ شکن پر نروپاماں اور اس کی ساس کی ذمہ داری بھی آ پڑی۔ کانتی کی وہی ماں تھی کہ اس کے آگے پیچھے پھرتی۔ "اے بہن۔۔۔۔۔اے بیٹا۔۔۔۔۔۔ میری بٹی کہہ کہہ کر چکنی چپڑی باتیں بناتی تو شکن سوچتی کہ یہی عورت تھی جو مجھے نیچ ذات کہتی تھی۔ اسے میری نیچ ذات پر کتنا اعتراض تھا۔

شکن پانی کی طرح اپنا پیسہ بہا رہی تھی اور جان توڑ کر محنت کر رہی تھی کہ کسی طرح کانتی کے پریوار کی ڈوبتی نیا کو پار لگا جائے۔ کانتی تو اپاہج لنگڑا ہو کر چارپائی سے لگ گیا تھا۔ اسی نے اس کی دکان بیچی۔ کانتی کے بجائے اب نروپاماں نے شکن کے پاس جانے میں پہل کی اور وہ اس کو بلا کر لائی۔ پہلے شکن کانتی کی خاطر اس کے گھر جایا کرتی تھی اور اب نروپاماں کی وجہ سے آتی جاتی تھی۔

اب وہ اس کے ساتھ اس کے چیک اپ کے لئے ڈسپنسری بڑی پابندی سے جانے لگی۔ اس کے پیٹ میں بچہ تھا تو اس کی دیکھ بھال تو کرنا ہی تھی۔ اس کو لاد کر ڈسپنسری تک لے جانا

اور گھر واپس لانا بھی تو اس کی ہی ڈیوٹی تھی اور ان دنوں وہ نیرو کے کتنے نزدیک آ گئی تھی۔ پر نیرو ذرا بھی نہ جھکی ویسی ہی اکڑی ہوئی رہتی، وہ بڑے دعوے اور گھمنڈ سے اس کو کوئی نہ کوئی کام بتاتی رہتی تھی۔

ان ہی سوچوں میں گم شکن بس اسٹینڈ پر پہنچ گئی۔ نروپا ماں کی باتوں پر جلی بھنی اب تک اسے اس پر غصہ آ رہا تھا۔

ذرا دیکھو تو ہے کتنی کٹھور مجال ہے جو سوپ کے مزے کے بارے میں ایک لفظ بھی منہ سے پھوٹا ہو کہ کیسا ہے، کیسا نہیں۔۔۔۔اچھا اگر کسی قابل نہیں تھا تو پھر ڈکوس کر کیوں بیٹھ گئی۔ بس سارے وقت راسیک ہی کی بات کرتی رہی، جیسے راسیک کے علاوہ جیون میں کچھ رہا ہی نہیں اور رہ بھی کیا گیا تھا۔ کانتی کے بعد دوسرا بیاہ رچا کر بیٹھ گئی پر سال نہ گزرا تھا کہ سننے میں آنے لگا کہ دونوں ایک دوسرے کی صورت سے بیزار ہیں۔ منہ نہیں دیکھنا چاہتے ایک دوسرے کا۔

اوپر سے رام نیک کے پہلے بیاہ سے دو لڑکیاں تھیں۔ ایک لنگڑی تھی اور دوسری حد سے زیادہ شرارتی۔ نیرو ان کی دیکھ بھال کرتی تو تھی پر اوپری دل سے ناک بھوؤں چڑھا کر۔ اسی وجہ سے بیاہ کے بعد تین سال گزرنے پر بھی نہ تو انہوں نے اس کو قبول کیا اور نہ وہ ان سے مانوس ہوئی تھی۔ شاید اسی کارن رام نیک اس سے چڑا ہوا رہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ نروپا کو اس ساری صورت حال کا دکھ ہوتا ہوگا۔ اوپر سے راسیک کا بھی اس کے ساتھ ایسا برتاؤ ہوتا گیا گویا وہ اس کا جانی دشمن ہو۔ وہ ہر وقت اس بات پر ضد اور بحث کرتا تھا کہ وہ اس کو ہوسٹل جانے دے۔ ارے مجھے اس کا نتیجہ بھی خوب معلوم تھا کہ یہ خرچہ بھی مجھے ہی بھرنا ہوگا۔ اس کے باوجود میں نے نیرو سے حجت اور بحث کی کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔

بارش اب تھم گئی تھی اور کونوں کھدروں میں کھڑا ہو جانے والا بارش کا پانی دھیرے دھیرے بہہ نکلا تھا۔ پانی سے بھرے گڑھوں کو لانگھتے پھلانگتے ہوئے شکن نے محسوس کیا کہ ہوا میں سردی اور ٹھنڈ بڑھ رہی تھی۔ ارے نروپا نے سویٹر پہنا ہوا تھا کہ نہیں۔ پتہ نہیں اس کے پاس سویٹر ہے بھی کہ نہیں اور وہ بڈھی پونم نے کہا بھی تھا کہ ڈاکٹر نے آپ کو بلایا ہے کوئی ضروری بات کرنا ہے۔ مجھ سے مل کر جائیں۔ جا کر پوچھ ہی لیتی کہ کیا بات کہنا ہے۔ اچھا کچھ نہیں تو اس کے تکیے تلے ہاتھ ڈال کر ٹٹول تو لیتی کہ ڈاکٹر نے پرچہ پر کوئی خاص ہدایت تو لکھ کر نہیں رکھ دی یا پھر کوئی

نئی دوا سنگائی ہو۔نروپاماں تو اپنے بارے میں کچھ کہتی ہے نہیں۔اس کے اندر تو بھگوان نے دکھ جھیلنے کی بڑی ہمت اور سہار دی ہوئی ہے۔یہ بات نہیں کہ جب کانتی زندہ تھا تو وہ بالکل ہی شکن کے سہارے جی رہا تھا اور یہ کہ نروپاماں کی دیکھ بھال بھی اس کی پتنی ہونے کے ناطے شکن کے سر آ پڑی تھی اور اب یہ اس کی ذمہ داری تھی۔نہیں یہ بات نہیں تھی۔بلکہ آخر تو نروپاماں بھی انسان ہی تھی اور انسان ہونے کے ناطے یہ اس کا حق بنتا تھا۔خاص کر اس لئے کہ وہ تو اسی کا آسرا تلاش کرتی تھی۔اس نے اس کو اپنا سہارا بنا لیا تھا اور تھا بھی کون اس کی خیر خبر لینے والا۔

اس کے سامنے جو بس آ کر رکی تھی وہ اس کے روٹ کی بس نہ تھی۔یہ تو رامنیک کے گھر کی طرف جاتی تھی۔اب ایک دم اس کی سوچ ادھر کو چل پڑی۔یہ رام نیک بھی بڑا پتھر دل اور کٹھور ہے۔کبھی اپنی پتنی کو دیکھنے نہیں جاتا۔اس کے بھانویں تو وہ مر چکی ہے،کبھی پلٹ کر بھی اس کی اور نہیں دیکھتا اور اپنی مری ہوئی پہلی پتنی کی لڑکیوں کے ناز نخرے اٹھاتا اور لاڈ پیار کرتا رہتا ہے۔پچھلی جمعرات کو کہہ رہا تھا کہ وہ مہالکشمی جا رہا ہے۔اچھا تو اگر وہاں گیا ہے تو چھوٹی لڑکی کو شکن کے پاس کا ہے نہیں چھوڑ کر گیا۔اچھا تو اس کا مطلب ہے کہ وہ گیا ہی نہیں اور اگر گیا ہے تو پھر لڑکی کو کس کے پاس چھوڑ گیا۔وہ جب پہلی بار نادیاد سے سورت آیا تھا تو وہ شکن کے علاوہ کسی اور کو جانتا ہی نہ تھا اور شکن کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ وہ اس کے ہی قصبے سے آیا ہے۔اب اس کو یہی تو حیرت تھی کہ اس کے علاوہ ایسا کون ہے جس کے پاس وہ اپنی چھوٹی بیٹی کو دیکھ بھال کے لئے چھوڑ سکتا ہے۔۔۔۔۔تو کیا۔۔۔۔۔یہاں اس نے ایسے دوست بنا لئے ہیں جن پر اس کو بھروسہ بھی ہے اور جو اس کی بیٹی کی دیکھ بھال پر آمادہ بھی ہو گئے،تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب اس کو شکن کی مدد کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔اچھا تو یہ بات ہے،اس خیال سے ہی وہ بوکھلا گئی اور مجھے اس بات کا شبہ بھی نہ ہوا۔مجھے پہلے ہی احساس ہو جانا چاہیے تھا۔اچھا رامنیک سے مل کر پتہ تو کرنا چاہیے۔

اس خیال کے آتے ہی اپنی چھتری اپنا پرس اور فلاسک سنبھال کر وہ دھکا پیل کر کے بس میں سوار ہو ہی گئی۔بس بھری ہوئی تھی اور ٹکنے کی بھی جگہ نہ تھی،وہ بس کا ڈنڈا پکڑ کر کھڑی کھڑی ہی روانہ ہو گئی۔

اف توبہ کتنی بھیڑ تھی۔پورے وقت کھڑے کھڑے اس کے گھٹنے درد کرنے لگے۔اب گھر پہنچتے پہنچتے تین چار گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بارش کے پانی میں

MashalBooks.org

بھیگے ہوئے یہ کپڑے میرے تن پر ہی سوکھیں گے۔اس نے سوچا۔اصل بات یہ تھی کہ اب اس کے اندراس سب کوسہارنے کا بوتا نہ رہا تھا۔ پر یہ تو پتہ کرنا ہی تھا کہ آخراس نے چھوٹی بچی کو چھوڑا کس کے پاس۔بس دھیمے دھیمے جھٹکوں کے ساتھ چلتی رہی اورشکن سوچ رہی تھی۔

یہ رام نیک نادیا دسے آیا تو رنڈوا تھا، دو بیٹیاں ساتھ لایا تھا۔ یہاں آکر سیدھا اس کے پاس ہی آیا تھا کہ میں تمہارے شہر سے آیا ہوں اور تمہارے پتا کا واقف ہوں۔خیر اس نے اس ناتے اس کی حد بھر مدد کی۔رہنے کو مکان کرائے پر ڈھونڈ کر دلوایا۔پھر اس کی دکان کا بندوبست کیا اور سارا کام جما دیا اور اس نے جنرل اسٹور چلانا شروع کر دیا۔اب یہ بھی اس کی ہی تجویز تھی کہ وہ اپنے اسٹور میں وہ تمام چیزیں بھی رکھے جو گڑیا سازی کی صنعت کے لئے درکار ہوتی ہیں۔اس نے سوچا تھا کہ یہ اس کے لئے فائدہ مند رہے گا۔اب رام نیک کا یہ تھا کہ لوگوں کو پھسلانے کا گر جانتا تھا۔ بڑا چرب زبان اور میٹھی میٹھی باتوں سے دوسرے کا من موہ لینا اسے خوب آتا تھا اور وہ تن من سے اس کی سہائتا کرنے میں جت گئی۔یہ تو اس پر بڑی دیر بعد کھلا تھا کہ یہ سارا لگاؤ اور چکنی چپڑی باتیں اس کی خاطر نہیں نروپا ماں کی خاطر تھیں۔سچ پوچھو تو کھلا ہی کب تھا وہ تو بس اندھا دھند اس کی سہائتا میں آنکھ بند کر کے لگی رہی تھی۔

رام نیک تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ شکن جیسی کنواری اور خوش شکل لڑکی جو ہر طرح سے خوشحال اور آسودہ زندگی گزار رہی ہے خود مردوں کی طرح اپنا کاروبار چلا رہی ہے اور اپنے پاؤں پر کھڑی دوسروں کو سہارا دے رہی ہے۔کبھی اس جیسے بے حیثیت اور بے آسرا شخص کو قبول بھی کر سکے گی؟ کیا وہ اس جیسے خانماں برباد کے ساتھ گزارا کر سکے گی؟ اس وقت بھی جب وہ اس کے ساتھ ہنسی مذاق اور بے تکلف بول چال رکھتا تھا، جب بھی یہی سوچتا کہ وہ شکن کے قابل نہیں۔اس کے ساتھ تو کوئی نروپا ماں جیسی بے آسرا اور مصیبت زدہ عورت ہی گزارا کر سکے گی۔اس کا مطلب تو یہ ہوا نا کہ شکن کے مستقبل اور حیثیت کا تحفظ اس کے حق میں گھاٹے کا سودا بن گیا تھا۔جبکہ نروپا ماں کا بے سہارا پن اور ہر طرف سے لوٹا ہوا ہونا ہی اس کے حق میں کام کر گیا۔

ہوا یہ تھا کہ نروپا ماں اس کے فلیٹ میں رہنے کے لئے مستقل طور پر آ گئی ہوئی تھی، وہ پیسہ جو کانتی لال کی دکان بیچ کر انہوں نے جوائنٹ اکاؤنٹ میں رکھا ہوا تھا اب دھیرے دھیرے ختم ہو رہا تھا۔نروپا ماں نے چاہا تھا کہ وہ اپنا مکان بیچ کر شکن کے ساتھ رہنے لگے۔لیکن کانتی کی

ماں راضی نہ ہوئی۔ پر ساس کے مرتے ہی نروپا ماں مکان بیچ کر شکن کے پاس رہنے آ گئی تھی۔ یہاں آ کر وہ دن رات بیکار بیٹھی ایک ہی رٹ لگائے رکھتی تھی کہ "بھئی کچھ ایسا کروں کہ میں اپنا خرچہ خود اٹھا سکوں، کوئی رستہ نکالو"۔ جیسے یہ بھی اس کی ہی ذمہ داری تھی کہ وہ اس کے لئے کوئی راہ نکالے اور اس کو اس کے اپنے پیروں پر کھڑا کر لے۔ اب اگر وہ اسی وقت یہ بات سختی سے جتا دیتی کہ یہ اس کے بس کی بات نہیں، نہ ہی اس کی ذمہ داری ہے تو اچھا ہوتا پر ہوا یہ کہ اس کی خاموشی کا فائدہ اٹھا کر نروپا ماں ساری جان سے اسی کے سر پڑ گئی اور اب تو وہ گاہے گاہے یہ کہہ کہہ کر اس کو ڈرانے لگی تھی کہ ارے یہ دس ہزار بھی چار دن کی چاندنی ہیں، یہ خرچ ہو گئے تو پھر اندھیری رات ہے۔ اب بھی کچھ کر لو۔ ایسا لگتا تھا کہ نروپا ماں صرف اور صرف اس کی ذمہ داری ہے۔ اس کی اپنی ذات سے بڑھ کر نروپا ماں کی دیکھ بھال اور ضرورتوں کا خیال رکھنا اس کے فرائض میں داخل ہے۔

اب سوال یہ تھا کہ وہ اس کے لئے کیا راستہ نکالتی اور کون سی راہ ڈھونڈھتی۔ اس نے میٹرک بھی پاس نہ کیا تھا کہ کوئی نوکری ہی تلاش کی جاتی اس کے لئے۔ جب وہ اس سے کہتی کہ اپنی پڑھائی پر ہی توجہ دے لو تا کہ کسی ملازمت جوگی تو ہو جاؤ، پر توبہ کرو۔ وہ کیا پڑھتی اس کا تو ذہن ہی اس طرف نہ آتا تھا۔ اچھا تو پھر یہ کرے کہ گڑیاں ہی بنائے۔ یہ کام ہی سیکھ لے۔ ان دنوں شکن کی کلاس میں سو سو لڑکیاں ہوا کرتی تھیں۔ اس کام کی بڑی مانگ تھی، وہ تین تین شفٹوں میں پڑھا رہی تھی اور شکن کے لئے تو مانو جیسے پکی فصل اٹھانے والا معاملہ تھا۔ اتنے آرڈر ملتے کہ دن رات لگ کر بھی پورے کرنا مشکل ہو جاتے۔ پر نروپا ماں کا جی اس کام پر بھی نہ لگا۔ نہ کوئی شوق تھا اسے نہ کوئی سلیقہ کہ کسی ہنر اور ذہانت سے کام لے کر اس کام ہی میں مہارت حاصل کر لیتی۔ ایسی بددلی اور بے توجہی سے کام کرتی کہ گڑیوں کا ستیاناس مار کر رکھ دیتی۔ ان کی تیاری میں استعمال ہونے والا میٹریل الگ برباد ہوا اور اس کی برباد کی ہوئی گڑیوں کو ٹھیک ٹھاک کرنا بھی شکن ہی کو پڑتا اور یوں اس کی مشقت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا۔ چلو یہ بھی نہ سہی راسیک ہی کی پرورش اور دیکھ بھال ہی ڈھنگ سے کر لیتی، سو وہ بھی اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ یہ کام بھی شکن کے سر آ پڑا تھا کہ وہ راسیک کی پرورش اور تربیت کا فرض انجام دے۔ نروپا ماں کو تو کسی بھی کام سے سروکار نہ تھا۔ ورنہ اگر وہ چاہتی اور ذرا پتا مار کر گڑیاں بنانے میں جی لگاتی تو اچھی خاصی کمائی کر سکتی تھی۔

رام نیک کے گھر شکن کا آنا جانا لگا ہی رہتا۔ پھر خود رام نیک ہر روز صبح صبح لڑکیوں

MashalBooks.org

سے آرڈر لینے آیا کرتا تھا۔ کچھ کو سلمہ ستارہ اور موتی چاہیے ہوتے۔ کچھ کو گڑیوں کے زیور اور گہنے پاتے چاہیے ہوتے۔ گڑیوں کے لئے کڑے چھڑے اور پائل اور مخمل اور ساریوں کے لئے بلاؤزوں کے کپڑوں کے سائزوں، تعداد اور مقدار کے مطابق جب وہ سارا سامان پہلی شفٹ کے لئے لے کر آتا تو پھر دوسری شفٹ کا آرڈر لے جاتا، اس طرح اس کے دن میں تین پھیرے لگتے تھے۔

رام نیک کی بھی اچھی کمائی ہو رہی تھی، وہ بڑا خوش باش آدمی تھا۔ فقرے بازی مسخرا پن اور زبانی چھیڑ چھاڑ اس کی عادت اور مزاج کا حصہ تھی۔ وہ بات کرنے اور آرڈر لیتے وقت بالکل سٹ کر اور قریب گھس کر کھڑا ہوتا۔ بہانے بہانے اتنا قریب ہو جاتا کہ اس کا بدن دوسرے کے بدن سے رگڑتا ہوا گزرتا۔ شکن کو اس کی یہ حرکت اور باتیں بھلی لگنے لگی تھیں اور وہ اس کے قرب سے لطف اندوز ہونے لگی تھی۔ وہ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ آرڈر ملنے کا اہتمام کرتی اور لڑکیوں کو بلاضرورت ہی زیادہ سے زیادہ سامان منگوانے پر آمادہ اور مجبور کرتی تھی۔ اکثر وہ فالتو سامان ان کے لئے بلاضرورت ہی ہوتا تھا مگر رام نیک کی اچھی کمائی ہو رہی تھی۔

شروع شروع میں جب وہ شہر میں نیا نیا آیا تھا تو ایسا ظاہر کرتا تھا کہ وہ اسی کے آسرے پر ہے اور اس کی کمائی بھی شکن کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مگر اندر ہی اندر وہ اپنا کاروبار بڑھاتا رہا۔ اس کی دکان داری اتنی بڑھ گئی کہ ایک بڑی دکان لینا پڑی، دکان میں کام کرنے کے لئے چند ملازم بھی رکھ لئے۔ اپنے لئے ایک اسکوٹر بھی خرید لیا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب شکن کو اپنی کلاسوں کی مصروفیت میں کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ کب وہ نرو پاماں کے اتنے قریب آ گیا۔ ایک روز چھٹی کے دن رام نیک آ گیا۔ اس وقت نرو پاماں گھر میں موجود نہ تھی۔ کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ کچھ دیر ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر بولا: "ایک بات پوچھوں آپ برا تو نہیں مانیں گی۔ اگر نرو پاماں میری تنہا زندگی کی ساتھی بن جائے میری اور میری بچیوں کے جیون کا سہارا بن جائے تو ہمارا جیون سپھل ہو جائے"۔

یوں اچانک ہی اس کے منہ سے ایسی غیر متوقع بات سن کر وہ تو ہکا بکا ہی رہ گئی اور رام نیک کو یہ احساس بھی نہ ہوا کہ یہ بات سن کر شکن گنگ سی ہو گئی ہے۔ بلکہ بولتا چلا جا رہا تھا۔ "آپ یہ رشتہ طے کروا دیں۔ آپ نے میرے لئے اتنا کچھ کیا ہے۔ اب میں زیادہ دن تک اس

طرح اکیلا نہیں رہ سکتا۔ آخر میں بھی مرد ہوں، مجھے ایک جیون ساتھی کی ضرورت ہے۔ آپ نے میرے لئے اتنا کچھ کیا ہے۔ اب یہ کام بھی آپ ہی کر دیں"۔ یہ سب کہنے کے بعد وہ اٹھ کر چل دیا۔

اب یہ بھی سوچنے والی بات تھی کہ نروپاماں میں ایسی کون سی خاص بات تھی جو شکن میں نہ تھی یا پھر وہی بات کہ اس کو شکن میں اتنی خوبیاں نظر آتی تھیں کہ ہمت ہی نہ پڑتی تھی کہ اتنی سندر اور موہنی صورت اور اتنی خوبیوں والی اس عورت سے وہ یہ درخواست کرے کہ آؤ میری جیون ساتھی بن جاؤ۔ میرے جیون کا حصہ بن کر میرے ساتھ رہنے لگو۔ نہ ہی اس کو یہ رشتہ منظور ہونے کی امید رہی ہوگی۔ جبکہ نروپاماں کی ڈھلتی دھوپ کی سی تیزی سے اترتی جوانی اور سندرتا کے پیش نظر رشتہ منظور ہونے کا پورا پورا بھروسہ تھا۔

بات یہ تھی کہ کانتی کی بات دوسری تھی کہ اس پر تو وہ جی بھر کر روئی بھی تھی اور اس نے اس کی ماں کو برا بھلا بھی کہا تھا۔ پر اب تو بات ہی دوسری تھی کہ جب انسان اپنی ہی حماقتوں کے کارن نقصان اٹھاتا ہے تو احساس جرم اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ وہ اس نقصان اور دکھ پر آنسو بھی نہیں بہا سکتا کہ غم اور دکھ کی تہہ تلے دبا ہوا قربانی کا جذبہ اور احساس ایک انوکھی لذت غم بھی تو دیتا ہے اور شکن کے ساتھ یہی ہوا۔

نروپاماں گھر لوٹی تو بڑ بڑ کرتی ہوئی۔" کیا عجیب مرد ا ہے یہ تمہارا رام نیک۔ لو بھلا میرا پیچھا کیوں کرتا رہتا ہے۔ راہ چلتے سڑک پر روک کر کھڑا ہو جاتا ہے، بولے چلا جاتا ہے۔ پتہ نہیں چاہتا کیا ہے، میری تو سمجھ میں بیٹھا نہیں۔ میں تم سے اس لئے کہہ رہی ہوں کہ تم تو مجھ سے زیادہ جانتی ہو اسے۔ اب اس کا کیا مطلب ہے۔ یوں ہی فضول بکواس ہے یا اگر وہ سنجیدگی سے کچھ کہتا ہے تو پھر بھئی تم ہی بات طے کر دو۔ ارے اگر تم میرے لئے کوئی اور مستقل اور ٹھوس راہ نہیں نکال سکتیں تو اتنا کام تو کر ہی دو"۔

اس کے کرنے نہ کرنے کو رہ ہی کیا گیا تھا۔ سب کچھ تو دونوں نے آپ ہی طے کر لیا تھا۔ سارا انتظام خود ہی کیا اور دونوں میں سے ایک نے بھی نہ سوچا کہ اس طرح شکن کا دل کتنا ٹوٹا ہوگا۔

اپنی سوچوں میں گم شکن جیسے ہی رام نیک کے گھر کے آنگن میں داخل ہوئی تو اس کی

نظر رام نیک کی چھوٹی لڑکی پر پڑی۔لڑکی کے گلے میں سلنگ پڑی ہوئی تھی اور اس کا ہاتھ سلنگ میں رکھا ہوا تھا۔ ہاتھ ٹھیک تھا، اس سے وہ گلی ڈنڈا کھیل رہی تھی۔شکن نے چاہا کہ اس سے پوچھے کہ بھئی اب یہ نئی تکلیف کیا ہوگئی۔ پر وہ اتنا ہی کہہ کر رہ گئی۔"ہلو بے بی جمعرات کو تم ہمارے گھر کیوں نہیں آئیں"۔لڑکی نے اس کی طرف گھوم کر دیکھا بھی نہیں اور یوں ہی پیٹھ موڑے موڑے بولی۔"ہم اپنے باپو کے ساتھ بمبئی گئے تھے"۔اور ساتھ ہی گلی کو ڈنڈا مار کر اچھال دیا۔

"ارے تم اس کو وہاں کیوں لے گئے تھے"۔رام نیک بیٹھا ہوا لنگڑی لڑکی کے پیروں میں جوتے پہنا رہا تھا اور وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی کہ یہ جوتے بہت بھاری ہیں۔اس کو دیکھتے ہی رام نیک نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا پر شکن نے یہ بات محسوس کی کہ وہ بہت دبلا اور کمزور نظر آرہا ہے۔

" کیوں بھئی تم اس کو بمبئی کیوں لے گئے تھے۔کیا بات ہوگئی کہ اس کو بمبئی لے گئے؟"

"اب کب تک آپ کو پریشان کرتا رہوں گا اور جب سے اس نے تمہاری پڑوسن سویتا بین کے لڑکے کو گرایا ہے میں بہت شرمندہ ہوں"۔

"ارے چھوڑو سویتا بین کی بات۔ان کی بھلی چلائی۔بھئی بچے تو ایسی حرکتیں کرتے ہی رہتے ہیں بچے جو ہوئے"۔اس نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔"اچھا اب آئندہ تم اس کو میرے پاس ہی چھوڑ کر جاؤ گے سن لیا نا۔ہاں ! میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم اس کو کسی اور کے پاس چھوڑ گئے تھے"۔

پھر اس کو خیال آیا کہ یہ میں اس سے کس لہجہ اور انداز سے بات کر رہی ہوں، سب سے پہلے تو مجھے یہی پوچھنا چاہیے تھا کہ اب یہ کیا نئی آفت آ گئی۔اس کے ہاتھ کو کیا ہوا ہے؟ تو اس کے ہاتھ کو کیا ہوا ہے جو سلنگ میں پڑا ہوا ہے؟"

"یہ کل آم کے پیڑ سے گر گئی۔ایک دن میں تین سو روپے اٹھ گئے۔اس کے لئے نئے جوتے لینا تھے۔اب صرف بمبئی آنے جانے میں سات سو روپے لگ گئے۔دکان الگ بند پڑی ہے، اس چکر میں ہفتہ بھر سے نہیں کھلی۔اتنا خرچہ اتنا بوجھ پڑ گیا ہے شکن میں تو جیسے ان چکروں میں پھنس کر رہ گیا ہوں"۔

"زندگی اسی کا نام ہے۔کیوں میں جھوٹ تو نہیں کہہ رہی۔پر جب تم ان سب باتوں

MashalBooks.org

سے اتنا ہی بیزار ہوا اور گھبرا گئے ہو تو تم کو یہ نئی ذمہ داریاں اپنے سر لینے کی کیا ضرورت تھی؟"

"اب تو مصیبتوں نے گھر ہی دیکھ لیا"۔

"میں سمجھ رہا ہوں شکن تم کیا کہنا چاہ رہی ہو۔ پر میں کروں کیا۔ پیسے سے میں تنگ ہو رہا ہوں۔ نیرو کا وہ ٹائپ نہیں کہ جو تنگی ترشی سے نباہ کر سکے۔ اس کو تو ایک ہی کام آتا ہے باتیں بنانے اور مجھے نیچا دکھانے کا کہ جب بھی اس کو دیکھنے ڈسپنسری جاؤں وہ ڈاکٹروں نرسوں اور پورے محلے کے سامنے مجھے صلواتیں سنانے اور ذلیل کرنے بیٹھ جائے گی۔تم خود سوچو شکن کہ اب میں ان بچیوں کو ساتھ لے جا کر یہ سب نہیں دکھانا چاہتا۔ کاش وہ نام نہاد پوت ہی اس قابل ہوتا کہ اس کو گھر بٹھا کر ان کے پاس اس کی جھڑکیاں کھانے اور باتیں سننے چلا جایا کرتا۔ بس شکن اسی کارن میں نے یہ معاملہ تمہارے اوپر چھوڑ کر سکھ اور آزادی کی سانس لی ہے"۔ یہ کہتے کہتے وہ اپنی عادت کے مطابق مسکرایا تھا پر وہ مسکان بھی اس کے دکھوں پر پردہ نہ ڈال سکی۔ کتنی بے بسی اور اداسی تھی اس مسکان میں۔۔۔۔۔۔اس کو الٹا اس پر ترس آ رہا تھا۔

اس کی دکھی مسکان نے اس کے اندر کے پچھتاوؤں کو الجھا دیا۔ وہ اتنا پچھتا رہی تھی کہ بجائے اس کے کہ اس کی مشکلوں کا کارن پوچھتی الٹا اس کو الہنے دینے بیٹھ گئی۔ اتنا تو وہ جانتی تھی کہ بات کیا ہے کہ اب وہ پہلے جیسا رام نیک نہیں رہا۔ کیسی کھلی کھلی اور من موہنی مسکان ہوا کرتی تھی کہ جس کے اندر سے اجالے پھوٹ پھوٹ کر روشنیاں بکھیر دیا کرتے اور اب تو جیسے بجھ کر ہی رہ گیا تھا۔ اس نے کچھ جانے بوجھے بنا ہی اس کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا تھا اور اب ایسا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اس کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر تسلی اور دلاسا دے۔

اسی اثنا میں لنگڑی لڑکی بھی گرتی مڑتی بڑی دقت سے چلتی ہوئی دروازے تک آ گئی تھی۔ باپ کو بتانے کے لئے کہ وہ جوتا پہننے میں کامیاب ہوگئی ہے۔

شکن نے ایک نظر اس پر ڈالی سوکھی سوکھی مرجھائی ہوئی ٹانگیں تو ٹھٹھر کر رہ گئی تھیں پر بدن کی ماڑھ البتہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔۔۔۔۔اب یہ بڑی ہو رہی ہے۔ چار دن بعد بیاہنے جوگی ہو جائے گی اور بیٹی بیاہنا آسان کام ہے کوئی؟ اس کی تو لنجیا پونجیا، برتن بھانڈے بھی بک جائیں گے۔ پھر بھی کیسے کر پائے گا۔ ایک دم ہی ترس اور ہمدردی کی لہر اس کے من میں امنڈ امنڈ کر اٹھی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی حد بھر اس کی مدد کرے گی۔ "اگر راسیک اس جوگا ہوتا کہ

MashalBooks.org

دکان کو دیکھ لیا کرتا تو تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ بیاہ کر کے میں اتنے گھاٹے میں رہتا۔ پر وہ تو سدا دور دور ہی رہا جیسے اسے کوئی مطلب ہی نہ ہو"۔

وہ کہتا رہا پر شکن تو پوری طرح طے کر چکی تھی کہ وہ اس کا ساتھ دے گی اور اس کی مدد کرے گی۔ اس نے پوچھا: "یہ کیا بات ہے کہ وہ کبھی نہیں آتا"۔

"وہ اگر آنے والا ہوتا تو اپنی ماں پر کاہے کو زور دیتا کہ مجھے ہوسٹل میں بھیج دو۔ تم کو معلوم ہے شکن، اس نے تو خودکشی کی دھمکی دی تھی۔ ہانی آنی یہ بات میں نے خود اپنے کانوں سے سنی تھی۔ شکن، آج میں تم سے کہتا ہوں کہ اس نے تو ہمارے بیاہ کو شروع ہی سے قبول نہیں کیا تھا، وہ تو مجھے اپنا دشمن سمجھتا ہے، اس لئے کہ میں نے اس کے باپ کی جگہ لی تھی اور اپنی ماں سے اس کی دشمنی اس لئے ہوئی کہ اس نے اس کے دشمن سے شادی کی۔ اس کی باتیں سن کر شکن کو یاد آیا کہ ایکسیڈنٹ کے بعد کانتی کس طرح راسیک کو اپنے ساتھ لگائے رہتا تھا۔ اسے مزے مزے کی کہانیاں سناتا اور راسیک بھی باغ سے بیر توڑ کر لا کر اپنے باپ کو کھلایا کرتا تھا، وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا، میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور جادو کا انجکشن لگا کر اپنے پاپا کو بالکل ٹھیک کر دوں گا اور جب وہ ان کے یہاں جاتی تو وہ اس سے کہا کرتا تھا، آنٹی جب میرے پاپا ٹھیک ہو جائیں گے تو میرے ساتھ ریس لگایا کریں گے، ہم دونوں خوب بھاگا کریں گے"۔

یہ سب کچھ یاد کر کے وہ سوچنے لگی: "آخر اس میں راسیک کا کیا دوش ہے، سارا دوش اس کو ہی کیوں دیا جائے"۔

اور اصل بات یہ ہے کہ اس کی ماں کو اس سے بات کرنا اور سمجھانا چاہیے۔ پر وہ تو اس کی باندی بن کر رہ گئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نروپا نے میری زندگی میں کبھی دلچسپی لی ہی نہیں۔ جیون ساتھی کیا بنتی، اس نے تو کبھی ان بچیوں کو پیار کی نظر سے دیکھا ہی نہیں نہ کبھی ان کے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر وہ اس کی کھانسی توبہ۔۔۔۔۔۔۔ رات رات چین نہ لینے دیتی۔ میں احمق تو تھا جو میں نے یہ شادی کی"۔

شکن اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی: "تو یہ فیصلہ بھی تو تمہارا اور صرف تمہارا ہی تھا۔ اب اپنی کرنی تم آپ ہی بھرو، اپنی ڈالی ہوئی گتھیاں بیٹھ کر خود ہی سلجھاؤ۔ ہاں بھئی میرا کوئی پیچ نہیں۔ اس سارے معاملے میں مجھے بیچ میں کھینچنے کی کوشش کرنا بھی نہیں"۔ یہ کہتی کہتی وہ گھر سے نکل یوں چل

MashalBooks.org

پڑی گویا اس سارے چکر سے اپنے آپ کو صاف نکال لے گئی ہو۔ بے فکر اور آزاد ہو کر۔

گھر پہنچی تو اندھیرے اتر آئے تھے، رات ہو چلی تھی۔ بارش میں بھیگی ساری اس کے تن پر ہی سوکھ گئی تھی۔ ٹانگیں ٹھنڈ سے جیسے جم کر تختہ ہو گئی تھیں اور جوڑ چٹاخ چٹاخ بول رہے تھے وہ اتنی تھکی ہوئی تھی کہ لگ رہی تھی جیسے بخار چڑھ آیا ہو، اس نے ساری بدلی اور پیروں پر خوب اچھی طرح بام کی مالش کی۔ پھر ایک چادر اوڑھ کر دیوان پر جا بیٹھی، وہ اتنی تھک گئی تھی کہ کچھ کھانے کو بھی جی نہ چاہ رہا تھا اس کا، جی چاہتا تھا کہ اسی دیوان پر بیٹھی بیٹھی سو جائے۔ اس میں اتنی بھی ہمت باقی نہ تھی کہ اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں جا کر سو جائے۔ وہ بیٹھی بیٹھی بھرت ناٹیم ناچنے والی گڑیا کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ اس کو کیسا اور کس کپڑے کا لباس پہنائے۔ کون کون سے گہنے پہنا کر اس کو سجائے بنائے۔ کل تک یہ کام ختم کرنا ضروری ہے کہ کشوری بھائی تو اپنے ٹھیک وقت پر ہی گڑیاں لینے آ جائے گا۔ پتہ نہیں اس کے طلاق والے مقدمے کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ اس کو کھوج سی تھی۔ اس کے مقدمے کے بارے میں۔ اس کے خیال میں وہ عورت بھی عجیب ہی ہو گی جو اس جیسے اچھے آدمی کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔

اصل میں شکن کشوری بھائی کو من ہی من میں بہت پسند کرتی تھی اور سوچتی تھی اگر یہ شخص کچھ پہلے زندگی میں آ گیا ہوتا تو وہ اس سے عشق کی حد تک تعلق بڑھا لیتی۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ کشوری لال کے مزاج میں بڑا ٹھیراؤ اور سبھاؤ تھا۔ نہ تو وہ کانتی کی طرح مغرور اور خود پسند تھا، نہ ہی اس کے اندر رام نیک کی طرح بچپنا اور بلا لہ پن تھا۔ کشوری بھائی کتنا سنجیدہ اور رکھ رکھاؤ والا لگتا تھا۔ یہ گڑیا جو اس نے تیار کی ہے کشوری بھائی اسے کتنا پسند کرے گا۔ یقیناً بے حد پسند کرے گا۔ اس بات پر اسے پورا پورا وشواس تھا۔ اس کی بنوائی کی اجرت کشوری بھائی نے پانچ سو روپے دی تھی۔ اب پتہ نہیں وہ اسے بیچے گا کتنے میں۔ وہ ہمیشہ ہی اونچے سے اونچا گاہک تلاش کرتا ہے۔ سچ پوچھو تو اس نے شکن کے ہنر اور محنت کے بل پر کتنی ہی دولت کمائی ہے۔ مگر اس کے خون پسینے کی کمائی ساری کی ساری اس کی بیوی ہی پر اٹھتی رہی، وہ اتنا باتونی تو نہ تھا۔ پھر بھی یوں ہی کبھی اس کے منہ سے بات نکل ہی جاتی تھی کہ "وہ بہت ہی فضول خرچ ہے۔ اسے تو ہر سمے پیسہ ہی چاہیے ہوتا ہے۔ ذرا ہاتھ تنگ ہوا نہیں کہ اس نے بڑبڑانا شروع کیا تو اس کا مطلب یہی ہوا نہ کہ وہ شکن کے ہنر اور فن کا استحصال کر کے اپنی پتنی کے نخرے پورے کرتا ہے۔

بیٹھے بیٹھے اچانک ہی اس کو کشوری بھائی پر غصہ آنے لگا کہ وہ اس کی محنت اور ہنر کی کم اجرت دے کر خود مزے اڑاتا ہے۔

تو کون نہیں اس کی بیوقوفی اور سیدھے پن سے فائدہ اٹھا کر اپنا الو سیدھا کرتا ہے۔ کانتی کہ رام نیک کہ سوتیا بین۔ بات تھی ہی بے وقوفی کی کہ بے وجہ دوسروں کے لئے اپنی جان ماریں اور فضول ہی اپنے آپ کو ہلکان کرتے رہیں، بس بہت ہولیا۔ آئندہ اب کسی کی خاطر اپنی جان مارنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب تو وہ بری طرح تھک کر چورا ہو چکی ہے۔ اب کسی کے لئے کچھ نہیں کرنا۔ ابھی سونے کیلئے آنکھ ہی لگی تھی کہ ایسا لگا کہ راسیک دروازے میں کھڑا ہے۔ ارے آج تو اتوار کا دن تھا۔ اس کو تو یاد ہی نہ رہا کہ وہ آتا ہی ہوگا۔ "آجاؤ نا اند، دروازے میں کیوں کھڑے ہو۔ آج دیر سے کیوں آئے ہو"۔ وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"میں اب تیسری بار آیا ہوں"۔ اس نے اکڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ یہ ظاہر کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ تو اس سے ملنے آیا ہی نہ تھا۔ اس کی طرف سے پیٹھ موڑے کھڑا وہ گڑیا کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔

"واہ !واہ۔۔۔۔۔کمال کر دیا کتنی سندر کلا ہے"۔ گڑیا کو دیکھ دیکھ کر وہ عجب والہانہ انداز میں سر ہلا ہلا کر سراہ رہا تھا۔ وہ بلا وجہ بے خیالی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ان دنوں یہ کانتی سے کتنا ملنے لگا ہے، بالکل بنا بنایا ہو بہو وہی۔ قد بت بالکل ویسی ہی، عادتیں بھی وہی۔ ویسے ہی ماتھے پر آئی ہوئی سنہری لٹ کو سر کے جھٹکے سے منہ پیچھے کرنا۔ کانتا بھی گڑیا سازی کے آرٹ کو سمجھتا اور سراہتا تھا۔ آرٹ کا سچا اور صاحب ذوق پارکھ اور اس سے اس کے سامنے کھڑا ہوا راسیک بھی اس کے اندر اپنے باپ کی یاد تازہ کر رہا تھا، جیسے وہی زندہ ہو کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا ہو۔

"اچھا مجھے تو یہ حیرت ہو رہی ہے کہ آخر آپ نے اس کو اس بھاؤ اور اس گت میں کھڑا کیسے کیا؟ "راسیک دھیمے لہجے میں منہ ہی منہ میں بول رہا تھا۔

"یہ کچھ اتنا کٹھن کام بھی نہیں ہے، میں نے پہلے تو یہ سوچا کہ اس کو اس پوز میں کھڑا کرنا ہے پھر میری سوچ ہی میرے لئے چیلنج بن گئی"۔

وہ جب کوئی ایسی مشکل اور پیچیدہ پوز میں گڑیا تیار کرتی تو پہلے کانتی کو دکھا کر اس کی رائے لیتی تھی اور وہ اگر اس کو پسند کر لیتا تو پھر وہ اسی ڈول اور انداز پر گڑیا تیار کر لیتی تھی۔ آج کانتی

زندہ ہوتا تو زندگی کتنی مختلف ہوتی۔

"اس گڑیا کا تو آپ کو بہت معاوضہ ملے گا"۔ بس یہاں یہ آواز کانتی سے مختلف ہو گئی تھی۔ کانتی کبھی روپے پیسے کی بات کرتا ہی نہ تھا، یہ تو اس کے اندر نروپا ماں بول رہی تھی۔ اسی کو پڑی رہتی تھی ایسی باتوں کی۔ وہ تو ہر ایک کو اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتی تھی۔

اس کی بات کا جواب بھی اس نے تیکھے لہجے میں دیا۔ "ہاں کیوں نہیں مجھے اس کا بہت اچھا معاوضہ ملا ہے اور وہ خرچ بھی ہو چکا، تمہاری کتابیں کاپیاں وغیرہ انہی پیسوں سے تو خریدی ہیں"۔

شمکن کو ایسا لگ رہا تھا کہ وہ مزید کھڑی نہیں رہ سکتی۔ پلنگ پوش اوڑھ کر پڑ جانے کو جی چاہ رہا تھا۔ راسیک سے کہنے لگی۔ "ذرا ایک اسپرین کی ٹکیہ تو الماری سے نکال کر دے دو۔ سارا بدن درد کر رہا ہے"۔ راسیک نے ٹکیہ اس کے ہاتھ میں دی اور خود اس کے لئے پانی لینے چلا گیا۔ واپس آ کر اس نے بالکل اس آواز میں جیسے جرح کر رہا ہو کہا: "آخر اتنی بارش میں باہر جانے کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی"۔

"میں گئی تھی تمہاری ماں کو دیکھنے"۔ اس نے بگڑ کر جواب دیا۔ کبھی تم بھی جاتے ہو اس سے ملنے؟"

"اچھا میں جاؤں تو کیا وہ مجھ سے مل کر خوش ہوں گی؟"

" کیوں ! کیوں نہیں ہوں گی"۔

"ہونہہ مجھے نہیں پڑی کہ میں ایسے لوگوں کو خوش کرنے کے لئے ان سے ملتا پھروں جو مجھے خوش کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے ان کی دی ہوئی خوشی کی کوئی ضرورت نہیں"۔

اس کی باتوں سے اچانک ہی شمکن کا جی بیٹھنے لگا۔ کیسا بے حس اور پتھر دل لڑکا ہے۔ اگر اس کو پتہ چل جائے یا یہ بات معلوم ہی ہو کہ میرے اور اس کے باپ کے درمیان کون سا ناتا اور سمبندھ تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کو یہ خبر ہو کہ میں نے اس کے باپ کی بیوی نہ ہونے کے باوجود اپنا سارا جیون بھی اس کے لئے تج دیا۔۔۔۔۔۔ شاید اسی وجہ سے میرا اتنا لحاظ اور خیال کر لیتا ہے۔

"اچھا اب مجھے باتوں میں لگا کر میرا وقت ضائع نہ کریں اور ہاں اس وقت آپ مجھے کچھ پیسے دے سکیں گی؟ کل مجھے کلاس جوائن کرنا ہے۔ آج فیس ادا کرنے کا آخری دن ہے اگر آپ مجھے فیس

نہیں دیں گی تو وہ میرا نام کاٹ دیں گے اور میری جگہ کسی اور کو داخلہ دے دیں گے"۔ وہ اتنے اکھڑ اور حاکمانہ لہجے میں اس سے مخاطب تھا کہ لگتا تھا کہ وہ اس سے مانگنے نہیں آیا بلکہ مانگنے والی وہ خود ہے۔

اس نے اس کی بات بیچ ہی میں کاٹ دی اور کہنے لگی: "دیکھو اب میں تمہاری کلاس فیس نہیں دے سکتی۔ میں پہلے ہی تمہارے ہوسٹل اور میس کے اخراجات دیتی ہوں۔ تمہارے کالج کی فیس بھرنے کے علاوہ کتابوں اور ایکسرسائز بکس کے لیے پیسے دیتی ہوں۔ اب میں تمہاری کلاس فیس کہاں سے دوں۔ تم کو پتہ ہے کہ گڑیا سازی کی کلاس میں اب چند لڑکیاں ہی رہ گئی ہیں اور اب آئندہ میں کوئی بڑا آرڈر بھی نہیں لوں گی۔ اب میں بہت تھک گئی ہوں"۔

"پر یہ تو بہت اہم سال ہے یہ تو میری زندگی اور موت کا مسئلہ ہے"۔

"بھئی میں کب تک دوسروں کا جیون بنانے کے لئے اپنے آپ کو مٹاتی رہوں گی۔ بس بہت ہو چکا۔ اب میں ان ساری چکر بازیوں کو نہیں نباہ سکتی۔ تم یقین کرو اب مجھ میں بوتا نہیں رہا"۔

اچانک دروازے پر پیروں کی آہٹ سی سنائی دی اور اس کے اندر داخل ہونے یا صورت نظر آنے سے پہلے اس کے ہاتھ میں تھامے ہوئے بڑے سے سوٹ کیس کا کونہ دکھائی دیا۔ تو کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ رات یہاں بسر کرے گا۔ ایسا پہلے تو کبھی ہوا نہیں تھا، وہ تو صبح آتا تھا اور شام کو چلا جایا کرتا تھا۔

اب شکن کو اس کی طلاق کا مقدمہ یاد آ گیا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کاش آتے ہی ساری تو بدل لی ہوتی یہ بھیگی چوڑا ہو کر بدن پر ہی سوکھ جانے والی مچڑی ہوئی ساری اتار کر بالوں میں کنگھا تک تو پھیرا نہیں گھر آ کر۔ بال ہی سنوار لیتی اور چہرے پر ذرا سی پاؤڈر کی تہ ہی جما لی ہوتی۔

اب اس کو اس بات سے گھبراہٹ اور شرم سی آ رہی تھی کہ کشوری بھائی اور راسیک ایک ساتھ ہی اس کے گھر میں موجود ہیں۔ اب وہ راسیک سے اس وقت پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ اس نے کہا: "دیکھو وہ رسوئی کی الماری میں کچھ مٹھائی رکھی ہے، چاہو تو کھا لو اور اب تم جاؤ۔ اب پھر بارش شروع ہو گئی تو پھنس جاؤ گے"۔

اس نے ایک جھٹکے سے ماتھے پر آئی لٹ کو پیچھے کیا اور غرا کر بولا: "نہیں مجھے کچھ نہیں کھانا، بس آپ پیسوں کا انتظام کر رکھیں میں کل تیسرے پہر آ ؤں گا"۔ وہ مڑا اور باہر نکل گیا، شگن کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ آگ اور دھویں کی لپیٹ میں آ گئی ہو۔

ہاری ہوئی دل شکستہ وہ اٹھ کر کچن کی طرف چلی اور کشوری لال سے کہا۔ "بیٹھو میں چائے بنا کر لاتی ہوں"۔

"ارے تم کیسی ہو؟ ٹھیک تو ہو نا۔ بڑی تھکی تھکی لگ رہی ہو"۔ کشوری لال نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، ٹھیک ہوں بالکل۔ بس باہر نکلی تو بارش نے آ لیا۔ اسی میں پھنس گئی تھی"۔

وہ اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے رسوئی میں آ گیا۔ "میں تمہارے لئے مٹھائی لایا ہوں۔ تم کو پسند آئے گی۔ کیوں مٹھائی پسند تو کرتی ہو نا؟"

"ہاں۔۔۔۔۔ سناؤ۔۔۔۔۔ وہ تمہارے کیس کا کیا بنا؟ "اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"ارے وہ تو کب کا ختم ہو گیا۔ یہ مٹھائی تو میری بیٹی کی سگائی کے شگن کی ہے۔ کل ہوئی تھی۔ اس کی سگائی۔ میں اس وقت وہیں سے تو آ رہا ہوں"۔

"اچھا بھئی بدھائی ہو بہت بہت"۔ اس نے جلدی سے مبارکباد دی اور کہا کہ "تم آج اور اس وقت کیسے آ گئے، تم کو تو کل آنا تھا۔ گڑیا لینے ابھی تھوڑا کام باقی ہے"۔

"تم گڑیا کے بارے اپنے من پر بوجھ نہ لو کہ میں ایک دن پہلے ہی آ گیا ہوں۔ کوئی بات نہیں۔ اس کو سجانے اور سنگھار کا کام تو میں اپنے آپ بھی کر لوں گا۔ میں تو تم کو یہ بتانے آیا ہوں کہ مجھے ایک فرنچ گاہک ملا ہے جو چاہتا ہے کہ یہ ناچنے والی کے پوز کی جو تصویر ہے اس کے مطابق گت اور بھاؤ میں گڑیاں تیار کر دو۔ بس ایک ہفتے کے اندر اندر تیار کر دو۔ اس نے بس ایک ہفتہ ہی دیا ہے۔ اسی کارن تو میں اسی وقت بھاگا بھاگا آیا ہوں۔

"اچھا تو یہ بھی اپنا ہی الو سیدھا کرنے، اپنے مطلب ہی سے آئے ہیں"۔ چائے کو چھلنی سے چھانتے ہوئے شگن نے اس تصویر کو غور سے دیکھا جو کشوری بھائی نے اس کے سامنے سجا دی تھی۔ اس تصویر پر نظر پڑتے ہی اس کے خیال ہی خیال میں وہ گڑیاں ناچنے لگیں جو اس تصویر

میں سے بھاؤ بتاتی ہوئی نکلی چلی آ رہی تھیں۔

"ہاں یہ رہے گی تو خوب"۔اس نے کہا۔

"مجھے پورا وشواس تھا کہ یہ گت بھاؤ تمہیں پسند آئے گا"۔چائے کی چسکی لیتے ہوئے وہ کہنے لگا۔

اب وہ پھر چوکنی ہوگئی۔

اس کی گڑیوں کی بڑی مانگ تھی۔کشوری بھائی کی بمبئی والی دکان میں۔خاص طور پر غیر ملکی گاہک تو اس کی بنائی گڑیوں پر ٹوٹ کر گرتے تھے اور ایک بھیڑ سی لگی رہتی تھی۔شکن جانتی تھی کہ یہ ایک ایک گڑیا سے خوب خوب کمائی کر رہا ہے۔بڑے بڑے آرڈر لے کر خوب پیسہ بنا رہا ہے اور اس کو شبہ نہیں یقین تھا وہ گھاٹے میں رہتی ہے وہ اس کو واجبی پیسے دے کر ٹرخا رہا ہے۔یہ ایسا کام ہے کہ اس میں بڑی ہوشیاری اور جان ماری سے کام لینا پڑتا ہے۔یہ بات اس کو سنانے کے لئے ذرا اونچی آواز سے کہا۔

4 edulcni$[-d:\work\mashil\bmas.hml]

"دیکھو میرے پاس صرف آٹھ دن ہیں۔ہفتہ بھر میں پورا منظر تیار کرنا ہے۔اسی لئے میں یہاں ٹھہرا ہوا ہوں کہ تمہارے ساتھ ساتھ کام کر کے تمہارا ہاتھ بٹاؤں، میں اپنے ساتھ بنے بنائے ریڈی میڈ ہاتھ، پیر اور سر لایا ہوں۔تم دیکھ لو اگر ان کو استعمال کرنا چاہو تو کام جلدی نبٹا لو گی"۔یہ کہتے کہتے اس نے ڈبے کھول کھول کر گڑیوں کے ریڈی میڈ دھڑ ہاتھ پاؤں اور منہ دکھانا شروع کئے۔وہ جو ڈبہ بھی کھول کر دکھاتا شکن یہ کہہ کر دور سرکا دیتی۔"نہیں یہ میرے کام کے نہیں۔میں ان کو بالکل استعمال نہیں کر سکتی"۔اس نے سب سے آخری ڈبہ کھولتے ہوئے بڑے جوش اور یقین سے کہا۔"یہ دیکھو یہ ٹانگیں تو تم کو پسند آئیں گی،ضرور پسند آئیں گی"۔وہ طنزاً ہنس پڑی۔"دیکھو تم ذرا اپنے الفاظ پر غور کرو۔بھئی تم تو تاجر ہو فقط۔۔۔۔تمہارے پاس کلاکار کی آنکھ اور دل کہاں سے آئے گا"۔

"یہ بات تو تم کتنی بار مجھے جتا چکی ہو"۔کشوری بھائی نے برا مان کر تلخی سے کہا۔"پھر بھی میں نے سوچا کہ شاید یہ تمہارے کام آ سکیں اور تمہارا کام آسان ہو جائے گا"۔

" کسی چیز کو بنا کر تیار کرنا الگ بات ہے اور اس میں اپنے خون جگر سے جان ڈالنا اور رچاؤ پیدا کرنا الگ بات ہے۔ اگر تم ایسا ہی چلتنو کام کروانا چاہتے ہو تو بمبئی میں ایک سے ایک کاری گر پڑا ہے۔ بھلا اتنا سفر کر کے یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی"۔

"میرا خیال ہے تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو، میں بیوقوف اور گدھا جو ہوا ورنہ کیا ضرورت تھی آنے کی"۔ اس نے بھی کٹھور پن سے کہا، پھر بھی اس کے ہاتھ ڈبے میں چلتے اور ٹٹولتے ہی رہے اور ٹانگیں نکال نکال کر دکھاتا رہا۔ "یہ دیکھو یہ بڑے ماہر ہاتھوں کی بنائی ٹانگیں ہیں کہ یہ تو ایکسپورٹ کوالٹی کی ہیں"۔

"ارے بھئی تم سمجھتے کیوں نہیں"۔ وہ بھی اپنی بات پر اڑی رہی، اپنی پوزیشن اور اپنا موقف مضبوط بنانے کی خاطر"۔ سنو میری بات اگر تو یہ گربا ناچ کا منظر بنوانا ہے تو اس کے لئے کم از کم آٹھ تو گایوں کے ریوڑ چاہیے ہوں گے اور پھر گوالنین بھی ہوں گی ان کے لہنگے اونچے ہوں گے اتنے اونچے کہ ان کی پنڈلیاں آدھی آدھی دکھائی دیتی ہوں۔ ان کے ننگے پیر اس طرح کے ہونا چاہئیں کہ ناچ کی تھاپ اور تال پر ناچتے اور گھومتے معلوم ہوں۔ ایک ہی تال پر گھومتے ہوئے۔ بتاؤ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں کہ نہیں اور ہاں گئیوں کے ریوڑ بھی ناچتے ہوئے دکھائی دیں، اسی سر تال کے مطابق۔ اس واسطے یہ چپٹے چپٹے سیدھے سیدھے پیر کسی کام نہیں آ سکتے۔ ہوگا یہ کہ کچھ تو اپنے تلوے ٹکائے کھڑی ہوں گی اور کچھ کی ٹانگیں ہوا میں لہراتی نظر آئیں گی۔ کیوں میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

کشوری بیٹھا بیٹھا سر ہلا ہلا کر اس کی بات اور اس کی ذہانت کو سراہتا اور داد دیتا رہا۔ "ہاں واقعی تم ٹھیک ہی کہتی ہو"۔

اس کو اس طرح قائل کر کے شکن کچھ اور پھول گئی تھی۔ وہ اس کو بتاتی رہی کہ گربا ناچنے والیوں کے لئے یہ ریڈی میڈ پیر بالکل مناسب نہیں۔ یہ بہت بھدے اور برے لگیں گے، وہ تو خود اپنے آپ ہی تیار کروں گی"۔

"ہاں ! ہاں بھئی اسی کارن تو میں اس کام میں تمہارا ہی سہارا لیتا ہوں اور مجھے تم پر پورا پورا بھروسا ہے"۔ کشوری لال بولا اور پھر کہنے لگا "تم کس طرح ان تمام باریکیوں اور ساری جزئیات پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ ان کو بھرپور طریقے سے اپنے قابو میں کرتی ہو؟ "اس کی اس

بات پر شکن جلبلا کر بولی۔

"پر تم کون سی قدر کرتے ہو اور کیا اہمیت دیتے ہو۔ کتنا نفع کماتے ہو۔ تم کتنا پیسہ بنا لیتے ہو، مجھے کیا ملتا ہے"۔

شکن نے صاف صاف کہہ دیا کہ اس بار وہ اپنا استحصال کرنے کی ہرگز ہرگز اجازت نہیں دے گی۔ اس نے صاف طور پر واضح کر دیا کہ گر با ناچ کے اس پورے سین کو تیار کرنے کے وہ پندرہ سو لے گی اور ایک پیسہ بھی کم نہ کرے گی۔ کشوری لال کے چہرے پر کوئی تاثر نہ ابھرا۔ یوں ہی ٹھس کا ٹھس بیٹھا رہا۔ شکن اور بھی زیادہ چوکس ہو کر بولی۔ خالی گڑیاں ہی تو نہیں ہوتی ہیں۔ آخر ان کو سجانا اور سنوارنا بھی ہوتا ہے۔ ان کے گہنے پاتے اور اچھا نفیس کپڑا بھی تو اپنے ہی پاس سے لگانا پڑتا ہے اور تم کو بھی پتہ ہے کہ آج کل کتنی مہنگائی ہے۔ یہ سارا سامان خریدنے والے کا دل ہی جانتا ہے۔

"ارے تم پیسے کی اتنی بات کیوں کر رہی ہو، کیوں چنتا کر رہی ہو اجرت کے بارے میں، اصل بات جو ہے اس کے بارے میں سوچو کہ ہمیں یہ سارا گربا ہفتہ بھر میں تیار کر کے دینا ہے، وہ فرنچ آدمی اگلے ہفتے واپس آئے گا، اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ تم کو چار دن میں آٹھ گڑیاں اور نواں کرشنا کنھیا کا پتلا تیار کرنا ہے۔ اچھا پھر ان کو کھڑا کرنے میں دو دن اور لگا لو۔ ایک دن ان کو سجانے اور گہنے پاتے پہنانے میں لگ جائے گا"۔

"تو یہی سب خیال کر کے میں خود آ گیا ہوں کہ تمہارے پاس ٹھہر کر تمہاری مدد کروں۔ کچھ ہاتھ تمہاری لڑکیاں بٹا دیں گی"۔ اب وہ اپنی مردانہ کاروباری چالوں پر اتر آیا تھا۔

اس کی ان باتوں پر وہ آگ بگولہ ہی تو ہو گئی، وہ تو بس اس کو حکم دے رہا تھا، آرڈر تیار کرنے کا۔ یہ آدمی تو اس کی کلا کا اس کے آرٹ کا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اس کی محنت اور مہارت کے بل پر پیسہ بنا رہا ہے دھڑا دھڑ۔

"دیکھو تم کو پتہ ہے کہ میرے موڈ کی بات ہے۔ موڈ بن جائے تو بن ہی جاتا ہے۔ نہیں بنتا تو پھر مجھے مجبور تو نہیں کر سکتے اس طرح کام کرنے پر"۔ یہ کہتے کہتے وہ اس کی طرف سے پیٹھ موڑ کر کھڑی ہو گئی اور چائے کی پیالیاں اور پرچیں دھونا شروع کر دیں۔ کشوری بھائی اس کی خوشامدیں کرنے لگا۔ اب ایسی باتیں تو نہ کرو۔ مجھے پتہ ہے کہ تمہارا موڈ بن ہی جائے گا۔ دیکھو نا

یہ تمہارے آرٹ اور کلا کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ ارے تمہاری کیا بات ہے، تمہارے ہاتھ کی بنی ہوئی گڑیاں دیکھ کر لوگ حیران ہو جاتے ہیں۔ ایسی جان ڈال دیتی ہو ان میں کہ دیکھنے والے کو یہی لگتا ہے کہ ابھی ناچنے اور بھاؤ بتانے لگیں گی اور کنھیا جی اپنے بانسری پر سر جگانے لگ جائیں گے، تانیں اڑانے لگیں گے۔

برتن دھوتے اور مانجھتے مانجھتے ایک دم ہی شکن کے ہاتھ رک گئے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے ہاتھوں میں چل سی پڑ گئی ہو، جی کرتا تھا کہ ابھی اور اسی سمے گڑیاں بنانے بیٹھ جائے۔ اس کو پتہ تھا کشوری بھائی باتیں بنا کر اور اسے پھسلا کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ خود ہی اپنی آمادگی ظاہر کر دے۔ ایک بار اپنے منہ سے ہاں کہہ دے۔

اس نے بھی اڑیل پن سے کہنا شروع کیا: "دیکھو میں اتنی ہبڑ دبڑ میں کام نہیں کر سکتی۔ ان دنوں مجھ میں بوتا نہیں رہا ایمر جنسی اور ہنگامی حالات میں کام کرنے کا کہ رات دن ایک کر دوں، اب میں تھک جاتی ہوں بڑی جلدی"۔

" شکن میں تو یہاں بڑی آس لے کر آیا تھا۔ تم جانو یہ گاہک سچ مچ بہت بڑا ہے۔ اس کا کام کرنے کے بعد ہمیں فرنچ ایمبیسی سے بڑے بڑے آرڈر ملیں گے۔ دیکھو پیسے کی تم کو بھی ضرورت ہے اور مجھے بھی۔ میری تو اس طلاق کے کیس نے لٹیا ہی ڈبو دی۔ میں تو پیسے پیسے سے حیران ہو رہا ہوں۔ پھر لڑکی کا بیاہ بھی سر پر کھڑا ہے۔ تم میری مدد کرو گی تو میرا بیڑا پار لگے گا۔ اب چلو چھوڑو بھی اور میری بات پر غور تو کرو"۔

اچھا تو یہ چاہ رہا ہے کہ میں اس بات کا اعتراف کر لوں کہ مجھے پیسے کی ضرورت ہے۔ خود تو اس کو پیسے کی ضرورت ہے اور یہ میری ضرورت سے فائدہ اٹھانا چاہ رہا ہے۔۔۔۔۔ دل ہی دل میں وہ اس کو کوسنے لگی۔

"اچھا چلو چھوڑو۔ پہلے ہم باہر چل کر کھانا کھاتے ہیں اور فلم دیکھتے ہیں، بعد میں طے کریں گے یہ باتیں"۔

اس نے اس کی یہ پیشکش بھی بڑے چڑچڑے پن سے رد کر دی۔ "اگر تمہارا دل چاہ رہا ہے تو تم جا کر ڈنر کر آؤ۔ مجھے بھوک نہیں، مجھے تو لگ رہا ہے جیسے بخار چڑھنے والا ہو اور فلم۔۔۔۔۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ رات گئے تک جاگوں اور ان دنوں تو میں دیر تک جاگ ہی

MashalBooks.org

نہیں سکتی۔تم اکیلے ہی چلے جاؤفلم دیکھنے اور ہاں پھر آ کر میری نیند نہ خراب کرنا۔لو یہ ڈپلی کیٹ چابی ساتھ لے جاؤ۔اپنے آپ ہی دروازہ کھول کر اندر آ جانا"۔

کشوری بھائی نے چپکے سے چابی پکڑی اور باہر نکل گیا۔شاید وہ بلاضرورت ہی اس سے اتنی اکھڑی اکھڑی باتیں کرتی رہی تھی۔شکن سوچنے لگی۔آخر اس کی وجہ سے ہی تو اس نے ان چند برسوں میں ہزاروں روپے کما لئے تھے۔ارے بھئی یہ تو اس کی دکانداری اور کاروبار کا ہی معاملہ ہے۔اس کو تو اپنا فائدہ اور نفع نکالنا ہی ہے اور پھر یہ کہ آرڈر حاصل کرنے کے لئے تو وہی مارا مارا پھرتا ہے۔بدیسی غیر ملکی لوگوں میں گھس پل کر گاہک پکڑنا۔ان سے معاملے طے کرنا۔بڑے بڑے شہروں میں جا کر گڑیوں کی نمائش لگانا یہ ساری کھپ تو اس نے اپنے ہی سر لے رکھی ہے۔نہیں اس سے اس انداز میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی اور ایک بات یہ ہے کہ وہ ہے بھی بڑا معقول اور شریف آدمی اور معاملے کا کھرا۔نہیں بھئی اس سے اس طرح بات نہیں کرنا تھی، ذرا نرمی اور مہذب لہجے میں بات کرنا تھی۔یہ سوچ کر کہ اس کی بیوی کے گھر چھوڑ کر چلے جانے کے بعد وہ اچھے کھانے کو ترس گیا ہوگا اس کو چاہیے تھا کہ اس کو مزے دار کھانا بنا کر کھلاتی۔۔۔۔۔اس خیال کے آتے ہی شکن لپک کر بالکونی کی طرف گئی۔اس کو آواز دے کر بلائے۔پر وہ تو کب کا جا چکا تھا۔

بارش تھم چکی تھی، بادل برس کر کھل گئے تھے۔سامنے شفاف آسمان پر چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔اس کی بات مان ہی لی ہوتی تو شام کا نکھرا نکھرا سے کتنا اچھا گزر جاتا۔یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ فلم پر چلنے کی صلاح کے پیچھے بھی کوئی خیال کوئی پلاننگ ہو۔پھر اس کا رات کا یہاں گزارنے کا جو خیال ہے اس کا کیا مطلب ہوسکتا ہے۔پر اس کی اپنی یہ کیا عادت ہے کہ جن باتوں کی حد سے زیادہ خواہش ہوتی ہے اور جن کے پالینے کی چاہت ہوتی ہے جب وہ نزدیک آنے لگتی ہیں تو وہ ان ہی کو دھکا دے کر پرے دھکیل دیتی ہے اور پھر جب دھپ سے گرنے کی آواز سنتی ہے تو اپنے کان امیٹھتی ہے۔

شکن کو نیند نہ آ رہی تھی، بڑی دیر سے پڑی جاگ رہی تھی۔کشوری بھائی واپس آ گیا تو بھی ایسے ہی بنی پڑ رہی جیسے سو رہی ہو۔پھر غسل خانہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔پھر دیوان پر چادر بچھانے کی سرسراہٹ کان میں آئی، پھر بتی بجھا کر اندھیرا کر دیا گیا۔اب پھر اس کو

کشوری بھائی پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے سونے کی کوشش کی۔

صبح جب وہ سو کر اٹھی تو دن چڑھ آیا تھا۔ دودھ آ چکا تھا۔ کشوری بھائی جاگا ہوا تھا۔ اس نے خود ہی چائے کا پانی ابلنے کے لئے چڑھا دیا تھا۔ اس نے شکن کو نیند سے بیدار ہوتے دیکھ کر کیتلی میں اور پانی ڈالتے ہوئے کہا: "آج تم کو میں چائے بنا کر پلاتا ہوں۔ اب طبعیت کیسی ہے؟"

اس کے سوال پر شکن کو کل والے درد کا خیال آیا جس نے اس کو بری طرح پریشان کر رکھا تھا۔ لیکن اچھی طرح آرام کر لینے کے بعد اب بالکل غائب ہو چکا تھا۔ ''بالکل ٹھیک۔۔۔۔۔ "یہ کہتے ہوئے اٹھ کر اس نے دانتوں میں برش کیا۔

"ارے تم نے کیوں چائے بنائی؟ "اس نے تکلفاً کہا۔ پر چائے پی کر اس کو بڑا اچھا لگا کہ اس نے اتنی توجہ اور محبت سے اس کو اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلائی ہے۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ فلم تھی کیسی؟ پسند آئی؟ کون سی فلم دیکھی۔۔۔۔۔؟ "چائے پیتے پیتے اس نے سوال کیا۔

"ارے چھوڑو کیسی فلم۔۔۔۔ میں فلم سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ اتنی تو فکروں اور پریشانیوں میں گھرا ہوا ہوں، پیسے سے الگ حیران ہوں، میں فلم کیا دیکھوں گا۔ ایک تو اس کم بخت طلاق کے مقدمے نے میرا کباڑا کر دیا ہے، فضول کا خرچہ۔ اب اتنی آس بندھی تھی کہ ایک بڑی اسامی مل گئی تھی سوچا تھا کچھ کمائی ہو جائے گی۔ مگر اب تو وہ بھی ہاتھ سے نکل جائے گا"۔ یہ کہتے کہتے کشوری بھائی اٹھ کھڑا ہوا جیسے ایک دم ہی اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔۔۔۔۔۔ "ارے ہاں وہ تمہارے پاس دو لڑکیاں نہیں ہوا کرتی تھیں، جنہیں تم کام سکھا رہی تھیں۔ پچھلی بار جب میں آیا تو وہ بڑی اچھی گڑیاں بنا رہی تھیں، وہ تھی نا، گوری سی ذرا گدرے بدن والی۔ میرا خیال ہے اس کا نام جیوتی تھا۔ کیوں یہی نام تھا نا اس کا؟"

شکن کو ایک دھچکا سا لگا۔

"اس کی تو شادی ہو گئی، وہ تو دیانو میں رہتی ہے"۔

اچھا اور بھی تو تھیں دو لڑکیاں اگر تم ان سے کہو گی تو وہ انکار نہیں کریں گی، دیکھو اب میں خود بھی باہر نکلتا ہوں، ادھر ادھر کھوجوں گا تو مل ہی جائے گی کوئی نہ کوئی۔۔۔۔۔۔ ہاں کھانا میں باہر ہی کھاؤں گا۔ اچھا ہاں وہ گڑیا شام تک تو تیار ہو جائے گی نا۔ مجھے آج ہی بمبئی واپس جانا

ہے۔تم ایسا کرو کہ باہر والے دروازے کے تالے کی چابی میرے پاس ہی رہنے دو۔تم اگر دوپہر کو آرام کر رہی ہوگی تو میں آ کر اپنا سامان اور گٹریا اٹھالوں گا۔تمہاری نیند نہیں خراب کروں گا۔اب جا کر دیکھتا ہوں شہر میں شاید کوئی کاریگر مل جائے۔میں اتنا بڑا آرڈر کھو تو نہیں سکتا"۔

اس کی باتوں پر شکن غصہ سے تھرا گئی۔اچھا تو یہ بات ہے۔اب یہ بھی اپنا کام کسی اور کے بل بوتے پر چلائے گا۔اپنے جیون میں کسی اور کے بھروسے اور وشواس کو داخل کرے گا اور اس سے اپنا کام چلائے گا۔

خیر یہ تو میں اسے ہرگز نہیں کرنے دوں گی۔۔۔۔۔ایسا لگتا تھا کہ اب وہ رو پڑے گی۔اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اپنا پورا زور لگا کر اس کو پکڑ لے اور یہیں اسی جگہ پر اس کے پیروں کو گاڑ دے تا کہ وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکے۔یہ بات نہ تھی کہ اس کو کشوری بھائی کی ضرورت تھی۔بلکہ وہ چاہتی تھی کہ کشوری بھائی کو اس کا آسرا رہے اور اپنے جیون کی گاڑی کو وہ اس کی سہائتا کے بنا چلا نہ سکے، وہ اس کا سہارا ڈھونڈتا رہے، یہی تو شکن کے جیون کا اصل مقصد تھا، وہ اس کو دوسروں کی سہائتا کر کے ان کے جیون کا سہارا بن کر ہی شکتی اور شانتی ملتی تھی اور اس کو لگتا کہ اس کا جیون سپھل ہو گیا ہے۔

ابھی کچھ کہنے کو اس نے منہ کھولا ہی تھا کہ کشوری دروازہ بند کر کے باہر نکل چکا تھا۔

شکن دم بخود بیٹھی تھی۔ایک دم بے بس اور لاچار۔۔۔۔سوچ رہی تھی، آج کشوری لال۔۔۔۔ اس کے سہارے اور بھروسے کو چھوڑ گیا۔کل راسیک چلا جائے گا۔رام نیک اور نروپا بھی ایک دن اس کے آسرے کو ٹھکرا کر اس کی محتاجی سے آزاد ہو سکتے ہیں۔ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس کی جڑیں ایک ایک کر کے اس زمین کو چھوڑ رہی ہیں، جس میں اس نے اپنے وجود اور ہستی کے تناور درخت کو کھڑا کر رکھا تھا۔وہی جڑیں اب رفتہ رفتہ اس کا ساتھ چھوڑ رہی ہیں۔ایک انجانے سے خوف کے تحت جس کی ساری ملکیت خطرے میں پڑ گئی ہو۔

ایک انجانے سے دباؤ کے احساس کے تحت وہ اٹھی اور گھر سے نکل گئی، سب سے پہلے تو اس نے راسیک کے پاس جا کر جتنی رقم اس کو درکار تھی دی۔نروپا ماں کی دوائیوں کے بقایا پیسے ڈاکٹر کے پاس جمع کروائے اور پھر راستے میں اپنا رکشا رام نیک کے دروازے پر رکوایا اور اندر جا کر ڈھیروں کرنسی نوٹ اس کو پکڑا کر بولی: "یہ لو اب تم ان سے اپنی دکان چالو کر لو"۔وہاں سے

MashalBooks.org

بھا گی بھا گی اپنی چند شا گردوں کے گھروں پر ان کے لئے پیغام چھوڑے کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے مجھ سے آ کر ملو۔ اس کے بعد گھر واپس آ گئی۔ آتے ہی کچھ کھائے پیئے بغیر ہی گڑیاں بنانے والا سارا سامان لے کر بیٹھ گئی۔ تیسرے پہر کے قریب کشوری بھائی گھر میں گھسا تو یہ دیکھ کر کہ وہ گڑیاں بنانے میں جتی ہوئی ہے اس کا چہرہ اطمینان اور خوشی سے دمکنے لگا۔ وہ پانچ چھ لڑکیوں کے گھیرے میں بیٹھی تھی اور ساری لڑکیاں کام میں جتی ہوئی تھیں۔ گئیوں کے دو ریوڑ اور ایک گوالن تو تیار بھی ہو چکی تھی۔ تیسرا چرواہا اس کے ہاتھ میں تھا۔

جے۔۔۔۔۔ جے کار کا نعرہ لگاتے ہوئے کشوری بھائی کی آنکھیں بھر آئیں۔ بھرے گلے سے وہ بولا: "مجھے پتہ تھا کہ تم مجھے ناں نہیں کہو گی۔ نراش نہ کرو گی۔ شکن میں تمہارے ہی بل پر تو اپنا کاروبار چلا رہا ہوں۔ مجھے تم پر پکا وشواس ہے"۔

وہ آگے کچھ نہ بول سکا پر شکن یہی بات تو سننا چاہتی تھی، اس کو یہی بات سننے کا انتظار تھا۔ تب اس نے نظر بھر کر اس کی طرف دیکھا، اس کے سر کے بال کتنے سفید ہو چکے ہیں اور کتنا کمزور ہو گیا ہے۔ کتنی پریشانیوں نے تو گھیر رکھا ہے اسے۔ یہ کام ہو گیا تو کچھ تو کمی آئے گی اس کی مصیبتوں اور فکروں میں۔

اس کو دیکھتے ہی کہنے لگی: گھبراؤ نہیں کام چھ دن میں پورا ہو جائے گا اور اتنا ہی سے تو تمہارے پاس ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ میں اتنے کم وقت میں تو یہ کام کر ہی نہیں سکتی، پر تم جانو میرا تو جیون ہی ان گڑیوں کو کھڑا کرتے اور ٹکاتے بیتا ہے اور ان کے بھروسے اور سہارے تو میرا جیون چل رہا ہے جو یہ نہ ہوں تو میں کہاں ہوں گی۔ یہی تو میرے وجود اور ہستی کی علامت ہیں، اگر میں ان کو جنم دینے سے انکار کر دوں، ان کی تخلیق سے ہاتھ کھینچ لوں تو پھر میں بھی تو نہیں رہوں گی نا۔ یہ کہہ رہی تھی اور اس کے ہاتھ تیزی سے کپڑے کے جھول کو سینے میں مصروف تھے، اس کو یہ تک نہ خیال تھا کہ کہیں اس کی انگلی میں سوئی نہ چبھ جائے۔

☆ ☆ ☆

MashalBooks.org

گجراتی افسانہ

دھواں

ایلا مہتہ

"با"۔۔۔۔۔آج شام پانچ بجے والی ٹرین سے واپس آ رہی ہیں۔شوبھا نے کلائی والی گھڑی پر نظر ڈالی۔ابھی تو چار ہی بجے ہیں۔ایک گھنٹہ پڑا ہے۔ایک اتھاہ اور گہرے خلا کے احساس کا ساگر موجیں مار رہا تھا اور وہ ان موجوں کی لپیٹ میں گھری ہوئی تھی۔اب کچھ کرنے کو باقی تو تھا نہیں۔ایک انتظار کے سوا۔

میز پر پڑی کتابوں کے ڈھیر میں سے اس نے انگریزی کی ایک کتاب اٹھالی۔پہلے ہی صفحے پر ایک بالکل ننگی عورت کی تصویر تھی۔خالص طبی اور جراحی کے نقطۂ نظر اور مقصد سے بنائی ہوئی یہ تصویر مصور کی چابکدستی اور مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھی کہ بدن کا ایک ایک رونگٹا واضح اور نمایاں تھا۔اس نے کتاب کو زور سے بند کر کے میز پر پٹخ دیا۔کمرے سے نکل کر بالکنی میں جا کھڑی ہوئی۔تیسرے پہر کی چلچلاتی دھوپ یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی تھی۔اس کی حدت اور تمازت ہر ہر کونے کھدرے اور چیز کے جگر تک اتری ہوئی تھی۔اس پورے ماحول پر دھوپ اس طرح پھیلی ہوئی ہے جیسے میرے اندر اور باہر چھایا ہوا اتھاہ اور بیکراں سناٹا، میری رگ رگ میں اترا جا رہا ہے۔۔۔۔وہ سوچتی رہی اور یہ خلا عام کھوکھلا پن نہیں ہے۔بلکہ ٹھوس کثیف اور نہ سمجھ میں آنے والا احساس ہے۔بس اب شفق پھولنے ہی کو ہے پھر شام کا یہ زنگاری روپ بھی اوجھل ہو جائے گا۔گھور اور کالی رات کے اندھیرے چاروں اور اترنے لگیں گے۔ایک مدہم سی تھکی تھکی مسکان ہونٹوں پر لئے وہ نیچے اتر آئی تھی۔

ساڑھے چار کے قریب اپنی کار اسٹیشن کی طرف لے جاتے ہوئے ڈاکٹر شوبھا نے

اپنے آپ کو ملامت کی۔ "اب تم نیوراٹک ہوتی جا رہی ہو شوبھا۔ اب تو یہ سورج، سورج نہیں ایک کالی ٹکیہ ہی دکھائی دیتا ہے"۔

ایک دم ہی جیسے پیٹ میں ایک گولہ سا گھوم گیا۔ یہ سوچ کر کہ پتہ نہیں گھر بالکل ٹھیک ٹھاک تو تھا کہ نہیں۔ ہر چیز اپنی جگہ پر تو ہے نا۔۔۔۔ خیال ہی خیال میں اس نے گھر کا جائزہ لیا۔ آٹومیٹک طور پر چلتی ہوئی فلم کی طرح ایک ایک کمرہ پوری صفائی ستھرائی اور سجاوٹ کے ساتھ سامنے آتا رہا۔ کونہ کونہ آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ ایک دم صاف ستھرا۔ پھر بھی کوئی نا کوئی بھول چوک تو ہو ہی گئی ہوگی۔ سچی بات یہ ہے کہ کلینک اور پریکٹس کی مصروفیتیں اس کے اور اس کی گرہستی کے درمیان حائل رہتی تھیں۔ اس کی ساس کو ہر بات کا پتہ رہتا تھا۔ ہر چیز پر ان کی نگاہ رہتی تھی۔ ہر طرح کی کوتاہی اور کمی کی خبر رہتی تھی اور اس کو تو بس تھوڑا سا ہی تو وقت ملتا تھا ستانے اور کمر ٹکانے کا۔ چلو خیر جب تک "با" کو پتہ نہ چلے تب تک ہی غنیمت ہے۔

گاڑی چلاتے چلاتے ایک دم ایک ہول سی اٹھی۔ جیسے پیٹ کی گہرائیوں سے برف کی ٹھنڈی یخ سلاخ ابھر کر چلتی چلتی حلق میں آ کر اٹک گئی ہو۔ جھرجھری سی آئی۔ ایک اور ہاتھ پیر ٹھنڈا کر دینے والے خیال نے اس کو بوکھلا دیا۔ "باپ رے! بڑی بھول ہوگئی سبود کی فوٹو پر سے دھول صاف کرنا تو یاد ہی نہ رہا اور تصویر کے فریم پر ڈالا ہوا پھولوں کا ہار تو سوکھ کر کھڑنک ہو گیا تھا۔ مرجھائے ہوئے ہار کو اتار کر تازہ تازہ پھولوں کا ہار ڈالنا تو یاد ہی نہیں اور اس کے ساتھ ہی تو باپو جی کا فوٹو ہے اور "با" کا تو یہ ہے نا کہ باہر سے آتے ہی سیدھی اسی طرف جاتی ہیں۔

خشک ہار کی پیلی اور مرجھائی ہوئی پتیوں کے ہالے میں سبود کی سیاہ اور سفید تصویر میں اس کا سدا مسکراتا ہو مکھڑا، بالکل ایسا ہی ہے جیسے پچھلے برس کے دیوالی کارڈ پر چھپا ہوا کرشن مہاراج کا مکھڑا۔ وہی کارڈ جو اب ردی کاغذوں کے ڈھیر میں سب سے اوپر پڑا ہوا ہے۔

اس خیال کے ساتھ ہی ایک اور بات یاد آ گئی، ایسی کہ شوبھا کے ہاتھ بڑی مشکل سے ہی اسٹیئرنگ پر قابو رکھ سکے۔

"وہ ایش ٹرے، اس کی راکھ۔۔۔۔۔ وہ ٹیلی فون کے پیچھے رکھی ہوئی کم بخت ایش ٹرے۔ نہیں معلوم کہ صاف بھی کر دی تھی کہ نہیں۔ بھئی وہ اس میں چند روز ٹیلی فون پر بیٹھ کر باتیں کرتے کرتے بے تحاشہ سگریٹ پیتی اور راکھ جھاڑتی رہی تھی نا"۔

اب فرض کرو کہ "با "یہ پوچھ بیٹھیں کہ "یہ یہاں ٹیلی فون کے پیچھے ایش ٹرے رکھنے کی ضرورت کیا تھی؟ "اف کیا کروں !ہے رام اب اتنا سمے کہاں کہ گھر واپس جاؤں اور ٹیلی فون کے پیچھے رکھی ایش ٹرے ہٹا کر کہیں اور رکھ دوں۔

مجبوراً گاڑی چلتی رہی، وہ کار پارک میں چھوڑ کر اسٹیشن کے اندر داخل ہو گئی۔

ٹرین بالکل ٹھیک وقت پر پہنچ گئی، سامان گاڑی میں رکھ دیا گیا۔شوبھا اسٹیرنگ وہیل سنبھال کر خاموشی سے بیٹھ گئی تو "با "برابر والی سیٹ پر بیٹھ چکی تھیں۔ایک دوسرے میں گتھے ہوئے اور بالکل جام ٹریفک میں سے بچ بچا کر نکلنے کی کوشش میں لگا تار ہارن دینے اور رہ رہ کر بریک لگانے کے ساتھ ساتھ چیونٹی کی چال سے رینگ رینگ کر گاڑی کو نکال کر اپنے راستے پر ڈالنے کے داؤں پیچ کا اسے اچھی طرح تجربہ تھا۔سو اس وقت بھی ٹریفک کے شکنجے میں پھنسی گاڑی کو بخیر و عافیت نکال لے ہی گئی۔بالکل مکینکل انداز میں۔

پورے راستے "با "بولتی رہیں۔جواباً وہ بولتی رہی۔اس کی آواز اور باتوں کو سن کر ہی "با " کو ایسا لگا جیسے سفر کی ساری تھکن اور بے آرامی دور ہو گئی۔باتوں کی رو نے شوبھا کے چہرے کو دمکا دیا تھا۔ایک رونق سی آ گئی تھی منہ پر۔شوبھا کی باتیں تو کنبے اور پریوار ہی کے گرد گھومتی تھیں یہ تو اس کا سدا کا دستور تھا، اس کا تو ہر کام ہی حسب معمول اور ایک ڈھرے پر ہی ہوا کرتا تھا۔کنبے اور پریوار کی بات کا ہندوستان میں یہ ہے کہ اس کی کوئی انت نہیں ہوتی جیسے کنبے برادری کی لمبائی اور پھیلاؤ لمبا چوڑا ویسے ہی ان کی بات چل پڑے تو بالکل ہی اپنے پریوار سے چلتی چلتی خلاؤں چچیوں، پھوپھیوں، ممانیوں سے بڑھتی بڑھتی بھانجے بھانجی اور بھتیجا بھتیجی سے بھی آگے رشتوں ناتوں بلکہ ناتے پرناتے پر بھی پہنچ کر رکتی نہیں۔حد یہ کہ دور پرے کے وہ کنبے ناتے دار تک زیر بحث آ جاتے ہیں جو کبھی کبھار صرف شادی غمی کے موقع ہی پر نظر آتے ہیں۔

کار سڑک پر دوڑی چلی جا رہی تھی۔خیر اس کو تو دوڑتے ہی رہنا تھا۔"با "کے منہ سے نکلی ہوئی باتوں کے بول کار کی کھڑکی کے شیشوں کے باہر نکل نکل کر تیسرے پہر کی شام کی ہوا کے ساتھ اڑے چلے جا رہے تھے۔شوبھا اب بالکل چپ تھی۔۔۔۔۔اس کا دھیان تو دور کہیں ٹیلی فون کے پیچھے پڑی سگریٹوں کی راکھ سے بھری ایش ٹرے کی راکھ میں سے ہوا کے ساتھ ساتھ اڑتی دھول کی طرف تھا۔

آخر کو گھر آ ہی گیا۔۔۔۔۔گاڑی رو کتے ہی ملازم کو بلانے کے لئے دو لگا تار ہارن دیئے، تا کہ وہ سامان اتار کر اندر لے جائے اور خود با کا انتظار کئے بنا ہی گاڑی سے نکل سیڑھیاں لانگھتی پھلانگتی ٹیلی فون تک جا پہنچی۔ ارے ایش ٹرے تو غائب ہے۔ اچھا خیر بھاڑ میں جائے، ہوگی کہیں۔ ارے بھئی خود ہی تو میں نے صبح صبح وہاں سے اٹھا کر الماری میں چھپا دی تھی۔

گاڑی سے اترتے ہی "با "سیدھی تصویروں کی طرف چلی گئی تھیں۔ بابو جی اور سبود۔۔۔۔ دھول کے غبار تلے چھپے مسکراتے تھے۔ شوبھا کو دلہن بن کر اس گھر کی چوکھٹ پر اترے چار ماہ ہی گزرے تھے کہ بابو جی اور سبود دونوں کا اکٹھے ہی ٹریفک کے حادثے میں دیہانت ہو گیا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ بلوری شیشے کا ایک تازہ تازہ نئے شگوفوں سے سجا ہوا گلدان زمین پر گر کر چور چور ہو گیا تھا۔ بس شیشے کے ان ہی ان گنت بے شمار کرچیوں کی طرح وہ اپنے جیون کے ہر ہر لمحہ کو چن چن کر سمیٹتی رہی تھی۔ ایک طرف ڈال دینے کے لئے۔

"با "نے بڑے دھیان اور پیار سے تصویروں پر جمی دھول کو صاف کیا۔ پھر فرش پر ماتھا ٹیک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر اٹھ کر شوبھا کی طرف مڑ کر دھیمی سی ملامت انگیز آواز میں بولی: "شوبھا پیاری اس تصویر پر اتنی ڈھیر ساری دھول کہاں سے لا کر جمع کر دی۔ یقیناً تم کو تازہ پھول ڈالنا اور سارے طور طریق تو یاد ہی رہے ہوں گے"۔

آدمی کام نہ کرنے کے سو بہانے تراش لیتا ہے، بیماری کے، ملاقاتیوں کے آنے اور ایسے ہی دوسرے عذر کر سکتا ہے۔ پر شوبھا کو الفاظ مل ہی نہ سکے، وہ چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گئی۔

بالکنی کے جنگلے سے ٹیک لگائے کھڑی سوچ رہی تھی اب "با "اشنان کرنے اور دھونے دھلانے میں لگی ہوں گی۔ اچانک ہی اس کی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان چل سی ہونے لگی، ایک تیز خواہش کے تحت معلوم ہوا تھا کہ اس کی انگلی اور انگوٹھے کی رگ رگ تڑپ رہی ہے۔ دھڑک رہی ہے۔

رہ نہ سکی تو بھاگ کر کمرے کے اندر گئی سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگا لیا۔ جلدی دو چار کش لئے بھوکے ٹوٹے کی طرح بے صبری سے۔ ہائے رام ! کیسی لالسا ہوتی ہے۔ جیسے کسی پیاسے کو پانی پی کر تسکین ہو جاتی ہے"۔

ایک سگریٹ پھونک چکی تو اسی کے جلتے ہوئے ٹکڑے سے دوسرا سگریٹ جلا لیا۔۔۔۔۔اب یہ دوسرا بھی "با " کے باہر آنے سے پہلے پہلے ختم ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ اس نے کھڑے کھڑے ہی تیزی سے سوٹے لگانے اور گہرے گہرے کش کھینچنے شروع کر دیئے۔

پر سوچنے کی بات ہے یہ چوری چھپے کام کب تک چلے گا اور کب تک یہ راز اس کی ساس کی نظروں پر آشکار نہ ہوگا۔ آخر کب تک چوری چوری کام چلے گا۔۔۔۔۔کلینک !ہاں خیر کلینک میں بیٹھ کر تو آرام سے پیا جا سکتا ہے۔ پر یہ دھڑکا تو پھر بھی رہے گا نا کہ نہ جانے کب "با " ٹہلتی ہوئی منہ اٹھائے آنکلیں۔

غسل خانے کے دروازے کی چٹخنی کھلنے کی آواز نے اس کے خیال کے تسلسل کو توڑ دیا۔ جلدی سے سگریٹ پھینک کر کنکھیوں سے ادھر دیکھا "با "ابھی اندر ہی تھیں۔ باہر نہیں آئی تھیں۔ اطمینان کی گہری سانس لے کر قریب والے بید کے صوفے میں دھنس گئی۔ اف توبہ ہے۔۔۔۔۔ یہ زندگی۔۔۔۔۔اس کا بے انت پھیلاؤ اور کٹھورتا۔۔۔۔۔وقت لمحہ لمحہ سیکنڈ سیکنڈ گزرتا رہتا ہے اور پھر یہ کہ دنیا کی کوئی طاقت دھکا دے کر اسے پیچھے نہیں کر سکتی۔ آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتی۔اف۔۔۔۔۔۔یہ وقت۔۔۔۔۔

اچانک تھکن کی ایک لہر اس کے اندر اٹھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ میلوں پیدل چل کر آئی ہو اور سر پر بھاری بوجھ اٹھائے بھاری قدموں چلتی ہوئی تھکن سے چور، چور۔۔۔۔۔اب کچھ کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا بس یوں ہی بیٹھی رہے، سگریٹ ہاتھ میں لے کر۔

"آج کیا کلینک نہیں جانا تمہی ں؟" "با " کی آواز سنائی دی۔

"بس اب جا رہی ہوں"۔ پرس اٹھا کر اس کا کھٹکا بند کیا۔ پر اسی طرح صوفے میں دھنسی بیٹھی رہی۔ کلینک کا مستقبل مایوس کن تھا، اس کے خیال سے ہی وحشت ہو رہی تھی۔

وہاں آ کر اس کے انتظار میں بیٹھنے والوں کی صورتوں پر افسردگی اور مایوسی برستی ہوئی دیکھی۔ کچھ تو جینے کا آسرا بھی چھوڑ بیٹھے تھے۔ ان کے بارے میں سوچنا تو فنا اور عدم کی وادی میں اترنے کے برابر تھا۔ ہر طرف یہی صدائیں سننے میں آتی تھیں: "ڈاکٹر میرے حلق سے تو ایک بھورا بھی نہیں اترتا۔ کچھ بھی تو نہیں کھایا جاتا، کل سے سو ڈگری بخار ہے تپ چڑھی ہوئی ہے، پیر کی سوجن تو ذرا بھی کم نہیں ہوئی"۔ کچھ گلے پھولے ہوئے غدودوں کی وجہ سے گرگرا رہے تھے۔ کچھ

گلٹیاں اور ٹیومر ایسے جان لیوا تھے کہ جیتے جی جان چھوڑنے والے نہ تھے۔ معالج اور مرض کے درمیان مسلسل رسہ کشی جاری تھی۔

ایک لمبی اور گہری سانس لے کر وہ اٹھنے ہی کو تھی کہ ادھر سے "با "آ نکلیں، شوبھا کو بیٹھا دیکھ کر انہوں نے بید کی کرسی کھینچ کر صوفے کے سامنے کر لی اور اس پر بیٹھ گئیں۔

"ارے شوبھا کیا زوردار بیاہ تھا۔ سچ بڑا مزا آیا۔ اب دیکھو نا۔۔۔۔ میں نے کتنے سال بعد کوئی بیاہ دیکھا ہے، بس تمہاری شادی کے بعد پہلی بار گئی ہوں۔ تمہارے نہ جانے کا ماما جی کو بڑا دکھ تھا۔ میں نے تو ان کو بہت سمجھایا کہ بھئی وہ ڈاکٹر ہے اور اس کو اپنے کام کی بڑی لگن ہے۔۔۔۔ اپنے مریضوں کی چنتا ہی لگی رہتی ہے ہر دم اور کہاں یہ کہ وہ اس سب کو چھوڑ کر یہاں چلی آتی۔۔۔۔۔ کیوں ٹھیک کہا نا میں نے؟ ہاں تو کوئی جھوٹ تو نہیں کہا"۔

لو۔۔۔۔۔ اب ان کی بات کا جواب دو۔۔۔۔۔"با "اپنی بات پوری کر کے اس کی طرف سے کسی جواب یا کسی بھی بات کی منتظر تھیں۔ ٹھیک بات ہے نا کہ بات کا جواب بات سے دیا جائے، بھئی ایک نے کوئی بات اٹھائی دوسرے نے بات میں بات نکالی۔ یہ سوال جواب دھر پٹخ، لینا دینا نہ ہو تو گھر تو بس گھر ہی نہ رہے۔ جمی ہوئی ٹھٹڑی ہوئی برف کی سل بن کر رہ جائے۔ ایک مصور کی پہلودار اسٹل لائف کی تصویر کی طرح، سو جواب میں کچھ کہنا لازم ٹھیرا تو اس نے بات کی۔ خاموشی کے وقفے کو توڑا تو آواز کی جھنکار کچھ زیادہ ہی تھی۔۔۔۔۔ "دلہن بن کر کیسی لگ رہی تھی۔۔۔۔ اندو۔۔۔۔۔۔۔ بہت بھاری جوڑا پہنا تھا؟"

"ہاں۔۔۔۔۔ ہاں تو اور کیا۔۔۔۔۔ اور انہوں نے وہ میک اپ کرنے والی لڑکی گھر بلائی تھی، پورے سو روپئے لئے اس نے پرواہ کیا میک اپ کیا تھا۔ اندو تو گڑیا لگ رہی تھی"۔

"با "نے بات کرتے کرتے زبان روک لی اور پھر سنبھل کر بولیں: "پتہ ہے شوبھا۔۔۔۔ کبھی کبھی مجھے بڑی ہنسی آتی ہے۔ یہ سوچ کر کہ یہ جو ماڈرن لڑکیاں ہیں نا یہ سب کی سب گڑیائیں ہی تو لگتی ہیں۔ رتی برابر جو ان میں کوئی آئیڈیلزم ہو۔ بالکل بے آدرش۔ گھٹیا خیالات کوئی سوجھ بوجھ ہوتی ہی نہیں"۔

شوبھا شام کے سناٹے میں گھلتی تاریکی کو گھورتی رہی۔ شام کے سائے تیزی سے دھرتی پر اترتے چلے آرہے تھے اور اس کی نگاہیں تاریکی کے قلب میں گھسی جا رہی تھیں۔

"اچھا اب اٹھو چلو تم کو دیر ہو رہی ہے"۔ "با " نے کہا۔

شوبھا نے خاموشی سے اٹھ کر زینے کے کٹھرے کا سہارا لیا اور دھیرے دھیرے زینہ اترنے لگی۔ سیڑھیاں اتر کر وہ گھر سے باہر آ گئی۔ گاڑی میں بیٹھ کر کار اسٹارٹ کرتے کرتے رک گئی۔ کچھ سوچ کر انجن بند کر دیا۔ "چلو آج پیدل ہی کلینک چلتے ہیں، ٹہلتے ہوئے"۔ کلینک گھر سے اتنی دور تو نہ تھا اور آج اس کا جی بھی نہ چاہ رہا تھا گاڑی چلانے کو۔

کلینک میں مریضوں کا ہجوم اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے بھیڑ سی لگی ہوئی تھی۔ ایک نظر ان کی طرف ڈالتے ہوئے آگے بڑھی تو سب سے پیچھے ادھیڑ عمر کا صاف ستھرے اور معقول لباس میں جو شخص بیٹھا تھا، اس کو دیکھتے ہی مسکرا کر بولا۔ "میں بڑی دیر سے آپ کے انتظار میں بیٹھا ہوں۔۔۔۔"

دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں تو شوبھا نے بھی جواب میں کچھ کہنے کے بجائے مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔ الفاظ کا سہارا لئے بغیر ہی جیسے بات ہو گئی۔۔۔۔۔ خوف کی ایک لہر شوبھا کے اندر دوڑ گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ شخص اس کی سوچ اور دلی خیالات کو پڑھ سکتا ہے، بڑی آسانی سے جان سکتا ہے۔ جلدی سے اس نے اپنی نظریں دوسری طرف پھیر لیں اور اپنی کرسی پر تن کر سیدھی بیٹھ کر اس نے معذرت کے طور پر کہا۔ "مجھے افسوس ہے مجھے دیر ہو گئی"۔ بات بہت معمولی تھی پر ایک خاص خشک لہجے اور اونچی آواز میں جیسے کسی کو سنا کر کہہ رہی ہو۔ ایک کے بعد ایک مریض اس کے پاس آتے گئے کسی کو اس نے کہا کہ کسی اسپشیلسٹ سے مشورہ کرے، کسی کو ایکسرے اتروانے کی ہدایت کی اور بعض کو صرف اسپرین استعمال کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ سب اس کے روزمرہ دستور کا حصہ تھا اور مریضوں کی قطار کے پیچھے۔ سب سے آخر میں بیٹھے شخص کی مسکراتی ہوئی نظریں جیسے اس کو تقویت دیتی اور اعتماد اور حوصلے کی روسی برقی قوت کی طرح بجتی رہتی۔ تاہم اس کے اندر ہی اندر ایک اور موج اور رو بھی چڑچڑاہٹ، بے دلی اور تھکن سے بھرپور جاری رہتی اور ایک خیال اور خواہش کے تحت وہ اس سب کو نظر انداز کر دینا چاہتی تھی۔

چوری چوری وہ اس کی طرف دیکھتی۔ وہ اس کو اپنے اور دیکھتے پا کر مسکراتا تو وہ بوکھلا جاتی، اس کی مسکراہٹ سے اس کو عجیب سا دکھ محسوس ہوتا۔ کبھی یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے اردگرد پھلجھڑیاں سی چھوٹتی ہوں جیسے کوئی شریر سا بچہ پھلجڑی ہاتھ میں لئے اس کو گھما رہا ہو، زور زور سے

اور وہ اس میں جھڑتے آگ کے چمکتے پھولوں اور جگنوؤں کے گھیرے میں آ گئی ہو۔

زیادہ تر مریض جا چکے تھے اور اب اس کی باری تھی۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر وہ میز کی طرف گیا۔ اچانک ہی شوبھا کے اندر سگریٹ کی طلب شدت سے انگڑائیاں لینے لگی، اپنی انگلیوں سے ایک سگریٹ کھینچ کر نکالا، وہ فورا اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے لائٹر سے اس کا سگریٹ سلگایا۔۔۔۔۔

"شکریہ"

تب وہ اس کے سامنے والی کرسی پر جم کر بیٹھ گیا۔

"لتیکا کل رات سے بڑی بیمار ہے ڈاکٹر۔ کیا آپ کرپا کر کے اس کو دیکھنے چلیں گی؟"

اس کی آواز میں بھی اس کی مسکراہٹ کی طرح ہراساں اور سراسیمہ کر دینے والا آسیبی اسرار تھا۔ یہ بات اس نے اتنے دھیرج اور نرمی سے کہی تھی۔ تاہم دعوت اسی ایک اشارے ایک کنائے میں چھپی تھی۔ یہ لہجہ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ اس کی بات ضرور مان لی جائے گی۔ ان کہے بولوں اور شبدوں کی تہہ میں چھپی یہ بات جیسے کہتا ہو کہ مجھے سب پتہ ہے ہاں میں اچھی طرح جانتا ہوں۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "آؤ چلتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ ایک دو دن اور دیکھتے ہیں پھر ہو سکتا ہے کہ کسی اسپشیلسٹ سے مشورہ لینا پڑے"۔

اس نے شوبھا کا کالا بیگ اٹھا لیا اور اپنی گاڑی کی طرف چل دیا۔ آگے بڑھ کر اس کے لئے کار کا دروازہ کھول دیا، تھوڑے سے توقف کے بعد وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ بڑی نرمی اور دھیرج سے دروازہ بند کر کے اسٹیرینگ پر بیٹھ گیا۔

ویسے تو لتیکا ابھی تک ٹھیک نہ ہوئی تھی پر یہ حال بھی نہ تھا کہ ڈاکٹر کو گھر بلایا جائے۔ اس کے باوجود شوبھا نے ساری شام لمبے عرصے سے بیمار بوڑھی کنواری خاتون اور اس کے کنوارے بھائی کے ساتھ گزاری۔ دونوں نے مل کر اپنی حد بھر اس کی شام کو رنگین اور روشن کرنے کی کوشش کی۔ بڑی دیر وہ بیٹھی بھائی بہن کی سیدھی سادھی بہتی ندی کے دھارے کی طرح مسلسل بے تحاشہ چٹ پٹی باتوں کے مزے لیتی رہی۔ ایسی مزے دار باتیں جن کی جھنکار اور بازگشت ایک گھر کے در و دیوار میں جان ڈال دیتی ہے اور جن کی وجہ سے گھر گھر معلوم ہوتا ہے۔ ان باتوں

میں وہ اتنی مگن ہوگئی کہ اجنبی ہونے کا ڈر بھی زائل ہو گیا۔اب وہ ان کے درمیان بلاخوف وخطر بیٹھی تھی۔ان کے ساتھ باتوں نے اس کے گرد ایک مضبوط حصار تن دیا تھا کہ جیسے ریشم کے کوئے کے اندر وہ ریشم کے کیڑے کی طرح محفوظ ہوگئی ہے۔

"ڈاکٹر کرپا کر کے آج ہمارے ساتھ بھوجن کر لو"۔لتیکا نے بڑی لجاجت سے کہا۔۔۔ان کی بات پر شوبھا اچھل پڑی تھی۔

"ارے ساڑھے نو بج گئے۔"با "تو راہ دیکھ رہی ہوں گی۔واپس جو آ گئی ہیں"۔وہ ان سے معذرت کرنے لگی۔

"نہیں شکریہ۔۔۔۔بہت دیر ہوگئی ہے۔پھر کبھی سہی"۔

"بھئی مجھے آپ کے ٹیسٹ کا کوئی پتہ نہیں کہ کیا پسند ہے کیا نہیں۔ویسے میرے پاس باہر کے مختلف برانڈوں کے سگریٹ اور شرابیں رہتی ہیں"۔وہ کہنے لگا۔

"ارے نہیں۔۔۔۔یہ تو کبھی کبھار ہی کا شغل ہے"۔منہ ہی منہ میں کہتی ہوئی وہ ٹیلی فون کی طرف مڑ گئی۔کلینک پر فون کر کے کمپاؤنڈر کو ہدایت کی کہ " کلینک بند کر دے،آج اتنا ہی کافی ہے۔۔۔ "اب وہ بہت گھبرائی ہوئی اور ڈری ہوئی تھی۔اتنی دیر لگا دی اس نے۔ایسے فضول بے کار ہنسی ٹھٹھوں میں۔۔۔۔بے ضرورت لطیفے اور باتیں۔۔۔۔۔سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کو ایسا لگ رہا تھا کہ وہ زندہ ہوتی جا رہی ہے۔زندگی اس کے اندر از سر نو داخل ہو رہی ہے۔یہی تو وہ چاہتی نہیں تھی۔اپنے اندر انگڑائی لیتی ہوئی زندگی کی ذرا سی رمق بھی اس کو پریشان کر دیتی تھی۔

وہ اس کو اپنی کار پر گھر تک چھوڑنے آیا۔اس کا کالا بیگ اٹھا کر اس کے پیچھے زینہ چڑھنے لگا تو اس نے روک دیا۔

"نہیں۔۔۔۔۔بس شکریہ۔۔۔۔۔"

اپنی جگہ سے ہلے بغیر بڑی نرمی اور ملائمت سے اس شخص نے پوچھا:"تو کیا آپ کے دوبارہ بلانے کے لئے دیدی کو پھر بیمار پڑنا ہوگا۔ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ پھر بھی چکر لگائیں، صرف ملنے کے لئے۔۔۔۔ہم نے واقعی آپ کی اس ملاقات کو بڑا انجوائے کیا۔بات یہ ہے کہ ہم دونوں بہت اکیلے اور تنہا ہیں"۔

اب وہ زیادہ دیر یہاں رک نہیں سکتی تھی۔ منہ ہی منہ میں۔ "ہاں کیوں نہیں یقیناً۔۔۔۔ " کہتی ہوئی تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی اوپر چلی گئی۔

گھر میں گھستے ہی دروازے پر ہی اگربتی کی خوشبو کا ایک بھپکا اس کے سواگت کو موجود تھا۔۔۔۔ وہ بیٹھک کے کمرے میں داخل ہوگئی، میز پر رکھی سبود اور باپو جی کی تصویروں کے فریموں پر پھولوں کے موٹے موٹے تازہ ہار پڑے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے اگربتیوں کا ایک پورا گچھا جل رہا تھا۔ پوری فضا اور کمرے کا ماحول خوشبودار دھوئیں کے مرغولوں کی لپیٹ میں بڑا بوجھل بوجھل سا ہو رہا تھا۔ تصویروں کی طرف منہ کئے بیٹھی "با" گیتا کا پاٹھ کرنے میں مصروف تھیں۔

چپ چاپ آہستہ سے وہاں سے گزرتی ہوئی وہ اپنے بیڈروم کی طرف چلی گئی۔ اپنے پرس میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور الماری میں چھپا دیا اور غسل خانے میں جا کر خوب اچھی طرح ہاتھ منہ دھویا۔ اینٹی سپٹک کی کلیاں کیں اور بیٹھک میں واپس آ گئی۔ "با" اب گیتا کا پاٹھ ختم کر چکی تھیں۔

"میں ایک مریض کو دیکھنے چلی گئی تھی، وہاں دیر ہوگئی"۔ یہ کہتے ہوئے وہ کھانے بیٹھ گئی۔

اچانک ہی "با" کے ہاتھ جہاں کے تہاں معلق رہ گئے۔ شوبھا کو یاد آ گیا وہ اچھل کر سبود کی تصویر کے آگے جا کھڑی ہوئی۔ سبود اس کے سامنے مسکرا رہا تھا۔ بے جان اور بہت دور دراز سے آتی ہوئی مسکان، تازہ اور شاداب پھولوں کے حلقے میں آتی ہوئی مردہ اور دور افتادہ مسکان۔ جب وہ دونوں کھانا کھا رہی تھیں تو "با" مستقل باتیں کئے چلی جا رہی تھیں۔ پر شوبھا کے کانوں کے پار مشکل سے ہی کوئی کوئی بات جا پا رہی تھی۔ وہ تو جیسے اب تک لتیکا ہی کے گھر بیٹھی تھی۔ آفٹر شیو لوشن کی تیز خوشبو ہلکے پھلکے قہقہے۔۔۔۔ "آپ دیکھیں نا۔۔۔۔ ہم کتنے اکیلے ہیں۔۔۔۔ " اس کی آنکھیں اس کے منہ سے نکلنے والے شبد۔۔۔۔ وہ تو ابھی تک اسی سب کے درمیان موجود تھی یہی کچھ اس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں، یہی کچھ اس کے کان سن رہے تھے۔

"ارے ہم تو بالکل اکیلے ہیں"۔ اور یہ الفاظ اس نے صاف طور پر اپنے کانوں سے

MashalBooks.org

سنے تو اچھل پڑی، حیران رہ گئی ارے یہ تو "با " کہہ رہی تھیں۔ اس نے ان کی طرف دیکھا۔ ہاں وہی تو تھیں اب تک بولے ہی چلی جا رہی تھیں۔

"ارے یہی تو میں نے تمہارے ماما جی سے کہا۔ آپ ہماری چنتا نہ کریں بھیا۔۔۔۔ تو کیا ہوا جو ہم اکیلے ہیں۔ میں اور میری شوبھا تو سارے جگ سے ہی نیارے ہیں"۔ شوبھا نے کھاتے کھاتے پلیٹ کو گھورا۔ "با " کہہ رہی تھیں:

"ارے ماما تو تیری بہت تعریف کرتے ہیں۔ ان کا تو منہ نہیں تھکتا تیری تعریف کرتے۔ وہ تو کہتے ہیں کہ شوبھا تو سنت سادھنی ہے۔ اس کا جیون تو ایک سلگتی ہوئی اگر بتی ہے کہ آپ جل رہی ہے اور دوسروں تک کیا پورے جگ کو اپنی مہک بانٹ رہی ہے۔ ارے وہ تو ستی ساوتری ہے"۔ یہ کہتے کہتے "با " کی آواز ٹوٹ گئی۔ شوبھا نے اپنی ساس کی طرف دیکھا اور تیوری چڑھالی۔ "با "اپنے سامنے والے کونے کو جس طرف تصویریں رکھی تھیں گھورنے لگیں۔ وہ تیزی سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

"با "نے فرش پر گری ہوئی کوئی چیز اٹھائی۔

"شوبھا یہ کیا؟" "با " کی آواز تڑخی ہوئی لگ رہی تھی۔ جیسے دھوپ میں تپتی ہوئی سوکھی پیاسی بنجر زمین تپتے تپتے ایک بار ہی تڑخنے اور چٹخنے لگتی ہے اور اس میں بڑے بڑے شگاف پڑنے لگتے ہیں۔ اپنی لرزتی ناتواں انگلیوں سے اس نے جلے ہوئے سگرٹ کا ٹوٹا اٹھالیا۔

(گجراتی زبان سے سیما شرما نے انگریزی میں ترجمہ کیا)

☆ ☆ ☆

ہندی

ایک چھوٹا سا المیہ

مرنال پانڈے

ٹھوکر مار کر دروازہ کھولا تو دہلیز پر ایک خط پڑا ہوا تھا، وہی نفیس اور خوشخط لکھائی۔ مکڑی کے جالے کی سی باریک باریک لکھائی۔ ماں کے سوا کسی اور کی ہو ہی نہیں سکتی۔ ماں کا خط شروع سے آخر تک خوشی اور شادمانی کا ایسا ابلتا ہوا فوارہ ہوا کرتا جس کی پھوہار میں ننھے ننھے نازک سے بلبلے بنتے اور ٹوٹ ٹوٹ کر ابھرتے ہوں۔ پھلجھڑیاں سی چھوٹتی تھیں۔ امیدوں اور خوش آئند توقعات کی۔ ایک ایسا تانا بانا سا تن دیا کرتی تھیں کہ جس میں کوئی جھری اور کوئی سوراخ بھی نہ ہوتا۔

میں نے کتابیں میز پر ڈالیں اور جڑ سے اکھڑے پیڑ کی طرح دھم سے بستر پر گر گئی۔
ماں کے خط کی بھی عجب بات تھی کہ بڑے ڈرامائی اور تھیٹرانہ انداز میں مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل یا اس کا سرا تو مل ہی جاتا تھا اور یہ بات بھی ہے کہ ہر بات اور مسئلہ ایک انتہا تک پہنچ کر خود بخود حل یا ختم ہو جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ پروفیسر اور قانون دانوں تک کو اس تھکی ماندی بستی کا ماحول ناقابل برداشت لگنے لگتا ہے، خاص طور پر فروری کے اجاڑ اور خاک بہ سر دنوں میں، مگر پھر اس کا بھی ایک انجام ہوتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ وحشت اور دہشت کا وہ عالم بھی کم ہوتے ہوتے بالکل ہی معدوم ہو جاتا ہے۔

"ہائے امتحان ۔۔۔۔۔ ہائے امتحان !" میں نے ترنگ میں آ کر گانا شروع کر دیا۔

MashalBooks.org

میرے دریچے کے اس طرف گل مہر اور سیجھسیل پر بہار آئی ہوئی تھی، ان کے کھلتے ہوئے پھولوں نے شام کو رنگین کر دیا تھا۔ ماحول کی اداسیوں اور وحشت کے باوجود۔ بس ایک نگاہ ڈالنے کی دیر ہوتی کہ بوجھل من پر طاری سارا خوف، تمام وحشت اور دہشت جیسے ایک دم ہی زائل اور غائب ہو جاتا۔ اندر سے حال ہی اور ہو جاتا کہ من کچھ سوچ رہا ہوتا، پاؤں کسی اور ہی اور کو اٹھ رہے ہوتے ہیں۔ جیسے اندر سے میرا پورا آپ پکارتا ہو، ایک مرد چاہیے، ایک مرد۔۔۔۔ ہائے مرد۔۔۔۔۔ ہائے مرد۔۔۔۔۔ جیسے اندر اور باہر کا سارا وجود گا اٹھتا ہو۔

پر اس سمے تو میری حس مزاح جاگ اٹھی ہے اور میں نے اپنے چھوٹے چھوٹے سندر سندر تھکے ہوئے پاؤں اٹھا کر دیوار کے ساتھ ٹکا کر اس طرح آگے پیچھے کرنا شروع کر دیئے ہیں کہ جیسے وہ کسی تال اور گت کے ساتھ تھرک رہے ہوں۔ اسی چھوٹی سی کومل سی دھن پر گنگناتے ہوئے۔ میں نے ماں کا خط کھولا۔۔۔۔ ماں کا پریم پتر سدا کی طرح ان گنت خبروں سے لدا پھندا سامنے تھا۔ وہی ماں کا اپنا مخصوص اسٹائل، ایک ہی سانس میں اوپر تلے بے شمار باتیں اور خبریں، کسی کا اور چھور دوسری سے نہ ملتا ہو۔ بس ڈھیروں ڈھیر بوکھلا دینے والی خبریں۔ بس جو بات بھی دھیان میں آ گئی وہی لکھ ڈالی پھر کچھ اور یاد آ گیا تو وہی لکھ چھوڑا۔ پھر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد یہ کہ امید ہے کہ چھٹیوں میں گھر آنے کے لئے ٹرین میں اپنی سیٹ تو بک کروا لی ہوگی۔ یقیناً۔۔۔۔ امید ہے کہ تم اپنے کھانے پینے کا خیال تو کرتی ہوگی اور آشا کرتی ہوں کہ اس مرتبہ تو اپنی پڑھائی پر پورا پورا دھیان دے رہی ہوگی۔

بس وہی ایک رٹ۔۔۔۔ آشا۔۔۔۔۔ آشا۔۔۔۔۔ آشا۔۔۔۔۔ اس نے خط کو مٹھی میں مسوس کر گولہ سا بنایا اور ایک طرف کو اچھال کر آئینہ اٹھا لیا۔ پھر اس کے سامنے منہ کر کے زبان نکال دی۔ بات یہ ہے کہ اگر آپ کا مزاج بگڑا ہوا ہو تو اس سے بہتر ترکیب ہو نہیں سکتی کہ آپ اپنی بوتھی پر نظر ڈال لیں اور اپنے حال زار پر خود ہی ترس کھا لیں۔ اس طرح آئینے کے آگے اپنے آپ کو منہ چڑا کر اپنی طرف زبان نکال کر اپنی ذات اور اپنے آپ پر بھروسہ اور وشواس بڑھ جاتا ہے۔ اس احساس سے کہ کسی نے آپ کے سامنے زبان نکالی، منہ چڑایا۔ پر آپ نے کچھ نہ کہا۔ صبر کیا اور یہ بات آپ کے اندر بڑی شکتی بڑا وشواس پیدا کر دیتی ہے اپنی ذات پر۔

ٹن۔۔۔۔ ٹن۔۔۔۔ ٹن۔۔۔۔ دوپہر کے کھانے کی گھنٹی کی آواز۔ کھنکتی ہوئی اور

بالکل ہی تازہ دم ہے۔ حالانکہ پیتل کے گول گھنٹے کو بجانے والی لکڑی کی موگیری پر جا بجا سیاہ گڑھے پیتل کے گول گھنٹے کی رگڑ کھا کھا کر۔۔۔۔۔ چہرے کے مہاسوں کی طرح دور سے ہی نظر آتے ہیں۔ پیتل کی گول پلیٹ پر بجتی ہوئی موگری جیسے کہتی ہو۔۔۔۔۔ آؤ۔۔۔۔۔ آؤ۔۔۔۔۔ آؤ۔۔۔۔۔نہیں معلوم کیوں اس آواز کے ساتھ ہی میرا ذہن اپنے گھر پہنچ جاتا ہے۔ پتہ نہیں گھر کی ہر چیز اور بات میں اتنی راحت اور مانوسیت کا احساس کیوں ہوتا ہے۔لیکن پھر اس راحت اور آسائش کے باوجود گھر میں رہ کر ہمارے معمولی اور چھوٹے چھوٹے مسئلے بھی اتنے کٹھن اور نہ کھلنے والی گتھیاں بن جاتے ہیں کہ آدمی کا دم گھٹنے لگے۔ جیسے وہ دھوئیں اور گھٹن کی ایسی لپیٹ میں آ گیا ہو جس سے چھٹکارا ملنا ممکن نہ ہو۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارے والدین ہمارے کسی مسئلے کو ہمارا ذاتی معاملہ نہیں سمجھتے۔ان کا یہی خیال ہوتا ہے کہ وہ ہمارا نہیں صرف ان کا اور ان ہی کا مسئلہ ہے اور اس کارن وہ اس کو اپنے ہاتھ میں لے کر خود حل کرنا چاہتے ہیں۔ان کا تو بس نہیں چلتا کہ وہ آپ کی کھال کھینچ کھینچ کر پرت پرت کی تہ میں ٹٹول ٹٹول کر ہر ایک بات کی کھوج نکالیں۔کیا ہے؟ کیوں ہے؟ کیوں نہیں؟ اتنا ٹٹولیں، اتنا کہ آپ کے پاتال تک پہنچیں کہ کوئی بات چھپی نہ رہ پائے، نہ کوئی راز، راز رہ سکے۔ بس ایک تو ان کی آشائیں اور امیدیں میری آشا۔۔۔ آشا۔۔۔۔۔ یہ آشا۔۔۔۔۔ وہ آشا۔۔۔۔۔اب کوئی کہاں تک ان کی آشاؤں پر پورا اتر سکتا ہے۔میرا تو یہ وشواس ہے۔ بالکل پکا یقین کہ ان کا بس چلے تو ہمارے سینوں پر بھی چھاپہ مار کر ہمیں ایک طرف کریں اور ہمارے سینے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھنا شروع کر دیں۔

میں نے اٹھ کر اپنی صراحی سے ایک گلاس پانی انڈیلا اور اس کو ہوا میں لہرایا۔۔۔۔۔ پورے سنسار کے سورگباشی آشا وادیو سندر سپنے دیکھنے والو ! یہ جام، یہ ٹوسٹ تمہارے نام اور اس کے ساتھ ہی میں یہ اعلان کرتی ہوں کہ میں نے بڑی کوشش کی ہے ان باتوں کو برداشت کرنے کی۔اپنی حد بھر برداشت کرنے کے بعد اب میں ایسی ساری باتوں کے خلاف یدھ کرنے کا یعنی جنگ کرنے کا بھی اعلان کر رہی ہوں کہ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے اور چھلکنے کو ہی ہے کہ اب مجھ میں یہ سب سہارنے کا حوصلہ باقی نہیں۔ میں نے تو گلاس کا پانی اپنے کمرے کی کھڑکی کے باہر اچھال دیا ہے اور اب پانی کا وہ دھبا سوکھی دھرتی پر افریقہ کے نقشے کی طرح دکھائی دے رہا ہے۔

MashalBooks.org

دوپہر کے کھانے کی گھنٹی دوبارہ بج رہی ہے۔سامنے والی دیوار پر ٹنگا کیلنڈر رہوا سے پھڑ پھڑا رہا ہےاوراس کے سرے پر لگا ہوا کنارا دیوار کے پینٹ پر بار بار رگڑا لگنے سے ایک نصف دائرہ آدھے چاند کی طرح چمک رہا ہے۔دیوار پر رگڑ سے چھلا اور کھرچا ہوا پینٹ کا نشان مجھے کسی کی چھلی ہوئی کہنی کا احساس دلاتا ہے۔ہم نے جب پہلے پہل ماں باپ کے خلاف اپنے یدھ یعنی جنگ کا آغاز کیا تو ماں کو اس سے جتنا دکھ ہوا تھا اتنا بابو پر اثر نہیں تھا۔ماں تو جیسے ہل کر ہی رہ گئی تھیں۔اب مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کب ہمارے بدلتے تیوروں اور اکھڑی اکھڑی باتوں نے تیزی اور بدتمیزی کا روپ دھارا، کچھ یاد نہیں کہ کب کڑے تیوروں اور کڑوی کسیلی باتوں کے ساتھ گڑے مردے اکھیڑے جانے لگے۔کب کب کی گئی گزری باتوں کے حوالوں سے جھگڑے ٹنٹے، بحث مباحثے اور الزام تراشیوں نے بڑھتے بڑھتے برف کے گولوں جیسی سخت اور اولوں کی بارش بن کر برسنا شروع کر دیا۔گھر میں ہونے والے اس یدھ کے بارے میں بابو کا کہنا تھا کہ "بھئی خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔۔۔۔چھوٹا اور تین خربوزے ہی تو تھے اوہ مثل ہے نا کہ چھری خربوزے پر گرے یا خربوزہ چھری پر بات تو ایک ہی رہے گی۔

کالندی، بینا، سپنا، ونتی۔۔۔۔پورے کا پورا ریوڑ ڈائننگ ہال کی طرف لپکا چلا جارہا ہے۔لڑکیاں کھنکھتے ہوئے بے معنی قہقہے فضا میں چھوڑتی ہال کی طرف لپکی چلی جارہی ہیں۔ان کی حالت تو مٹی کے بھانڈے جیسی ہے کہ کوئی رنگ یا کوئی مائع ان پر چڑھ کر اور اثر کر کے نہیں دیتا۔ کچھ کرلو، بھانڈ اویسے کا ویسا ہی رہے گا۔یہ جو کچھ سوچتی اور محسوس کرتی ہیں اس کا کوئی اثر ان کے معدے پر نہیں پڑتا، کیسی ہی تلخ سیاسی بحث ہو رہی ہو ان کو کبھی کڑوے یا کسیلے پن کا احساس نہیں ہوگا۔ارے یہ کبھی نہیں کہیں گی کہ ہمارے دہی کے پیالے میں تھوڑی چینی اور ڈال دو یا دال میں تھوڑی مرچیں اور چھڑک دو۔نہیں وہ کبھی کوئی مطالبہ نہیں کریں گی۔ بڑی سیدھی سادی ہنس مکھ، سدا سکھ۔جذبات سے عاری، بھیڑوں جیسی، خاموش بے ضرر، ماتا پتا کی دلاریاں لاڈلیاں، نین سکھ، ٹائپ یہ سب کی سب آئیڈیل ہیں، بچہ پیدا کرنے والی۔آئیڈیل مشینیں اونچے اونچے بڑے کولھوں اور پھٹی پھٹی آنکھوں والی لڑکیاں۔۔۔۔۔اپنی کمر سیدھی کر کے ابھی میں نے گنگنانا ہی شروع کیا تھا کہ میں نے کشور کو دروازے میں سے جھانکتے ہوئے دیکھا۔"][ارے بات کیا ہے بڑی خوش دکھائی دے رہی ہو؟"

کشور کا اور موت کا یہ ہے کہ کبھی بتا کر نہیں آ تا۔ سو مجھے اس کے یوں ایک دم آ جانے پر کوئی اچنبھا ہوا بھی نہیں۔۔۔۔۔ بڑے بڑے پھولوں والے کپڑے کا ہاؤس کوٹ اس کی فراخ اور بھری بھری چھاتیوں سے لپٹا ہوا تھا۔ ایک شوخ رنگ تولیہ اس کے تازہ تازہ دھلے ہوئے بالوں اور سر پر استو پا کی طرح لپٹا ہوا تھا اور وہ دروازے پر سوالی نشان بنی کھڑی تھی۔

" کوئی خاص خبر !" دراصل کشور کا شمار ان چالاک اور عیار ٹوہ بازوں میں بھی نہیں کیا جا سکتا کہ جو دوسروں کے پیٹ میں گھس کر ان کے اندر کے چھپے ہوئے راز معلوم کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ تاہم اس کی یہ عادت تھی کہ وہ دوسروں کی ٹوہ لینے میں لگی رہتی تھی۔۔۔۔ سچی بات یہ ہے کہ کشور بنیادی طور پر اچھے مزاج کی تھی اور میرے پاس اس کے خلاف کوئی خاص بات یا دلیل بھی نہیں تھی۔ پھر بھی مجھے اس کی بعض غلیظ عادتیں ناپسند تھیں۔ مثلاً یہ کہ اس کی کھڑکی کے پتھر پر اچار اور چٹنیوں کی پھپھوندی لگی بوتلوں کا ایک ڈھیر لگا رہتا تھا۔ اس کے ٹوتھ برش کی حالت اور شکل سے لگتا کہ جوتے صاف کرنے والا برش ہے اور اگر کبھی اس کے بلاوز کے نیچے چھپے بریزئر کے اسٹرائپ پر غلطی سے انگلی یا ہاتھ لگ جاتا تو یقیناً ابکائی تو آ ہی جاتی۔

سوچوں اور خیالوں کے تانے بانے کو پرے ہٹاتے ہوئے کہنی کے بل اٹھ کر بیٹھے ہوئے میں نے کہا:" نہیں تو کوئی خاص بات نہیں بس ایسے ہی"۔

کشور اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں اور اپنی بلی جیسی آنکھوں سے کمرے کا جائزہ لیتی رہی، مجھے اندازہ اور یقین تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح مجھے پکڑے گی ضرور۔ یقیناً مجھ پر چھاپہ پڑے گا۔ اس لئے کہ وہ دوسروں سے چیزیں مانگ کر استعمال کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ ادھار بھی مانگتی ہے مگر واپس کرنے کی قائل نہیں اور اپنی اس عادت کی وجہ سے خاصی شہرت رکھتی ہے۔

"اچھا تو یہ نئی چپلیں ہیں؟"

نہایت اکھڑ پن سے اس نے اپنے کھرپا جیسے پاؤں چپلوں میں ڈال دیئے۔ اس نے یہ ناخنوں کو جو نیل پالش لگائی ہے وہ بھی کالندی سے مانگ کر لگائی ہے۔ یہ بات تو خیر مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔

"ہاں"۔ میں نے ذرا محتاط انداز میں بے تعلقی سے جواب دیا۔

"اچھی چپلیں ہیں"۔ اس نے اپنے پیر کے انگوٹھوں کو چپلوں میں گھساتے ہوئے کہا

اور پیروں سے ہی آگے ٹھیل دیا اور کہنے لگی:

"سنو ہم مووی جا رہے ہیں۔تم چلو گی؟ "یہ کہتے کہتے کنگھے کے دندانے اپنے دانتوں پر پھیرنے لگی۔

"ہاں تم چھٹیوں میں گھر جا رہی ہو؟"

"ہاں!"

"اچھا تو پھر مووی پر چلی چلو یہ پکچر تمہارے گھر کی طرف تو پہنچے گی بھی نہیں۔کم از کم اگلے دو سال تک"۔

"دیکھو سوچیں گے"۔ میں نے اپنی بیزاری اور بوریت ظاہر کرنے کی ناکام کوشش کی۔

" کون سی فلم لگی ہے؟"

اس نے ایک سنسنی اور بھرپور فلم کا نام بتایا۔جس کے بارے میں بڑی باتیں سن رکھی تھیں۔

"اچھا پھر ٹکٹ؟"

"ارے بھئی کر لیں گے کچھ نہ کچھ"۔اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔ دراصل اس کے پتا پولیس کے کسی بڑے عہدے پر فائز تھے اور کچھ دن پہلے ان کی پوسٹنگ اسی جگہ تھی۔اب یہ تھا کہ بہت اہم اور اونچی اونچی جگہوں پر تو ان کے نام کی دھونس چلتی نہ تھی، البتہ سینما گھروں، پرچون فروشوں کی دکانوں اور اسٹوروں پر ابھی بھی ان کے نام کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور کام چل جاتا تھا۔شہر کے سب سے اونچے سینما ہال کا بڈھا بدمزاج گیٹ کیپر اس کو ابھی بھی "بے بی "ہی کہتا تھا اور اس کا لحاظ کرتا اگر ہم کبھی دیر سے بھی پہنچتے تھے تو وہ بڑے تپاک سے خود اپنے ساتھ لے جا کر سیٹوں پر بٹھا دیا کرتا تھا۔

"اچھا پھر تم مجھے دوپہر سے پہلے بتا دینا۔ہم یہاں سے ساڑھے بارہ بجے نکل جائیں گے"۔ وہ جانے کے لئے مڑ گئی۔اس کو جاتے دیکھ کر جی چاہا کہ آواز دے کر واپس بلا لوں اور کہوں:

"پیاری کشور کرپا کر کے کچھ دیر کے لئے میرے پاس رک جاؤ، تھوڑی دیر یہاں

بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرو۔کسی بھی چیز کے بارے میں کسی بھی جگہ کے متعلق۔بس تم مجھے مجھ سے بچا لو۔میرے احساس تنہائی سے بچالو۔میری دوست۔۔۔۔۔ "ایک دم ہی مجھے بے تحاشہ ہنسی آ گئی۔میں نے اپنی چپلوں میں پیر ڈالے اور پھر نکال لئے اور دوبارہ لیٹ گئی۔

مجھے پتہ تھا کہ میں مووی پر بالکل نہیں جاؤں گی اور یہ بات وہ لوگ خود بھی جانتی تھیں۔پھر اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بحث مباحثہ اور تبادلہ خیال کی کیا ضرورت۔۔۔۔۔میں پڑے پڑے چھت کو گھورنے لگی۔اس ترکیب سے کافی افاقہ ہوا۔چھت کے ایک کونے میں ایک مکڑی جالا تن رہی تھی۔ناقابل برداشت حد تک اپنی باریک اور ناتواں ٹانگوں پر بھاگی بھاگی ادھر سے ادھر آجا رہی تھی۔میں نے اپنے ناخن دانتوں میں لے کر چبانا شروع کر دیئے۔پچھلے سال یہ ہوا کہ اپنے ماتا پتا کی آشاؤں اور خود فریبیوں کے باوجود میں امتحان میں بری طرح فیل ہو گئی تھی۔پرچوں کا ناس مار کر رکھ دیا تھا اور تاریخ عالم کے پرچے کا تو خاص طور پر بیڑا غرق کر کے رکھ دیا تھا۔سچی بات تو یہ ہے کہ سر سکینہ میرے لئے ناقابل برداشت تھے، ان کی شکل سے ہی مجھے خفقان ہونے لگتا تھا۔ٹھیک ہے کہ وہ اپنے وقت کے مانے ہوئے ہسٹری کے طالب علم تھے۔پر ایسا ہوا کہ گردش روزگار نے ان کو پڑھانے کے پیشے سے منسلک کر دیا۔ان کے تمام کے تمام ساتھی کہیں سے کہیں جا پہنچے تھے، کچھ تو بیوروکریسی کے اہم عہدے سنبھال کر بیوروکریٹس بن گئے تھے اور کچھ بڑے بڑے برنس ٹائکون بن چکے تھے۔لمبی لمبی ایئر کنڈیشنڈ کاروں میں اڑے پھرتے تھے۔ہوا ناسگاروں کے دھوئیں اڑاتے۔۔۔۔۔ادھر ان کا یہ حال کہ جہاں کے تہاں کھڑے ہیں۔سر کے بال اڑتے جا رہے ہیں اور غصہ اور بد دماغی میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور بڑے اطمینان سے نپولین کی انگریزوں کے خلاف لڑائیوں اور جنگوں کے تھکا دینے والا واقعات پڑھانے میں جٹے ہوئے ہیں۔بات یہ ہے کہ میرے اور سر سکینہ کے درمیان کشیدگی اور تناؤ اول دن سے ہی چلا آتا ہے۔بھئی اصل اور صاف بات تو یہ ہے۔ان کو دیکھ کر مجھے چاچا کا خیال آ جاتا ہے کہ چاچا ہمارے پتا اور ماتا کے بہت پیارے دوست ہیں اور سر سکینہ کی شکل، چاچا سے بہت ملتی جلتی ہے۔وہی پتلی طوطے کی چونچ جیسی آگے کو جھکی ہوئی ناک وہی چوکھٹا۔ویسی لڑکھڑاتی ڈگمگاتی چال اور وہی غن غنی آواز جیسے ناک سے بول رہے ہوں۔اچھا اگر اب بھی آپ کے ذہن میں چاچا کی شخصیت کا خاکہ نہ بنے تو پھر آپ ایسا کریں کہ ریڈیو پر پھلواری کے نام سے بچوں کا جو پروگرام

ہوتا ہے اس کے کمپئر کی آواز یاد کیجئے جو بڑے بھیا کے نام سے یہ پروگرام کرتے ہیں۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ وہ بچوں کی سی اٹھلائی ہوئی غن غنی آواز میں ناقابل برداشت قسم کے بھونڈے بھونڈے انداز میں مسخرے پن کی باتیں کر کے بچوں کو اپنا متوالا بنانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ بس ان کے چچا کی بھی عین مین ویسی ہی آواز ہے۔

"ارے بھائی آخر ہم نے اپنے پچھلوں کی کوکھ سے ہی تو جنم لیا ہے۔ ہمارا جنم کرم تو اپنے پرکھوں اور بڑوں ہی کے دم سے ہے"۔ یہ چاچا کا مخصوص جملہ ہے۔ یہ بات ان کے منہ سے نکلی نہیں کہ ہمارے گھر میں رگڑے جھگڑے شروع ہوئے نہیں۔ ان چاچا پر ماں خاص طور پر اس لئے مہربان رہتی ہیں کہ وہ ان کے مادرانہ لیکچروں اور بھاشنوں پر مسلسل صاد کرتے رہتے ہیں۔ ان کی ہر بات پر ہاں میں ہاں ملاتے رہتے ہیں۔۔۔۔ جہاں تک کھانوں کی بات ہے تو ان کا کہنا ہے۔ بھئی آپ جیسا بھوجن کون بنا سکتا ہے اور تو اور وہ تو چائے کا ایک گھونٹ لیتے ہی بتا سکتے ہیں کہ چائے کسی نوکر نے بنائی ہے یا ماں کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہے اور ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ گھر داری کرنا کوئی کھیل نہیں ہے، گھر تو دنیا میں بہت ہیں مگر جیسی ٹھکی ہوئی گھر داری آپ کرتی ہیں اس کا جواب نہیں، پھر ماں کو اکساتے کہ ان کو چاہیے کہ مجھے گھر گرہستی کے کاموں کا ابھی سے ڈھنگ سکھائیں۔ "ہر کام کا ڈھب آنا ضروری ہے بات یہ ہے کہ لڑکی ذات ہو تو آگے چل کر زندگی میں نہ تو جی بی شا (جارج برنارڈ شا) آپ کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ ٹی ایس ایلیٹ کام آ سکتے ہیں"۔

"سن لیا آپ نے؟ اب کہیے۔۔۔۔۔ اچھا وہ بابو کے بھی بہت من بھاؤنے اور دلارے ہیں۔ اس لئے کہ اٹھتے بیٹھتے نئی نسل کی کمینگیوں اور بے تکے پن کا ذکر کرتے کرتے گاندھی ازم کے حوالے دینے اور ان کی ڈگر اور آدرشوں پر چلنے کے بھاشن دیتے رہتے ہیں۔ اس تگڑم یا تثلیث کے ڈرامائی پلاٹ کی لپیٹ میں جو کردار آتے ہیں وہ خود ان کے علاوہ ماں، بابو اور ہم سب بھائی نہیں ہیں یعنی مرکزی کردار تو ماں، بابو اور چاچا ہی ہوتے ہیں اور باقی ہم بہن بھائی تو اتفاقیہ اور ضمنی کرداروں کے طور پر حسب ضرورت ہی شامل کر لئے جاتے ہیں۔ جیسے ماں اپنے مکالمے کا آغاز کرتیں:

"ہاں۔۔۔۔ ہاں بھئی تم مجھ کو پرانی چال کی عورت کہہ سکتے ہو"۔ ان کے منہ سے اتنی بات نکلتے ہی بیچ میں چاچا کود پڑتے۔

MashalBooks.org

"ارے بھابی آپ اپنے لئے کتنے غلط شبد بول رہی ہیں۔ارے آپ کوتو مہذب، کلچرڈ،معزز سماج وادی لاج ونتی مہیلا جیسے نام سجتے ہیں۔ ہاں بھئی میں تو آپ ہی کے ریت رواجوں کو ماننے والا پرانے چال چلن کا پرچار کرنے والا ہوں۔اب بات یہ ہے کہ عزت مریادا اور کلچراور سماجی رکھ رکھاؤ تو نئی نسل تک ہم پرانے خیالات اور چلن والے لوگوں کے وسیلے سے ہی پہنچے گا اور تم اس ساری حقیقت اور سچائی کا انکارنہیں کر سکتے نہ اس سے چھٹکارا پا سکتے ہو اور یہ بھی جان لو کہ تم اپنے نئے نویلے اوراوٹ پٹانگ آدرش اور سوچ کو ہم پر لاگو نہیں کرسکو گے۔اب بتاؤ کیا جواب ہے۔میری باتوں کا کوئی جواب نئی نسل کے باغیوں کے پاس نہیں ہے۔ میں جو کہہ رہا ہوں سچ ہے۔اگر تم میں اتنا ہی بوتا ہے تو ثابت کردو کہ یہ سب جھوٹ اور غلط ہے"۔

ناک کے اندرونی حصے کے سرے پر پل پل کر موٹی ہو جانے والی گلٹی کی طرح ان کی ٹوہ بازی کی عادت اور فسادی طبیعت ہمارے وجودوں کے اندر ہی اندر انتہائی ڈھٹائی سے چمٹی رہنے کی کوشش کرتی ہے اور وہ خون پی پی کر پھول جانے والی جونک کی طرح چمٹے رہنے پر بضد ہو جاتی ہے۔

"اچھا اگر کر سکتے ہو تو ثابت کردو کہ میں جھوٹ کہتا ہوں"۔

یہ کہتے کہتے وہ بابو کو آنکھ مارتے اور پھر ہمارا خون کھولا دینے والا ایک قہقہہ لگا کر کہتے:

"ہاں بھئی آؤ نا ہمارے پاس بھی تو آ کر بیٹھو اور اپنے آدرش اور نظریے بیان کرو۔ہم بھی تو سنیں کہ آخر یہ جو ہماری نام نہاد نئی نسل ہے کہ وہ کہتی کیا ہے اور اس کی سوچ کیا ہے؟ میں نے سنا ہے کہ آپ بڑے انقلابی خیالات کے حامی ہیں"۔

ان کی اس بکواس پر میں دیکھتی کہ بھیا کا جبڑا سخت ہونے لگا ہے اور خود میرے اپنے پیٹ میں مروڑ ہونے لگتا۔ہم اپنا غصہ اور ناگواری کو اپنی حد بھر قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے۔قصہ یہ ہے کہ جیسے ہی ہمارے گھر میں ان چاچاؤں اور موسیوں کا نزول ہوتا ہم بھائی بہن گھر کے دور افتادہ کونوں کھدروں میں چھپنے کی کوشش کرتے۔ایسے نظروں سے دور کونوں کھدروں میں جہاں سے ہم انہیں دکھائی نہ دیں، نہ ہی وہ ہمیں نظر آئیں۔لیکن آواز تو آواز ہی ہوتی ہے اور اس پر پہرے نہیں بٹھائے جاسکتے۔

ہم جہاں کہیں بھی چھپے بیٹھے ہوں ان کے اونچے بولنے اور مختلف موضوعات مثلا

سماج، بلیدان، سنسار، بڑوں کی رکھشا، عزت اور مان رکھنے کی ضرورت اور آج کل کے دہشت گرد نوجوان نسل کے لوگوں کے طور طریقوں میں زوال اور انحطاط پر اونچی اونچی آوازوں میں لمبے چوڑے بھاشن اور لیکچر بس یوں لگتا گویا یہ کہ جو کسر ہمارے باپ ماں کے دیئے ہوئے بھاشنوں میں رہ گئی ہوتی وہ یوں بھگوان کے اتارے ہوئے ان اوتاروں اور مہان لوگوں کی باتوں سے پوری ہو جاتی۔ بھگوان خاص طور پر ہماری اصلاح کے لئے ہمارے گھر پر انہیں نازل کرتے رہتے ہیں۔ ان چاچاؤں اور موسیوں کا روپ دے کر خاص ہمارے گھر بھیج دیا کرتے ہوں۔

ہمارے اسی شہر کے اونچی باڑھوں اور نیچی دیواروں والے پرانے نوآبادیاتی طرز کے خستہ اور بوسیدہ بنگلے میں ہماری مالینی موسی رہتی ہیں۔ ان کے بنگلے کا بہت بڑا لمبا چوڑا باغ اور ویسا ہی بڑا سا براؤن پھاٹک عجب خراب و خستہ حال میں نظر آتے، جس کی دیکھ بھال مدت سے نہ ہوئی۔ پھاٹک کی اتری اور اڑی اڑی رنگت جیسا ہی جیسا ویران اور اجڑا اجڑا باغ نظر آتا کہ گھاس خشک ہو کر پیلی ہوتے ہوتے اب بھوری نظر آتی اور جیسے ہی آپ ان کے اندھے اور اندھیرے گھر کے اندر داخل ہوں تو جھڑتے ہوئے ڈسٹیمپر سیلن زدہ دیواروں کی بدبو کے ساتھ ملی جلی گھن کھائی لکڑی کی بو آگے بڑھ کر آپ پر گرنے گی۔ ہر جگہ در و دیوار اور فرشوں پر جمی دھول دھیرے دھیرے آپ کی ناک کے نتھنوں میں داخل ہونے لگے گی۔ آپ کو ایسا لگے گا جیسے آپ کسی کال کوٹھڑی میں گھس آئے ہوں۔

تیز دھار کٹیلی زبان والی مالینی موسی، بڑی ہی وہمی شکی اور ہر ایک کے خلاف دل میں کینہ کپٹ رکھنے والی خاتون۔۔۔۔ وہ ہر وقت ہر ایک سے جلی کٹی رہتی تھیں، دل ہی دل میں بیر بسائے رکھتی تھیں اور ایک ہماری ماں سیدھی سادی، ستی ساوتری، خوش مزاج اور صاف قلب۔ ان کا تو یہ تھا کہ وہ موسی مالینی کے چڑچڑے پن اور نروس نس کے سبب کی خاص توجیہ بیان کرتی تھیں یعنی مختصر یہ کہ عورت کی بے بسی اور صدیوں کی مظلومیت نے ان کے اندر کی صلاحیتوں اور ذہانت کو کس طرح مٹایا، کس طرح ان کی وہ بے پناہ سندرتا اور کلائیں گھٹ گھٹ کر خاک ہوئیں اور مٹی میں مل گئیں۔ مالینی موسی کے بارے میں ماں کے منہ سے سینکڑوں بار یہ قصے سنے تھے کہ کیسی ہر فن مولا تھیں اور ان کے اندر ہنر، سلیقے اور کلاکاری کے ابلتے سوتے عورت کی مظلومی کے کارن سوکھ کر خشک ہوئے، وہ کہا کرتی تھیں کیسے ایک بے قدرے، کٹھور اور تنگ گھرانے کی سیوا نے اس کو مٹی

میں ملا دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ جس کانووکیشن میں ان کا نام پکارا گیا تو ساری محفل پندرہ منٹ تک دم بخود اور مبہوت ہو کر رہ گئی تھی، ان کو دیکھ کر کیا سندر تا تھی اور ان کو جس جس نے اس وقت دیکھا تھا وہ ان کے حسن و جمال کی قسم کھاتے تھے۔ پر، ہم نے تو جب سے ہوش سنبھالا، یہی دیکھا کہ مالینی موسی نے اپنے من اور گھر کے کواڑ سارے جگ پر سختی سے بند کر رکھے تھے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ان کے اپنے قریبی اور گود پیٹ کے وہ رشتے دار جن سے ان کا دل ملتا تھا۔ ماں ان ہی خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جن کے لئے وہ اپنے دروازے کھولتی ہیں، وہ بھی چڑ چڑا ہی کھلتے۔ جیسے ان کو کھولا جانا اچھا نہ لگا ہو۔ ہماری ہر بات کے اچھے مطلب نکالنے والی ہر چیز میں رجائیت کا پہلو دیکھنے والی ماں کو وہ بڑے چاؤ اور محبت سے سواگت کرتی اور ماں کا یہ تھا کہ جیسے ہی وہ ان کے گھر میں داخل ہوتی ہیں تو ان کی عجیب حالت ہو جاتی ہے، بار بار ملال اور رنج سے کہتی ہیں:

"ہائے کیا تھی اور کیا ہو گئی؟"

ٹھنڈی سانسیں بھرتی جائیں گی اور کہتی رہیں گی۔ "ہائے بیچاری ! ہائے افسوس کیا سے کیا ہو گئی"۔

بات یہ ہے کہ ان کی نئی زندگی کا آغاز ہی غلط ہوا ایک سخت گیر ساس کی کڑی نگرانی اور سختیوں کے سائے میں جیون بتا کر وہ اتنی بے بس اور پس کر رہ گئی تھیں کہ وہ، وہ نہ رہیں جو وہ کبھی ہوا کرتی تھیں۔ مانو اپنے دکھوں کی بھیڑ میں کہیں گم ہو گئی تھیں۔۔۔۔ یہاں تک کہ بوڑھی ساس کے مر جانے کے بعد بھی وہ اپنے آپ کو کھوج نہ پائیں۔۔۔۔ جیسی تھیں ویسی پھر نہ ہو پائیں۔۔۔۔۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ساس کا تو صرف بہانہ ہی ہو مگر جیون کے دکھوں اور المیوں کی رانی یعنی ہماری موسی مالینی کو اس سب کو، عادت ہی ہو گئی ہو اور اپنے دکھوں سے اتنا پیار ہو گیا ہو کہ وہ اب سوچ بھی نہیں سکتیں کہ اپنے غموں کی گٹھڑی کو جسے وہ ہر سمے اپنے سر پر اٹھائے پھرتی ہیں، دم بھر کو اتار کر الگ رکھ دیں۔ اپنے عورت پن کے ناتے انہوں نے جو کٹھن سمے گزارا اور جیسی دکھ بھری زندگی سے دوچار ہوئیں، وہ اب اسے کبھی بھی بھول نہ سکیں گی۔ آپ ان سے ملنے جائیں یا وہ آپ سے ملنے آئیں صورت دیکھتے ہی اونچی اونچی آواز میں دکھڑے شروع ہو جائیں گے، وہی عورت کی مظلومی بے بسی کے حوالے سے اپنی پریشانیوں اور الجھنوں کا غمناک بیان۔ ان کے یہ سارے دکھڑے ان کے عورت پن اور خود رحمی کے محور ہی کے گرد گھومتے ہیں۔ اس ہی کارن ان

کومردوں سے ایک انجانہ بیر ہر سمے پریشان رکھتا۔ تمباکونوشی سے نکلنے والا دھواں ہو یا کوئی اونچا سا مردانہ قہقہہ یا کوئی بے ہودہ لطیفہ ان کے قریب سے بھی گزر جائے تو وہ پریشان ہو جاتی ہیں۔ آپے سے باہر، ناراض اور پریشان، گھنٹوں بیٹھی کڑھتی رہیں گی، جیسے پرانا سال خوردہ وال کلاک اپنی جگہ ٹنگا ٹنگا ٹک ٹک کرتا ہو۔ ان کے سارے دکھڑے ایک ہی لے سر میں چلتے ہیں، چاہے وہ ان کے بیٹوں کی بے پرواہی اور لاتعلقی کے ساتھ ان کی روپیہ اڑانے والی مہنگی مہنگی عادتوں کے بارے ہو یا پھر ان کے پتی کی نکمی ملازمت کا دکھڑا ہو جس کی وجہ سے ان کا پورا جیون ہی ایک چھوٹے سے قصبے میں پھنس کر رہ گیا یا پھر اپنے پرانے نوکروں کی بڑھتی ہوئی بے حسی اور ڈھٹائی کا رونا ہو۔ ماں کی البم میں مالینی موسی کی جو تصویریں ہیں، ان کو دیکھ کر لگتا تو ہے کہ بڑی سندر کومل سی دبلی پتلی زردی مائل رنگت والی، دھان پان سی جیسے اوپر آسمان سے اتری ہوئی کوئی اپسرا ہو۔ پر اب تو ان کی وہ ساری سندرتا گوشت کی دبیز تہوں تلے کہیں دب دبا کر رہ گئی ہے۔ ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ٹھیک ماں بھی کوئی فیشن ماڈل تو نہیں رہ گئی ہیں، پر ان کے وجود سے پھوٹ پھوٹ کر نکلنے والی ممتا اور ماں پن کی ایک مخصوص نرمی اور گرمی کہ جیسے کسی نرم نرم کشن پر سر رکھ دیا ہو۔ ان کی گود میں سر رکھ دو تو تازہ تازہ دودھ کی مہک اور نندا سا پن طاری ہونے لگے۔ اس کے برعکس مالینی موسی کے مٹاپے میں خمیرے آٹے کی طرح تھل تھل کرتا ہوا بدن۔ سیلن اور اندھیرے میں بند بند ڈبے میں رکھے خمیر کی طرح پھول کر کھٹی کھٹی اپسی ہوئی باس دیتا بدن۔ پراسرار نسوانی امراض میں مبتلا وہ سدا کمر کے شدید درد کے علاوہ جوڑ جوڑ چٹخا دینے والے پراسرار دردوں سے پریشان ہی رہتی ہیں، وہ ہمیں گلے لگاتیں تو عجیب بھکسی بھکسی دواؤں اور تنہائی کی ملی جلی بو سی نتھنوں میں گھستی۔ پر ایک بات ضرور کہوں گی جو سچ پوچھو تو یہ بات ہے کہ ان کے وجود سے عجیب سی اداسی کی لپٹیں سی اٹھتی محسوس ہوتی تھی، جیسے وہ کوئی ایسی مخلوق ہوں جس کی بے نام اداسی کا سبب یہ ہو کہ اس کا پورا وقت مشکلات اور حالات کے مقابلے میں گزرا ہو۔ ایک ایسی ذات جو مخالف اور نامساعد حالات کے ساتھ بڑی بہادری اور پامردی سے لڑتی رہی اور اپنی جگہ پر ڈٹی رہی۔ وقت اور حالات کے ہاتھوں ہار ماننے پر کبھی تیار نہ ہوئی ہو۔ ان کے مقابلے میں چھوٹی موسی بہت سیدھی سادی تھیں۔ مالینی موسی کا تو یہ تھا کہ وہ بڑے سے بڑے اور بد سے بدتر چیلنج کا بھی مقابلہ کرتی تھیں پر شالینی موسی نے تو زندگی اور حالات کے آگے ہتھیار ڈال کر اپنی ہار مان لی تھی۔ اپنے آپ

MashalBooks.org

اور اپنی ذات پر ایک نئی نویلی چھوٹی دلہن کا چولا ڈال لیا تھا اور وہ اپنے اس رول پر بڑی شانت اور مطمئن تھیں، ویسے ہی اٹھلا اٹھلا کر بولنا ویسی ہی بچگانہ قسم کی باتیں کرنا۔ اپنے بیٹے سے بات بات پر الجھنا اور جھگڑنا، انگریزی بول بول کر بحث مباحثہ کرنا اور پھر بچے سے اتنا پیار دلار جتانا کہ وہ سر چڑھ جائے انکی تو ایک ہی آرزو اور خواہش تھی کہ اپنے گھر کو ولایتی اور بدیسی مشینوں اور آلات سے بھر لیں یا پھر اپنے بیٹے کو اس طرح سے پالیں کہ وہ بڑا ہو کر بہت بڑا افسر بن سکے۔ ان کی تکلیفیں زور پریشانیاں بھی معمولی اور چھوٹی چھوٹی باتوں اور پیانے پر مبنی ہوتی تھیں۔ مثلاً یہ کہ ملازمہ دیر سے آتی ہے، وقت پر نہیں پہنچتی یا جو اچار ڈالا تھا وہ پھپوندی لگ جانے کی وجہ سے کھانے کے قابل نہیں رہا یا پھر یہ پریشانی کہ بیٹا ان دنوں اچھے نمبر نہیں لے رہا ہے۔ امتحان میں ذرا بھی اچھے نمبر نہیں آئے۔ ان کی ان چھوٹی چھوٹی باتوں اور شکایتوں اور ذرا ذرا بات پر رونے، جھگڑنے نے ماں کے دل میں گھر کرنا شروع کیا۔ وہ ان کی توجہ کا مرکز بننے لگی تھیں، خاص طور پر ان دنوں جب ہمارے اور ماں کے درمیان فاصلے اور دوریاں پیدا ہو رہی تھیں۔ وہ اس طرح کہ پہلے ماں نے اپنے بچوں کے بل پر ان کے ارد گرد اپنے سپنوں کے جو محل اور قلعے کھڑے کرنے شروع کئے تھے۔ بچوں کی دوری اور بے تعلقی کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ کر چور چور ہونے لگے، وہ اب شالینی موسی کی بچگانہ حرکتوں اور چھوٹے چھوٹے مسئلوں کے سہارے مضبوط ہونے لگے۔ اب وہ ان کے خیالوں اور سپنوں کا مرکز اور محور بننے لگی تھیں۔ اب یہ بات ٹھیک سے نہیں کہی جا سکتی کہ ماں کی تمام تر توجہ، آشائیں اور سپنے اب اپنی مضبوط دیواروں کھڑی کرنے کے لئے کسی اور کا سہارا لے رہے تھے یا یہ صرف ہمارا اپنا خود غرضی پر مبنی خیال تھا کہ ایسا کر رہی ہیں۔

منہ کا مزا اتنا کچھ سوچ سوچ کر کڑوا ہو گیا تھا۔ میں اچھل کر اٹھ کھڑی ہو گئی۔ چپلوں میں پیر ٹھونس کر پشی کے کمرے کی اور چل پڑی۔ پشی ! یہ تو پشپندر کا پیار کا نام ہے۔ پشی گریوال سکھ بچہ ہے، اس کی ناک میں سے بولنے کی غن غنی آواز اور چپنی انگلش اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ بھارت کے کسی دیسی کانونٹ کی پڑھی ہوئی ہے۔ اس کی دنیا بہت سپاٹ اور سیدھی ہے، جیسے ہری بھری گھاس کا یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا میدان، جس کے اندر وہ ارد گرد نہ کوئی اونچ ہو نہ نیچ، نہ کھوٹی کھائی، نہ ٹیلے اور اس کا تو یہ ہے کہ وہ ہر معمولی سی معمولی چیز اور بات میں غیر معمولی قسم کی دلچسپی لیتی ہے۔ مثلاً بہت تیز مرچ مصالحوں والی چاٹ مرغن گھی والے سالن، لتا منگیشکر کی موسیقی

اور ٹچے ٹچے رومانس اور انڈین اسکرین کے نر بچے یعنی دھانسو قسم کے ہیرو اور امیتابھ بچن جیسے ہیروؤں پر سے تو وہ سوسو جان سے فدا ہوتی تھی۔ پھر کیا ہوا اگر اونچے اور چوڑے قد کاٹھ کے ساتھ ساتھ اس کی آواز بھی گونجیلی اور بھاری تھی۔ اصل بات تو یہ تھی کہ وہ اس سب کے باوجود جذبات کا ابلتا اور بھرا ہوا دھارا تھی۔

"اوئے پشی"۔ زینے کے کٹھرے پر سے آدھا دھڑ لٹکا کر میں نے اسے آواز دی، کوئی جواب نہ ملنے پر میں نے ادھر ادھر دیکھا، پشی کے کمرے کے برابر ہی سروجی استھنا کا کمرہ ہے۔ ایک دم صاف ستھرا سجا سجایا کہ ہر چیز سے ترتیب اور سلیقہ ٹپکتا ہے۔ یہ کمرہ اپنی مالکہ کے شہیدانہ جذبوں اور شخصیت کے لحاظ سے بہت موزوں اور مناسب نظر آتا ہے۔

"وہ کہیں باہر گئی ہے"۔

سروجی نے اپنی تھکی ہوئی سپیری جیسی سریلی آواز میں کہا۔۔۔۔۔۔اب یہ تھا کہ ان نیک بی بی اور باذوق اور خوش مذاق خاتون کی جنہیں ہم مس گڈ ٹیسٹ کے نام سے پکارتے تھے۔ آواز میں عجیب سی بات تھی، جس کو سن کر عجیب بیہودہ سا خیال آنے لگا۔ میں بدتمیزی سے آگے بڑھ گئی تو سروجی نے مجھے آواز دی۔

"آؤ نا دو گھڑی اندر آ کر بیٹھو تو"۔

مجبوراً مجھے اس کے اصرار پر بیٹھنا پڑا۔ سروجی ہندوستانی اماؤں کا گھڑا گھڑایا نوعمر چربہ ہے۔ بس یہی سمجھیں کہ بنی بنائی اپنے وقت کی شالینی موسی ہے کہ اس پر کسی بھی واقعے کا اور بات کا کوئی اثر ہوتا ہے نہ ان کے طور طریق میں کوئی فرق پڑتا ہے۔ ہر وقت اپنے رکھ رکھاؤ اور بناؤ کے علاوہ بڑی مہذب، تمیز دار اور شائستہ۔ ان کی طرح سروجی بھی بڑی جان مار کر پڑھتی ہے اور کسی نہ کسی طرح سیکنڈ کلاس نمبر لے ہی لیتی ہے۔ اس کے کپڑوں کی الماری دیکھو تو اس کے سلیقے کا پتہ چلتا ہے، ایک کپڑا تہ کیا ہوا، ڈھنگ سلیقے سے خانوں میں لگا ہوا۔ ایک ایک کپڑے پر استری کی ہوئی اور اس کے بالوں میں ہمیشہ تیل لگا ہوا کنگھا کیا ہو نظر آئے گا، پھر یہ کہ موصوفہ مذہبی بھی ہیں۔ ان کے کمرے میں سدا کسی نہ کسی دیوی کی تصویر نظر آئے گی جو شیر پر سوار ہو یا پھر کسی ہنس کی پیٹھ پر بیٹھی ہوگی اور اس کے علاوہ کتابوں کے شیلف پر کتابوں کی قطاروں کے ساتھ ہی آلتی پالتی مارے آسن جما کر بیٹھے دیوتا کی مورتی دھری ہوگی۔ اس کے آگے پھول بھی پڑے ہوں گے اور

جلی ہوئی اگربتی کی راکھ بھی نظر آئے گی۔۔۔۔۔بھئی میں سچ کہتی ہوں اس لڑکی کے اتنے ٹھکے ٹھکائے ڈھرے اور اتنے شفاف طریقوں کو دیکھ کر میں اس کے دس سال بعد آنے والے مستقبل کو کھلی آنکھوں سے آج بھی دیکھ سکتی ہوں۔میری بات مانیں کہ آج سے دس سال بعد بھی اس کی زندگی ایسی ہی سپاٹ ڈگر پر چل رہی ہوگی۔۔۔۔۔۔ہاں۔۔۔۔آں۔۔۔۔۔۔وہ تو آج بھی نظر آ رہا ہے کہ کس دور افتادہ قصبے کے کسی انجینئر، ڈاکٹر یا بڑے افسر کے گھر میں ایک مکمل اور سلیقہ مند پتنی کی منظم زندگی پورا گھر آئینے کی طرح چمکتا ہوا شفاف۔کانسی کی آرائشی چیزیں پالش کی ہوئی جھم جھم کر رہی ہیں۔جاپانی آرائش گل اکی بانا کے سجے ہوئے گلدان جا بجا رکھے ہوئے اور ان کے بیچ بیچ سجی ہوئی خاندانی دیوتاؤں کی مورتیاں اپنے آسنوں پر جیسے گیان دھیان میں مصروف اور ایسی سجاوٹ پر مستزاد اس کے جہیز کا قیمتی بڑھیا فرنیچر۔دیوتاؤں کے پاس جلتے ہوئے تیل کے دیپ ٹم ٹم کرتے۔غرض ایک مکمل آسودہ گھر اور اس میں گھومتی ہوئی سروجی ہر طرح نک سک سے درست۔۔۔۔۔میں اس کی باتوں کا جواب ہوں یا ہاں میں دے کر اٹھ جاتی ہوں۔

"ہاں دیکھو مجھے اپنا سامان پیک کرنا ہے۔ٹھیک۔۔۔۔۔یہ بتاؤ کہ واپسی پر تمہارے لئے کیا لاؤں۔۔۔۔؟ ٹھیک۔۔۔۔۔ ہاں سوچ کر بتا دینا۔۔۔۔ اوکے بائے۔۔۔۔۔"

ایک ونگ سے دوسرے کی طرف نکلنا۔۔۔۔۔میک اپ کوری ٹچ کرنا بھی ایک کردار ادا کرتا ہے۔اس لڑکی کی زندگی میں۔۔۔۔۔

"شکریہ۔۔۔۔۔شکریہ۔۔۔۔۔بھئی تم سب کا شکریہ۔۔۔۔"

"تم نے کھانا کھا لیا"۔نرملا جی نے چلتے چلتے سیڑھیوں پر رک کر پوچھا۔وہ ہمارے ہوسٹل کی سب سے زیادہ قابل احترام اور عمر میں ہم سب سے بڑی ریسرچ اسکالر ہیں۔نرملا جی نو عمری میں ودھوا ہوئیں اور ابھی جوان ہیں۔۔۔۔۔لیکن اپنے رکھ رکھاؤ کے حوالے سے بہت بڑی۔ہم سب سے بڑی ہیں۔اتنی کہ ان کی بڑائی کو عظمت کہا جا سکتا ہے۔وہ بڑی خاموش اندر ہی اندر غم کھانے اور ہر بات کو پی جانے والی ہیں۔لیکن ان کی اس چپ اور سکوت سے کسی کو کوئی خطرہ یا خوف نہیں ہوتا۔نہ ہی ان کی خاموشی کسی کو نقصان پہنچاتی ہے۔ان کی چپ مالینی موسی کی چپ سے بہت مختلف ہے، مالینی موسی کی چپ میں گھٹن ہے بات کو برداشت کرنے کا حوصلہ نہ ہونے کی

وجہ سے ان کی خاموشی غم اور غصہ کے نتیجے میں جنم لیتی ہے۔ پر نرملا جی کے سکوت میں ایک گمبھیرتا ہے جو ان کے صبر اور رضا کے نتیجے میں ان کے اندر پیدا ہوئی ہے۔ٹھنڈی ٹھنڈی سی شانت ہستی کو دیکھ کر میرے اندر ایک ہی لفظ سر اٹھاتا ہے۔۔۔۔اور یہ کہ اگر اس لفظ کو میرے لئے بہت سے ایسے بزرگوں نے کہ جنہوں نے اپنے سر دھوپ میں سفید کئے ہوئے ہیں نا قابل استعمال نہ بنا دیا ہوتا۔یعنی کہ اپنی نام نہاد بزرگی کے لئے وہ لفظ احترام پر اصرار کرتے ہیں تو میں یہ لفظ نرملا جی اور صرف نرملا جی ہی کے لئے استعمال کرتی اور کہتی کہ وہ محترم ہیں، لائق احترام ہیں۔

"تم نے کھانا کھا لیا"۔ وہ دوبارہ پوچھتی ہیں۔ میں ایک گھاگ قسم کی پکی سوریا۔۔۔۔پھر بھی میں ان کے متانت اور بے حد سکون سے پوچھے ہوئے سوال کا جواب نہ گول کر سکتی تھی اور نہ ہی جھوٹ بول سکتی ہوں۔سو میرے منہ سے سچ نکلا:

"نہیں آج مینو میں کدو تھا"۔نام سے ہی مجھے ایک ڈرامہ کا منظر یاد آجاتا ہے۔ باہر لٹکتی ہوئی زبان اور اپنے حلقوں سے باہر نکلتی آنکھیں۔کدو کے نام سے ہی میرے پیٹ میں عجیب سا درد اور ابال سا اٹھنے لگتا ہے، اف تو یہ کدو تو میرے پیٹ میں گیس کے گولے سے چھوڑنے لگتا ہے۔۔۔۔۔آخ۔۔۔۔تھو۔۔۔۔نرملا جی کی بھوری آنکھوں میں تبسم کی ایک رمق سی جھلک مارتی ہے۔

"دیکھو سدھا یہ نخرے بند کرو، جو کچھ پکتا ہے وہی تمہیں کھانا پڑے گا۔ میں نے یہ بات اچھی طرح محسوس کی ہے جب بھی امتحان قریب آتے ہیں، تم عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتی ہو۔ سارا سارا دن پڑی رہتی ہو جیسے بچہ پالنے میں پڑا رہتا ہے۔۔۔۔ ذرا اپنی حالت تو دیکھو۔۔۔۔۔چلو اٹھو کھانا کھانے چلو۔شاباش"۔

بس اب یہ شروع ہو گئیں، اب پیچھا چھوڑنے والی نہیں کرائسٹ کی خالہ، دادی جی۔۔۔۔۔گاندھی کی چیلی اور مجھے پتہ ہے کہ میں اب جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی۔ جو کچھ پکا ہے وہی زہر مار کروں گی۔اس لئے کہ میں تو ایک ایسی الو کی پٹھی ہوں جو بڑوں کی بات ٹال ہی نہیں سکتی۔سو اپنے آپ کو گھسیٹ کر ڈائننگ ہال کی طرف لے گئی ہوں۔ ہال میں باتوں کا ایک طومار اور ریلا ہے جو ہال کی گرمی اور کھانے کی بو پر حاوی ہو رہا ہے۔اس ہاؤس ہاؤس میں اکثر تو بڑی محویت اور انہماک سے کھانا نگلنے میں مصروف ہیں۔ کچھ لگاتار باتوں کے درمیان کھا رہی

ہیں۔ ہر میز پر دال اور دہی کے پیالے پروسے ہوئے ہیں، چپاتیاں سخت ہیں اور دال ٹھنڈی۔ کھانا پروسنے والی لڑکی بڑے خلوص سے پوچھتی ہے:

"آپ کی دال گرم کروالاؤں؟"

"نہیں رہنے دو"۔ میں اس کو روک دیتی ہوں، اس لئے کہ مجھے پتہ ہے کہ یہ اگر دال کی کٹوری لے کر کچن میں گئی تو رسوئیا بڑبڑانے لگے گا۔ آدھا گھنٹہ گزار کر واپس آئے گی تو دال کنکنی سی ہی گرم ہوئی ہوگی اور اس پر راکھ کی تہہ بھی جمی ہوئی ہوگی۔ کدو کے موٹے موٹے ٹکڑے مرچ مصالحے میں لتھڑے ہوئے ہیں۔ میں نے پلیٹ میں آخری لقمہ اٹھا کر نگلا اور پلیٹ پرے کر دی ہے۔ یہ تو پھر بھی غنیمت ہے اور اتنا بھی بے مزہ نہیں لگتا جتنا گھر کا اچھے سے اچھا پکا کھانا اس وقت بدمزہ لگنے لگتا ہے جب ماں ہماری کرسیوں کے گرد منڈلا منڈلا کر اصرار کرنا شروع کرتی ہیں۔

"ارے کھالو۔۔۔۔ کچھ تو کھاؤ۔۔۔۔ دنیا بھر کی بیماری اور کمزوری کا ایک ہی علاج ہے اور وہ ہے کھانا۔ دیکھو نا تمہارا چہرہ کیسا اترا اترا اور پیلا ہوا پڑا ہے۔ یقیناً وٹامن بی کی کمی ہوگئی ہے تمہارے اندر۔ تھوڑا دہی اور لے لو۔ پھلکے کو گھی میں اچھی طرح تو ڈبولو۔ رات نیند نہیں آئی ٹھیک سے۔۔۔۔ ہاں تو کھانا ثقیل ہوگا نا جب ہی تو آج میں خود تمہارے لئے ہلکا کھانا بناؤں گی۔ اپنے ہاتھ سے۔ پڑھائی میں جی نہیں لگ رہا ہے کیا؟ اچھا تو پھر ایک خوراک چون، پراش کی پی لینا"۔

اب کسی کو ان کے مشوروں کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ یہ ایک دو نہیں سینکڑوں مشورے دیئے چلی جائیں گی۔ چاہے ان میں سے ایک بھی ضروری نہ ہو۔

مارچ کی گرد آلود ہواؤں کے اثر سے ہمارے سروں پر آسمان ایک خاکستری غبارے کی طرح پھولی ہوا ہے، جیسے کسی نے ہمارے سروں پر دھول کی چھتری چھا دی ہو۔ پھر بھی اس گرد اور دھول کے باوجود مارچ کی بہاریں اپنے جوبن پر ہیں۔۔۔۔ جیسے شگوفوں اور پھولوں کے رنگوں اور مہک کی کثرت نے ایک اودھم سا مچایا ہوا ہے۔ آندھیوں کی تانی ہوئی گرد و غبار کی چادر اور رنگوں کی کثرت کے درمیان ہی ہمارا سرمئی اور کالے رنگ والا ڈائننگ ہال ہے۔ جہاں مڈل کلاس کی رخصتی تقریب کا روایتی بھوجن ہو رہا ہے۔ کھانے پینے کا زور ہے۔ کھانے والیوں کی فرمائشوں پر منگوائے گرما گرم شوربوں سے بھرے پیالے دبا دب لا لا کر پروسے جا رہے ہیں۔

گھروں سے آئے ہوئے اچار چٹنیاں ایک دوسری کو پیش کئے جا رہے ہیں۔ چپاتیاں ڈبونے کے لئے گرم گرم سالن کی چھلکتی کٹوریاں لا کر رکھی جا رہی ہیں۔ گھی میں تر بتر روٹیاں آس پاس منڈلاتے کتوں کے آگے پھینکی جا رہی ہیں۔ ایک دوسرے کے بھاری بھاری، بھدے اور موٹے موٹے وجودوں پر ہمدردی محبت اور خلوص کے جذبات نچھاور کئے جا رہے ہیں۔۔۔۔۔ یہ کیا کہ گھاس۔۔۔۔ پتھر اور کھانا جیسے باہم دگر ہو کر ہم معنی اور یک جان ہو گئے ہوں۔ محبتوں، تپاک کی موہوم اور پتلی سی دھار تلے جم جانے والی گاد۔۔۔۔۔ ارے تو زندگی بے معنی ہے۔ اس کا کوئی مطلب ہے ہی نہیں۔۔۔۔۔ یا ہے کوئی مفہوم؟

"پھر تم نے کیا سوچا۔ ہمارے سنگ جانے کے بارے میں؟ " کشور اب خوب سجی بنی معقول کپڑے پہنے دھوپ میں بیٹھی اپنے گھنے بال سکھا رہی ہے۔

" کہاں؟ "ایک لمحہ کے لئے میں بالکل نہیں سمجھ سکی کہ وہ کس سلسلے میں اور کہاں جانے کی بات کر رہی ہے۔ میری آنکھیں دھوپ سے چندھیا گئی ہیں اور ایسا لگ رہا ہے کہ پھولوں کے چمکیلے اور شاداب رنگ میرے گالوں پر ٹپک رہے ہیں۔

"ارے یار !وہی فلم پر جانے کے لئے یا پھر تمہارا پہلے سے کوئی اور پروگرام بنا ہوا تھا"۔ دبی آواز میں وہ بڑے اعتماد سے بول رہی ہے۔ اس کی اس چوٹ کا مجھ پر وہی اثر ہوا جو ٹھنڈے پانی سے بھرے برتن کے اپنے اوپر الٹ جانے سے ہو سکتا ہے۔ جیسے چکنے گھڑے پر پانی پڑ جائے۔

"نہیں بھئی آج نہیں"۔

"نہیں بھئی آج نہیں کا تو یہی مطلب ہے کہ آج بھی نہیں اور کبھی بھی نہیں میری جان۔ اس لئے کہ کل کے دن تو اپنے اپنے گھروں کو چل دیں گے ہم لوگ"۔ یہ کہتے کہتے وہ گنگناتی ہوئی مڑ گئی۔ دراصل یہ اس کی کوئی دلی خواہش نہ تھی کہ میں اس کے ساتھ ضرور جاؤں، اس کی اور میری ایسی دانت کاٹی دوستی تو تھی۔ یہاں میری کسی سے بھی اتنی قریبی دوستی نہ تھی کہ جس سے دم گھٹنے لگے۔ نہ تو میرے پاس ایسے راز ہی تھے کہ میں کسی سے سر جوڑ جوڑ کر باتیں کروں، کسی کو اپنا ہمدم اور دمساز بناؤں اور اس سے بچھڑتے وقت چھاجوں روؤں۔ اتنے آنسو بہاؤں جیسے دلہنیں میکے سے بچھڑ کر سسرال جاتے وقت ہر سال بہاتی ہیں۔ ان کو اس طرح سے روتے بلکتے دیکھ

کر میرے اندر عجیب سی سختی کا احساس ہوتا ہے جیسے آم کی گٹھلی آم کے رس اور گودے کے درمیان چھپی بڑی سختی اور اعتماد سے اپنی جگہ پر محفوظ اور باقی رہتی ہے۔

"اچھا ہاں"۔ کشور نے گھوم کر پوچھا ہے۔

"یہ بتاؤ اپنی نئی چپل مجھے پہننے کو دے سکتی ہو؟ اس لئے کہ اب تم تو جا نہیں رہیں تو لاؤ میں ہی پہن جاؤں"۔

ایک بار پھر میں نے ماں کا خط پڑھنے کے لئے اٹھالیا ہے۔ جس کو میں کئی بار پڑھ چکی ہوں۔ میں ان کی آخری سطور پر پھر غور کر رہی ہوں جو انہوں نے خط کے آخر میں پچھلی طرف لکھی ہیں۔

"دیکھو آنے سے پہلے ایک بار منا چاچا کے یہاں ضرور ہو آنا۔ میں نے سنا ہے کہ ان کی طبیعت پھر خراب ہوگئی ہے، تم جانا تو ان سے کہنا کہ ماں آپ کی طرف سے بہت پریشان ہیں"۔

ہونہہ۔۔۔۔۔ میرا منہ لٹک گیا ہے اور میں نے برا سا منہ بنایا۔۔۔۔۔ پوچھ لیا تھا نہ جا کر پوچھا۔۔۔۔ پھر پوچھا۔۔۔۔ ان کی طبیعت کا حال بس جیسے ایک میں ہی تو رہ گئی ہوں۔ منا چاچا کو بار بار جا کر پوچھنے کے لئے۔ اس کے سوا مجھے کوئی کام ہی نہیں کہ جا جا کر ان کے مختلف رشتے داروں کے گھروں میں گھس گھس کر ان کی خیریتیں دریافت کرتی رہوں اور ان کو بتاؤں کہ ماں کو آپ کی طرف سے فکر ہے، پریشانی ہے، تشویش ہے۔ اب میں جاؤں اور جا کر گھنٹوں ان کے ڈرائینگ روموں یا لونگ روموں میں بیٹھ کر منا چاچا اور ان جیسے لوگوں کی باتیں چپ چاپ سنتی رہوں، مثلاً یہ کہ:

"بھئی جب مریخ زہرہ کے برج میں داخل ہو جائے گا، تب ہی ان پیٹ کی بیماریوں میں افاقہ ہوگا اور ان پر کوئی علاج کارگر ہوگا یا پھر یہ کہ دیکھو اگلے مہینے جب چاند گرہن میں آئے گا، ہاں جب راہو چاند کو گرین لگائے گا تو یہ پتے اور بلغم کی تکلیفیں پھر زور پکڑیں گی اور ابھر آئیں گی"۔

دھڑام کر کے بند دروازہ یوں کھلا جیسے کسی فلم کے منظر میں کھل جاتا ہے۔ پشی نے پیر کی ٹھوکر سے دروازہ کھولا اور اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے متعدد پیکٹ مجھ پر پھینک دیئے

ہیں۔۔۔۔۔۔میری دلخراش چیخوں کی پرواہ کیئے بنا۔

"دیکھوتو۔۔۔۔۔ڈی میں نے کیا کیا خریداری کی ہے۔ایک ایک چیز کھوج کھوج کر نکالی ہے"۔اب ہم دونوں اس کی شاپنگ کے پیکٹ کھول کھول کر دیکھ رہے ہیں۔پشی ان ہنگامہ خیز اور شور وغوغا کرنے والی ہستیوں میں سے ہے جن کے سامنے ہر ایک چیز کے صرف دو رنگ یا رخ ہوتے ہیں،خواہ وہ بات کر رہی ہو اپنے بوائے فرینڈ کی حماقتوں اور اس کے مزاج کی ہچر مچر اور تذبذب کی یا اپنے بلاوز کی سلائی کی برائی کر رہی ہو۔ایک ہی انداز،زور وشور اور پورے جوش سے بولے گی۔بولتی چلی جائے گی اور آج تو اپنی نئی چپل کے خلاف بڑے زور شور سے بول رہی تھی کہ پہنو تو آگے سے انگوٹھا دبا دیتی ہے۔پیچھے سے ایڑی کی طرف مڑ کر ٹخنوں کو دباتی اور کاٹتی ہے اور یہ چپل کا دکھڑا تو اسے پاگل کیئے دے رہا تھا۔اب مشکل تو یہ تھی کہ ایک اس چپل کی تعریف کر دی تھی۔بس ایک ہی بار کی تعریف پر وہ چپل اسے ایسی عزیز ہوگئی کہ اپنی جان اور آبرو کی طرح سینت سینت کر سنبھال سنبھال کر رکھتی ہے۔ایک بات ہے کہ ہر انسان پر بعض ایسے لمحے آتے ہیں جب وہ اپنی نرگسیت کے ہاتھوں اپنی انا کے چنگل میں آیا ہوا ہوتا ہے۔وہ ایسے لمحات میں ایک سوئے ہوئے بے خبر بچے کی طرح ہو جاتے ہیں اور ان کے باطن میں چھپی ہوئی ہر بات اور بھید کھل کر سامنے آ جاتا ہے اور یہی وہ سمے ہوتے ہیں جب ان کو ان کے ان جانے میں چپ چاپ دیکھنے میں مجھے بڑا مزا آتا ہے۔مثلاً جب کوئی ادھیڑ عمر عورت اپنے لمبے اور گھنے بالوں میں کنگھی کر رہی ہو، بچے کنچے کھیلنے میں محو ہوں یا کوئی مرد پنواڑی کی دکان پر سگرٹ سلگانے کے بہانے آئینہ میں اپنی صورت دیکھ رہا ہو تو یہی وہ لمحے اور وقت ہوتا ہے کہ جب ان کی اصل،ان کی انا اور اندر کا بھید اپنے خول سے باہر نکل کر سامنے آ جاتا ہے۔

پشی کو آج رات کی گاڑی سے روانہ ہونا تھا اور اس میں جو بڑا آ آ خا آ آ ص نکتہ تھا وہ یہ کہ اس کا بوائے فرینڈ بھی اسی ٹرین سے سفر کر رہا تھا۔

"ارے بھئی کیا گاڑی اس کے شہر تک بھی جاتی ہے؟ " کشور پھر اپنے دانتوں پر کنگھے کے دندانے پھیرتی ہوئی آ کر دروازے سے لگی کھڑی تھی۔

پشی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"ارے نہیں بھئی اس کو آگرے پر گاڑی بدلنا پڑے گی۔وہاں سے دوسری گاڑی

پکڑے گا، پر چند گھنٹوں ہی کا تو فرق پڑے گا"۔

"تو گھر ساتھ لے جاؤنا"۔ کشور نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم اپنے پتا سے کہنا دیکھئے میں آپ کے لئے کیا تحفہ لائی ہوں اور یہ اس دور افتادہ پسماندہ جگہ میں اپنے وجود سے جان ڈال دے گا"۔ پشی کے پتا کی بہت بڑی زمینداری اور کھیتی باڑی ہمالیہ کی ترائی کے علاقے میں تھی اور اس کے گھر والے واقعی روپے میں کھیل رہے تھے اور جیسا کہ پشی کی باتوں اور بیان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شہری علاقوں کے انگریزی طور طریق سے متاثر انگریزی دان زمینداروں سے بہت مختلف قسم کے لوگ تھے۔ ان کی دنیا، بہت ہی مختلف اور الگ قسم کی تھی، ان کا رہن سہن اور نظریہ زندگی بہت قدیم انداز کا تھا۔ وہی حیوانی قسم کی جنسی اور جسمانی زندگی اور اس میں جنم لینے والی سازشیں۔ اس کے باپ چچاؤں کا یہ تھا کہ ہر سال ہی کسی غریب مزدور بچے یا کمی کمیرے کو کسی بات پر اتنا مارتے کہ وہ دم توڑ دیتا یا پھر ان کی عورتوں پر ہاتھ ڈالتے، ان کو بے آبرو کر کے چھوڑ دیتے۔ سال کے چھ مہینے وہ دنیا بھر سے کٹی ہوئی الگ تھلگ ترائی کے دامن میں اپنے مویشیوں، جنگلی جانوروں اور وحشی قبائل کے درمیان گزارنے کے بعد ان کی تفریح کا واحد ذریعہ بدیسی شرابیں اور عورتیں ہیں۔ جب ان پر رنگ رلیوں اور عیاشیوں کا دورہ پڑتا ہے تو پشی کی ماتا گھر چھوڑ کر وہاں سے اپنے قصبے والے گھر میں رہنے چلی جاتی ہیں۔ وہاں پہنچ جاپ جی صاحب تک پہنچنے کی تیاریوں میں لگ جاتی ہیں یا پھر قالینوں کی صفائی میں جٹ جاتی ہیں اور پھر جب مردوں پر سے رنگ رلیوں، عورت اور شرابوں کا بھوت اتر جاتا ہے تو عورتیں گھروں کو واپس آ جاتی ہیں۔

"ہمارے یہاں تو عورت کو جوتے سمان سمجھا جاتا ہے۔ پر ایک بات ہے جوتے کو رکھتے خوب ہیں، پالش لگا کر خوب چمکا کر"۔

پشی اونچے اونچے قہقہے لگا کر کہتی ہے:

"یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ وہ اپنے بوائے فرینڈ سے کبھی بھی بیاہ نہ کر پائے گی۔ اس لئے کہ وہ کم حیثیت اور ذات کا بنیا ہے۔ اور یہ کہ پشی کو اس بات کا کوئی غم بھی نہیں، کوئی دکھ نہیں وہ اپنی تقدیر اور کرم کے لکھے پر راضی ہے۔ اس حقیقت کے آگے سر جھکا لے گی کہ وہ بھی جوتا ہے تو جوتے کو چمکا کر پالش کر کے ہی رکھنا ہے۔ وہ بھی کسی اپنے باپ، چچا جیسے ہی سے بیاہ کر جائے گی

اور جیسے اس کے پتا اپنی ہر عیاشی کے بعد ماتا کی واپسی پر ان کے لئے سونے کے نئے زیورات آرڈر دے کر منگواتے ہیں، قیمتی ریشمی لباس بنواتے ہیں کہ ان کا کہنا ہے کہ عورت تو سجا بنا کر نک سک سے درست رکھنے کی چیز ہوتی ہے اور یہ دھرو ٹائپ کی داشتائیں بھلا اس کے ٹھاٹ باٹ کا کیا مقابلہ کریں گی۔ کہاں وہ اور کہاں بیوی۔۔۔۔۔ وہ جانتی ہے کہ یہی کچھ اس کے ساتھ بھی ہونا ہے، جب وہ یہ سب بتا رہی تھی تو اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ بالکل میری ماں کی طرح۔ اچانک ہی میرا دل چاہنے لگا کہ وہ میرے کمرے سے باہر نکل جائے اور جب پٹی کمرے سے نکل گئی تو اپنے پیچھے کر سچین دیور کی بھینی بھینی خوشبو چھوڑ گئی۔ (جو پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔ نیویارک والے انکل نیو یارک والے انکل) خون جیسی گاڑھی گاڑھی مارچ کی تیزی ہوائیں میرے کمرے کے دروازے سے آ کر اس طرح ٹکرا رہی ہیں جیسے کوئی کھویا ہوا کتا واپس دروازے کو کھرونچ رہا ہو۔

"اچھا ٹھیک ہے پھر یہ بتاؤ یہ سب کہاں سے شروع ہوا۔ میرا مطلب ہے کہ اگر تم سچ مچ اور واقعی سوچنا چاہو تو"۔

"آ گیا ہے۔۔۔۔۔ وہ آ گیا ہے۔۔۔۔۔ "بابو کی آواز سنائی دی ہے۔ ماں نے ہلکی سی جمائی لے کر اپنا رومانی ناول ایک طرف ڈال دیا ہے۔ بھیا اندر آئے ہیں۔ میں اور چھوٹا شطرنج کی قسم کا ایک کھیل کھیلنے میں جٹے ہوئے ہیں۔ آنے والی چیخ چیخ اور ہنگامے کے خیال ہی سے ہم دونوں ٹھٹک کر رہ گئے ہیں۔

کسی بے وقوف کے ہاتھ سے کچن میں کوئی چیز چھوٹ کر گر گئی ہے۔ دھڑ سے آواز آئی ہے۔۔۔۔۔؟ کیوں بھئی یہ طریقہ ہے۔ ایسی ہی حرکتیں کرنا چاہیے؟ "بابو کی آواز میں تیزی اور غصہ ہے۔

"ارے کچھ کھاؤ گے کہ کھا کر آئے ہو؟ "ماں کی آواز میں کچھ تو شہیدانہ پچ ہے۔ ایک چوتھائی بے تعلقی سے اور کچھ بلکہ تقریباً آدھا تو ملامت اور مذمت کا انداز ہے۔ جیسا کہ تناتنی اور کھنچاؤ کے نتیجے میں دبی ہوئی سرکشی اور بغاوت سر اٹھاتی اور اپنا رنگ دکھاتی ہے وہی ہو رہا ہے۔

"صبح سے شام تک لوگ مبارکبادیاں دینے آ رہے ہیں اور صاحبزادے کا کوئی پتہ نہیں۔ سارا دن گھر ہے کہ بھائیں بھائیں کرتا، سنسان پڑا رہتا ہے۔۔۔۔ "بابو کی آواز ان کے گلے میں پھنس کر رہ گئی ہے۔ چھوٹے کو ہنسی آ رہی ہے۔ میں نے زور سے چٹکی لے کر اس کو ہنسنے

سے باز رکھا ہے۔ بھیا پر ان تمام باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا ہے ایک کرسی میں لاتعلقی سے دھنس کر انہوں نے ایک میگزین اٹھالیا ہے۔۔۔۔۔شاباش ہے۔۔۔۔میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ ہماری فیملی بڑی تھیٹریکل قسم کی ہے اور اس بات کا ثبوت اور گواہی ان کی ایک ایک ادا اور حرکت سے ملتا ہے۔بس سمجھو چھاپ لگی ہوئی ہے۔

"ارے کچھ تو کھالو۔۔۔۔۔۔اور نہیں تو اپنی من پسند۔۔۔۔۔"

"میں نے کہا نا۔۔۔۔۔نہیں"۔

دونوں ہی طرف آنکھوں سے برستی چنگاریاں اور خاموش غصے کا تبادلہ۔۔۔۔۔۔

ماں اور بابو منظر سے نکل کر اسٹیج سے اوجھل ہو گئے ہیں۔گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح میری ناف کے اندر دھک دھک ہونے لگی۔

"یہ بتاؤ تمہارے پاس ان لینڈ لیٹر فارم ہے"۔دبے پاؤں بلی کے قدموں چلتی ہوئی سروجی نے دروازے ہی میں کھڑے کھڑے پوچھا ہے۔میں چونک کر اچھل پڑی ہوں، جیسے دل اچھل کر حلق میں آ گیا ہو۔اپنے سینے کو دونوں ہاتھوں سے دبا کر تقریباً دہری ہوتے ہوئے میں نے کہا ہے:

"سروجی تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا، بھلا مجھ بے چاری کو ڈرا کر تم کو کیا ملے گا اور جو یہ میرا ننھا سا دل بند ہی ہو جاتا تو۔۔۔۔۔"

سروجی ان لینڈ لیٹر فارم لئے ہنستی ہوئی چل دی ہے۔بدقت تمام اپنے آپ کو گھسیٹ کر کھڑا کرتی ہوں کہ دفتر میں جا کر دستخط تو کرآؤں۔دل ہی دل میں یہ سوچتی ہوئی چل پڑی ہوں کہ کیا ایسا ممکن ہے، ستاروں کی چال کے اثر میں آ کر امتحانوں کے قریب اسٹرائیک ہو جائے اور کچھ نہیں تو اگلے شمارے کے ٹوائن بی میں یہی لکھ دیا جائے کہ پچھلے سال جب زحل اور زہرہ ستاروں کا ملن ہوا اور وہ جدی کے مدار میں داخل ہوئے تو یونیورسٹی میں اسٹرائیک ہو گئی تھی۔ایک مرتبہ بھیا نے یہ بات کہی تھی کہ مکانوں کا ماحول اور فضا اپنے مکینوں ہی کے مزاج کے مطابق ڈھل جاتی ہے۔جیسے ایک وکیل کے گھر پر قانون اور وکالت ہی کی چھاپ اور چھایا نظر آئے گی اور جاہلوں کے گھروں پر جہالت ہی برستی ہے۔انہوں نے جب یہ بات کہی تو میں اور چھوٹا مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گئے۔منا چاچا بابو کے دور دراز کے رشتہ کے بھائی لگتے ہیں۔ہوسٹل کے رجسٹر

میں ان کا نام میرے گارجین کے طور پر لکھا ہوا تھا۔ اس لئے کہ وہ اسی شہر میں رہتے تھے۔ ان کی کچھ موروثی جائیداد ہمارے شہر میں بھی ہے اور اسی سلسلے میں ان کا آنا جانا رہتا ہے۔ وہ جب آتے تو ہمارے ہی گھر پر ٹھیرتے۔ ان کی آمد پر ہمارے گھر کا نقشہ ہی بدل جاتا، جدھر دیکھو جنتریاں، جنم پتریاں ہی پھیلی نظر آئیں۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ ہمارا کچھ نہیں بلکہ مشہور و معروف نجومی ستارہ شناس بھری گو کا مسکن ہے۔ چائے پر چائے پی جا رہی ہے، سیاست پر دھواں دار تقریریں ہو رہی ہیں۔ پیشین گوئیاں کی جا رہی ہیں، سیاست کا سارے کا سارا الٹ پھیر ستاروں کی چال ہی پر منحصر ہے۔۔۔۔۔ ہر طرف ایک چوندھیا دینے والا ماحول، خوشیوں کی نوید اور خوش آئیند دریافتیں اور افواہیں۔۔۔۔ باہر کتے بھونک رہے ہیں۔ زنجیروں سے بندھے قیدی کتے، رات کے اندھیرے میں غرا رہے ہیں، اپنی ناخوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔ کون ہے؟ کون ہے؟ کون ہے بھئی۔۔۔۔ ایک ستارا ٹوٹتا ہے۔۔۔۔۔ بار بار نیچے کی طرف ٹوٹ کر گرتا ہے، لیکن میرا جزیرہ نما، میری کھاڑی اپنی جگہ پر قائم اور اپنی ہی کلی پر گھوم رہی ہے۔ وہی ڈھرا وہی شام و سحر وہی روز و شب۔

چڑیاں بول بول کر پاگل ہوئی جا رہی ہیں اور کھانوری کتیا، اپنا پورا وجود پھیلائے دھوپ سینک رہی ہے۔ ذرا اس کے تھن تو دیکھو، اس نے کولر کے پیچھے ساتھ پلوں کو جنم دیا ہے۔ کام کرنے والی لڑکیوں کا غول کا غول اس کو دیکھ دیکھ کر کھل کھل ہنستا یہاں سے گزر رہا ہے۔۔۔۔۔ اچھا ٹھیک ہے بڑھو۔ پل پل کر بڑے ہو۔ جھپٹو، بھونکو اور کاٹو۔۔۔۔۔ اور اب میرا جی چاہ رہا ہے کہ کوئی ان پلوں کو مار کر ان کا کام تمام کر دے، ان چڑیوں کو مار ڈالے اور اس کم بخت کتیا کو بھی۔

ارے میرے بول ان پر کیا اثر کر سکیں گے، اس گھر پر تو جیسے راہو کا سایہ پڑ گیا ہے اور اس گھر کی چاندنی کو گرہن لگ گیا ہے۔ ماں اپنے بہنوں کے آگے ہمارے ہی دکھڑے کر رہی ہیں۔ انہوں نے اپنا چشمہ اتار کر آنکھوں کو بڑے ڈرامائی انداز میں ملا ہے۔

"ارے تم نے کبھی دونوں ہاتھوں کا دکھ بھی لیا ہے؟ ہمارے پڑوسیوں کی بلی کدو کی بیل کے پھولوں کے پیچھے چھپی ہنس رہی ہے اور شاید یہ بھی چنتیائر بلی کی طرح خود تو غائب ہو جائے گا اور پیچھے صرف اس کی ہنسی ہی رہ جائے گی۔ دیوار پر سے جھانکتی ہوئی"۔

ماں کے بلاؤز کی بغلیں پسینے میں بھیگ بھیگ کر جیسے آدھے چندر ماں کا نقشہ بنا رہی ہیں۔ان کی کنپٹیوں پر سفیدی جھلکنے لگی ہے۔ مالینی موسی ان کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہیں کہ بھئی تم تو اپنے بچوں پر جان دیتی ہو ضرورت سے زیادہ دم چھڑکتی ہو۔۔۔۔۔اور بھئی وہ تو ان مادی اور ارضی تعلقات سے اور اپنے بڑھے ہوئے پیٹ سے پیچھا چھڑانے کے لئے صبح صبح اٹھ کر یوگا کے آسن کرتی ہیں۔ ہاں تو اور کیا پورے ایک ہفتے روکھے توس اور بنا دودھ کی کافی پر گزارا کرتے ہیں۔ پورے ہفتے اپنے پتی، اپنے بچوں اور نوکروں کو ڈانٹتی اور پھٹکارتی رہتی تھیں۔ایک دفعہ ہی ان کو خیال آتا کہ جہنم میں جائے یہ یوگا اور ڈائٹنگ اور پھر وہ بھرے ہوئے پراٹھوں، چاکلیٹ اور آئس کریم پر اتر آتیں۔بس اسی طرح باری باری وہ سارے ہی کام کرتی رہتی ہیں۔ ایک ہفتہ پورا ڈائٹنگ میں گزار دیں گی تو ایک مہینہ میوزک کے ریاض کرنے میں لگا دیں گی۔ایک سال پینٹنگ میں جتی رہیں گی تو سال ڈیڑھ سال فرنچ سیکھنے میں گزر جائے گا۔ پر قصہ یہ ہے کہ جہاں وہ ایک کام کرنا شروع کرتی ہیں، ان کو لگنے لگتا ہے کہ یہ تو یوں ہی فضول کام ہے بے کار ہی اس میں سر کھپانا۔

موسیوں کا تین رکنی بنچ ہمارے کیس کے بارے میں فیصلہ کرنے بیٹھتا ہے اور ہوتا یہ ہے کہ پہلے تو مالینی موسی میری طرف دیکھتے ہوئے ماں سے کہتی ہیں:

"ہاں بھئی یہ تو سچ ہے کہ اس گھر میں کوئی بھی تو ایسا نہیں جس کو تم اپنا کہہ سکو، اپنے بھروسے میں لے سکو"۔

اس پر شالینی موسی ٹکڑا لگاتی ہیں، اپنے مخصوص اٹھلائے ہوئے لہجے میں، مجھ سے مخاطب ہو کر کہتی ہیں:

"یہ تو غلط بات ہے نا کہ کوئی اپنی ماں سے ایسے لہجہ میں اس طرح بات کرے دیکھو تم تو بڑی سمجھ دار لڑکی ہو۔تمہیں تو ایسا کرنا ہی نہیں چاہیے۔اچھا تم چاہتی کیا ہو؟"

"میں۔۔۔۔۔میں کیا چاہتی ہوں؟ اب کیا بتاؤں مجھے تو خود بھی نہیں پتہ چلتا۔اخبار اٹھا کر اشتہارات کا صفحہ دیکھتی ہوں، کسی ایسی نوکری کی تلاش میں کہ کسی دور افتادہ جگہ پر جا کر سب سے الگ کوئی نوکری کر لوں، مگر دل نہیں ٹھکتا۔۔۔۔۔لیکچرر کی ملازمت، کیا ملے گا۔ بڑھیا ساریاں، سفید چاک کی نتھنوں میں گھستی بو۔۔۔۔داڑھیوں والے باتونی رفقائے کار۔۔۔۔جو

باتیں بھی خوب کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔چائے بھی بے تحاشہ پیتے ہیں اور میز کے نیچے اپنی ٹانگیں بھی خوب ہلاتے ہیں۔۔۔۔۔۔چلو یہ خیال بے تابی سے ستاتا، ریسپشنٹ کی ملازمت تلاش کرتی ہوں۔اس کا یہ ہے کہ ہر دم ایک انچ چوڑی مسکراہٹ چہرے پر سجی ہوئی۔خوشبو میں بسی ساری پن کے سہارے جمی ہوئی۔ پھر دوطرفہ بات چیت کا جواب اور باتیں خصوصاجب بزنس ایگزیکٹو کا آفٹر شیو فرنچ لوشن میں بسا اور مہکتا چہرہ بے حد قریب ہو۔۔۔۔۔۔چلو ہٹاؤ اسے بھی، اچھا اب آرٹسٹ کی ملازمت۔۔۔۔۔۔ہاں تو گھر کی بنی کھدر کی ساری خاص بنیادی رنگوں میں، ڈھیروں شراب، چاندی کے زیورات اور ڈھیروں ڈھیروں مرد دوست بے تکلف اونچے اونچے قہقہے لگاتے، مخمور اور چڑھتی ہوئی آنکھیں صبح سے ہی آجائیں گے کام پر۔۔۔۔ایک مرتبہ میں نے یہ بھی چاہا کہ کیوں نہ دروپدی بن جاؤں۔کسی کے آنے پر کوئی پابندی نہیں ہر طرح کا مرد آتا ہے اور پھر زندگی سے نکل جاتا ہے، جو بھی محبت کی پیش کش کرے اسی کے حوالے اپنا آپ کر دیا۔آسان اور بہت سیدھا سادھا طریقہ ہے۔پر باپ رے میرے لئے یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ مرد جنہیں میں گھروں میں رہتے، بسوں اور ٹرینوں میں سفر کرتے دیکھتی ہوں۔ان کے تو خیال سے ہی باز آئی۔ مجھے ان ڈھیروں اور بے شمار آدمیوں کا کوئی ٹرسٹ ڈیپازٹ تو قائم کرنا نہیں۔یہ تو اس قسم کے مرد ہیں کہ تمہیں اپنی غیر منقولہ جاگیر اور جائیداد بنا کر رکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔تمہارے چاروں طرف خاردار تاروں کا مضبوط جنگلہ لگا کر ایک بورڈ پر بڑا بڑا لکھ کر ٹانگنے والے لوگ کہ یہ شارع عام نہیں ہے۔۔۔۔۔۔یہ بھی ممکن نہیں، چلو جانے دو۔اب کوئی دوسری راہ نکالیں گے"۔

7 edulcni$[-d:\work\mashil\bmashml]

میں نے دفتر میں رجسٹر پر دستخط نہیں کئے اور یوں ہی چلی آئی ہوں۔اس لئے کہ اچانک ہی مجھے لگا کہ میں منا چاچا کے یہاں نہیں جانا چاہتی۔ٹھیک ہے اگر ماں نے پوچھا تو کوئی بہانہ بنا دوں گی۔شکر ہے کہ ابھی میرے ترکش میں بڑے تیر ہیں، میری تھیلی میں بہت سنگریزے باقی ہیں جو میں اپنی شاٹ گن میں بھر بھر کر چلاتی رہوں گی۔ہاں یہ بھی ایک راہ ہے کہ آدمی دوسروں کے لئے ایک اچنبھا بن جاؤں، ان کو حیران اور سراسیمہ تو کر دوں۔ میں مانتی ہوں یہ بھی کوئی آسان کام نہیں، بلکہ بہت مشکل ہے پر یہ بھی تو دیکھنا ہے کہ اور دوسرے راستے کون سے اچھے اور بہتر ہیں۔

MashalBooks.org

کشور بجی بنی ایک بار پھر پانچ چھ لڑکیوں کے سنگ آئی ہے۔ "دیکھو اب بھی چاہو تو ہمارے ساتھ چلی چلو"۔ میں انکار میں سر ہلا دیتی ہوں اور وہ چل دیتی ہے، میری نئی چپل کی پھٹ پھٹ آواز نکل کر ادھر ادھر پھیلاتی ہوئی۔

"ٹن"۔ کسی بات کے لئے گھنٹی بجی ہے، کبوتروں کے ایک جوڑے نے پر پھڑ پھڑائے اور پرواز کر گیا۔ میرے دل پر خوف اور دہشت کا باریک اور سفید جال سا چھا رہا ہے۔ فضا میں آندھی کا تناؤ ہے۔ خاک دھول اور بھوسہ خس و خاشاک۔ سہم کر میں نے خود اپنی ہی کائی کو مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے۔ دل پر سفید جالا سا بڑھ رہا ہے۔ خوف کا رنگ کالا نہیں سفید ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ لیلا مترا نے مجھے بلایا ہے۔ آ کر ملو۔۔۔۔۔ وہ میری ہمدرد اور بھلا چاہنے والی ہیں۔ ارے میرے بہت چاہنے والے بہی خواہ ہیں۔ پر میں کروں کیا، لوگوں پر سے بھروسہ اٹھتا جا رہا ہے۔

"پیارے بھائیو اور بہنوں میں آپ کو آگاہ کرتی ہوں اور بتاتی ہوں کہ میں اتنی ہمدردی محبت اور آپ کی مہربانی کے قابل نہیں ہوں۔ میرا کام آپ کو آگاہ کرنا تھا، سو کر دیا۔ آگے فیصلہ کرنا اور میری بات پر کان دھرنا نہ دھرنا آپ کے اپنے اختیار میں ہے۔ پر مجھے جو کہنا تھا کہہ چکی۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی"۔

"تمہاری امتحان کے لئے تیاری کیسی ہو رہی ہے؟ "لیلا مترا نے سوال کیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اب مجھے کسی اور جرم میں ماخوذ کیا جائے گا۔ ملزم ٹھہرایا جائے گا۔۔۔ ڈر کے علاوہ میں سوچ رہی ہوں کہ لیلا مترا کیا تمہیں پتہ ہے کہ تمہاری مسیں بھیگ رہی ہیں، ہونٹوں پر بال آ رہے ہیں اور اتنے لمبے کہ تم چاہو تو ان کو منہ میں لے کر چوس سکتی ہو۔

"ہنسومت۔۔۔۔۔ !" لیلا مترا کی آواز سرخ نشان لگانے والی پنسل کی طرح نوکدار ہے۔ گھڑی گھڑائی۔

"میری بات کا جواب دو۔ یہ بتاؤ کوئی ارادہ ہے اس برس اچھے اور بہتر نمبر لینے کا؟"

میں تو۔۔۔۔۔ میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آپ کو کیا۔۔۔۔۔۔ یہ آپ کا سر درد نہیں، میں ایک بدنصیب انسان ہوں، کوئی ٹیلیفون ڈائریکٹری نہیں۔ ہونہہ ! کہ آپ اٹھائیں ہاتھ میں پکڑیں اور اسی وقت نمبر اور پتہ ڈھونڈ ھ نکالیں۔ کیوں آخر مجھے بھی تو پتہ چلے کہ میرے ساتھ یہ

رویہ اور برتاؤ کیوں کیا جا رہا ہے۔

"دیکھو ہمیں تم سے بڑی آشائیں تھیں، اچھی امیدیں۔۔۔۔۔ لیلا مترا کی مونچھیلی آواز میں جذبات کی لرزش ہے، جب تم نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو ہم سب کو بڑی آس تھی اور یہی کہتے تھے کہ یہ لڑکی تو بہت آگے جائے گی۔ شروع شروع میں تو تم نے بہت اچھا کیا۔ پر امتحان میں پچھلے سال کیا ہو گیا کہ میں تو ہل کر ہی رہ گئی۔ میں بتا نہیں سکتی کہ مجھے کتنا دکھ ہوا تھا"۔ لیلا مترا کا چوکور چہرہ پیشہ ورانہ مایوسی ناکامی کے اثر سے لرز رہا تھا، پر میرا اپنا دل تو پتھر ہو چکا ہے۔ ذرا جو اثر ہوا ہو اس پر ان ساری باتوں کا۔۔۔۔۔۔ ارے یہ میرا احمق دل۔

"تمہاری صحت تو ٹھیک ہے نا۔۔۔۔؟ "جب ایسی تفتیش اور پوچھ گچھ کے دوران ان لوگوں کی آوازوں میں نرمی اور دلداری کا عنصر غالب آنے لگتا ہے تو میں اور بھی چوکنی ہو جاتی ہوں، جیسے خطرے کی گھنٹی یا روشنی سے بندہ بھڑک اٹھتا ہے اور میرے اندر جیسے کوئی خبردار کرنے لگتا ہے۔ ہوشیار خبردار۔۔۔۔ لڑکی اب یہ تم پر کڑی نگرانی کر رہے ہیں۔ تمہاری ٹوہ لے رہے ہیں۔

" گھر خط بھیجتی رہتی ہو پابندی سے؟"

"جی!"

"ماتا جی ٹھیک ہیں؟"

"جی!"

"اچھا انہیں میرا نمسکار کہنا۔ بڑی اچھی خاتون ہیں۔۔۔۔۔"

میرا ذہن ابھی سے بھٹکنے لگا ہے۔ لیلا مترا کی شفاف اور دوستانہ آواز اب میرے گھرانے کر روشن قطب تاروں کی بات کر رہی ہے۔ تم خود سوچو کہ اتنی زبردست مایوسی اور فریب کے بعد جو تم نے ان کو دیا ہے تم یہ چاہتی ہو کہ تمہارے گھر والے تم سے خوش رہیں۔

لیلا مترا۔۔۔۔ تم بھول رہی ہو کہ تمہارے گھر والوں نے بھی تمہاری شادی کی مخالفت کی تھی۔ اس بنا پر کہ تمہارا پریمی تمہارا بندھو کسی دوسری ذات اور گھرانے سے تھا اور پھر جب وہ منظر سے اوجھل ہوئے اور اسٹیج چھوڑ کر غائب ہوئے تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔ تم جوانی کی سرحدوں کو پار کر چکی تھیں اور اس کی علامت کے طور پر تمہاری مسیں بھیگ رہی تھیں۔ ہونٹوں پر

بال اگ آئے تھے۔ جوانی تم پر اپنے دروازے بند کر چکی ہے۔ تمہاری ماہواری بند ہو چکی ہے اور اب تو اس کے سر کے بال بھی جھڑنے لگے ہیں۔ ٹھیک ہے وہ اب بھی تمہیں چاہتا ہے اور اپنی لازوال محبت کی قسم کھاتا ہے پر تم ہی اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سچ سچ بتاؤ کہ اب بھی گیا وقت واپس آ سکتا ہے۔

پلیٹ فارم پر بڑی بھیڑ تھی، وہی چھٹیوں کے زمانے کا بھیڑ بھڑکا۔ میں اپنا سامان قرینے سے لگا کر کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ کتابیں اور رسالے بیچنے والا اپنا پہئیوں لگا اسٹال لے کر آ کھڑا ہوا تھا۔ انگریزی میگزین اور نئے نئے رسالے وہی ملز اینڈ بون کے اور پیری میسن کے ناول کتابوں ور رسالوں کے درمیان ٹٹولتے اور کتابیں نکالتے، اس کے ہاتھ جھریائے ہوئے ہیں، اس کی پھٹی ہوئی قمیض کے کف جھول رہے ہیں، جن پر پھوہٹرین سے رفو کیا گیا ہے۔ یہ سب دیکھ کر طبیعت مکدر ہو رہی تھی۔ ماں کے لئے میں نے ناولوں کے دو سیٹ لے لئے اور چھوٹے کے لئے گوری تھیرلرز کے دو سیٹ خرید لئے۔

اب ہم سب مل کر ان چیزوں کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھ ڈالیں گے۔ میں نے کہا نا کہ ہمارے گھرانے میں ہر ایک کے اندر ایک تھوڑا تھوڑا ناٹکی کار رچاؤ ہے۔ بجز ہماری ماں کے۔ یہ مطلب نہیں کہ ماں کے اندر یہ لٹک ہے ہی نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ماں کے اندر یہ لٹک اوروں سے دس گنا بڑھ کر ہے۔ ان کی ہر ادا فطری ہے، کسی قسم کی بناوٹ یا کوشش قطعی نہیں۔ ان کو اپنی ذات پر پکا وشواس اور بھروسہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہماری طرح اپنی تعریف سن کر شرماتی نہیں ہیں بلکہ بڑے اطمینان سے بیٹھ کر سن سکتی ہیں۔ ان کو اپنی ذات اور اپنے آدرشوں پر اتنا وشواس ہے کہ بعض وقت تو میری سانس رکی کی رکی رہ جاتی ہے۔ بابو سے اپنی شادی کے بعد وہ مسلسل اور لگاتار ان کی اور ان کے گھر کی خدمت میں لگی ہوئی ہیں۔ دو عالمی جنگوں اور جنرل الیکشنوں کے علاوہ اپنے بچوں کے پیٹ میں آنے اور پیدائش کے باوجود ان کے کاموں کے ڈھرے میں کوئی رکاوٹ یا فرق نہیں آیا۔ وہ اسی طرح کھانے بنانے، بچوں کی دیکھ بھال اور کپڑوں لتوں کی تیاری میں جٹی رہتی ہیں اور ان کے کاموں میں کوئی خلل نہیں پڑتا۔ وہی ہر کام اپنے وقت پر انتہائی پابندی سے انجام دینا بچوں کی تمام ضروریات ان کے سردی گرمی کے کپڑوں کی تیاری ان کی سالگرہوں کے دن تاریخ یاد رکھنا۔ سردیوں میں گاجر کا حلوہ، بلچی کا اچار۔ گرمیوں میں آم کا پنا، لیموں کے

شربت کی تیاری۔ ہر کام اور بات اپنے اپنے وقت پر یوں ہوتی جیسے آپ ہی آپ خود کار طریقے پر اپنے وقت پر ہو جاتا ہو۔ خاندان بھر کی شادیوں بیاہوں کی دن تاریخ شادیوں کی سالگرہیں یہ سب ان کی نوک زبان پر تھیں پھر یہ موقع موقع کے لئے ملبوسات کی تیاریاں۔ ان کے نمونے اور ڈیزائین جوڑوں کے رنگوں کی مناسبت سے زیوروں کا انتخاب۔ ان کی یادداشت اور حساب کتاب سے ہونے والے اندازوں کا یہ عالم کہ کسی کے منجھلے بچے کی پیدائش کے بارے میں معلومات کرنا ہوں تو وہ کچھ واقعات کے حوالوں سے انگلیوں پر کچھ حساب کریں گی اور پھر کچھ عدد گھٹائیں گی اور کچھ جمع کریں گی لو بھئی دن تاریخ اور پیدائش کا وقت تک بتا دیں گی، بالکل ٹو کم ٹوک صحیح اور یہی نہیں پیدائش کے وقت بچے کی صحت اس کا وزن اور ماں کی زچگی کے وقت ساری تکلیفیں، پیچیدگیاں اور سارے مرحلے بڑی جزئیات اور صحت کے ساتھ یاد رکھنے والی ماں کی زندگی ایک ہی محور کے گرد بڑے تسلسل سے وقت اور قاعدے کی پابندی کے ساتھ چلتی چکی گھومتی رہتی ہے۔ اس گردش شام وسحر میں وہ ہم سب کے درمیان اپنی گدی اپنے استھان پر شفیق اور مہربان بدھا کی طرح بیٹھی ہوتی ہیں۔ بہت شانت اور مطمئن اور ہم سب ان کے اردگرد ایک ڈور میں بندھے پالتو اور سدھے ہوئے بندروں کی طرح ناچتے رہتے ہیں۔ رہتے ہیں یا کبھی ناچا کرتے تھے۔ پر اب نہیں۔ یوں کہ اب زمانہ بدل گیا ہے، اس وقت سے جب سے ہم نے ہوش سنبھالا یعنی جب سے ہمارے اندر احساس اور شعور نے انگڑائی لی ہے۔ اب یہ ہے کہ اب تو منا چاچا کا وہ سارا جوتش اور شبھ بھاگوان اور ابھاگ کا گورکھ دھندا اور ان کی وچاری ہوئی پیشین گوئیاں ماں کی کوئی مدد نہیں کر پا رہی ہیں۔ میرے دونوں بھائی اور میں ان کے لئے کسی اور ہی سیارے سے آئے ہوئے لوگ ہیں جنہوں نے ہماری شکلیں اور بہروپ دھار لئے ہیں۔ ایسے منحوس اور ابھاگی تارے جو اپنے برج اور کلی سے نکل کر یہاں بھٹکے بھٹکے پھر رہے ہیں۔ پر نہ جانے کیا بات ہے کہ اس اکیلے کمپارٹمنٹ میں بیٹھ کر کسی نامعلوم اور انجانی وجہ سے میری ٹانگیں ابھی بھی کانپ رہی ہیں اور پلیٹ فارم پر لوگوں کے بھیڑ بھڑ کے کو دیکھ دیکھ کوئی چیز ہے کہ میرے حلق میں پھنس رہی ہے۔ مجھے پتہ ہے اور پکا وشواس ہے کہ آدمیوں کے بہتے ہوئے ریلے اور بھیڑ میں شامل ان گجریوں اور پریوں جیسی سندر ناریوں اور چوڑے چکلے سینوں اور مضبوط قد کاٹھ والے گھبرو جوانوں کے مقابلے میں میرا مغز اور ذہن بہت برتر اور اونچا ہے اور یہ کہ یہ سارے سندر اور خوش

خوش نظر آنے والے جوڑے تخلیق اور پیدائش کے عمل سے گزرنے کے بعد ایک دوسرے کی صورتوں سے بیزار اور ایک دوسرے کے سائے سے بھی دور بھاگیں گے۔ جبکہ میرا من آزاد اور کھوٹ سے پاک ہری بھری چراگاہوں اور گھاس کے میدانوں میں دوڑتے جنگلی خرگوش کی طرح چھٹا پھرے گا اور یہ لوگ اتنی دیر میں اپنی جھوٹی تسلی کے لئے اپنے اور چھور نہ جانے کیا کچھ اکٹھا کر چکے ہوں گے۔ مالی اسباب، گھربار، بال بچے، پھولوں سے بھرے گلدان اور پالش سے چمچماتی مہاتما بدھ کی پیتل کی مورتیاں اور ہر روز دھول جھاڑ جھاڑ کر الماریوں میں سجائی ہوئی پینگوئین ماڈرن پوئٹس کی کتابیں، اجلے اجلے سلیقہ منداور سجے سجائے گھروں میں جب ان کے بچے اپنے اسکول اپنے نتیجوں اور پڑھائی میں اعلی درجے کی رپورٹیں لے کر گھروں کو لوٹا کریں گے تو ان کو ایسا لگے گا جیسے جیون بھرپور اور مکمل ہے اور جب کبھی وہ اس سب کے باوجود تھکان محسوس کریں گے تو میری ماں کی طرح ایک چمچ چون پراش کا ایک پیالی دودھ میں ڈال کر پی لیں گی اور ساری تھکن دور ہو جائے گی اور وہ آرام سے بڑی شانت ہو کر سو جائیں گی۔ چین اور سکھ کی نیند کے مزے لیتی ہوئی۔۔۔۔۔اور میں۔۔۔۔۔۔میں جو اس سمے اس سیکنڈ کلاس کے سلیپر میں سفر کر رہی ہوں۔ اس دوران میرا یہ حال ہوگا کہ ادھیڑ عمر تک پہنچتے پہنچتے سارا سر سفید ہو چکا ہوگا۔ گرم لوہا ٹھنڈا اور سیاہ پڑ جائے گا۔ صرف ہاتھوں میں گرمی اور حدت باقی رہ جائے گی۔ سیاہ اور سخت لوہے کی ٹھنڈی سلاخیں میری انگلیوں کی حدت پا کر گرم اور نرم ہی رہیں گی۔ نہیں نہیں۔۔۔۔بس بہت ہو لیا۔ یہی بہت ہے۔ اور وہ جو ایک بادشاہ کے بارے میں کسی نے کہا تھا نہ کہ کسی بوڑھے ہوتے ہوئے احمق کو دیکھ کر اس نے کہا: "بس یہی راستہ تو پاگل پن کو جاتا ہے۔ حماقت بڑھاپا اور پاگل پن"۔

" کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟ "آواز سے ہی تہذیب اور خوش خلقی کا احساس ہوتا ہے۔ ماں جیسی نرم اور شائستہ آواز۔ میں نے ایک طرف کو سرک کر اور سکڑ کر جگہ دے دی ہے۔ ہولڈال، سوٹ کیس، اٹیچی کیس، تھرماس، فلاسک اور باسکٹس، مٹی کے بھانڈے (ارے ارے ذرا سنبھال کر) اور ساتھ ہی گرتے پڑتے بچے بوکھلائے ہوئے اندر داخل ہو رہے ہیں۔ اف توبہ یہاں تو بڑی گرمی ہے۔ گھوں گھوں چلتے شور کرتے پنکھے کی آواز سے ان کی آواز کی کشتی سی ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ٹرین چھک چھک، پھک پھک کر پٹڑیوں پر کھڑکھڑاتی چلی جا رہی ہے۔ آگے کو لپک رہی ہے، میں ان کی طرف دیکھتی ہوں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ ٹرین کھڑکھڑاتی ہوئی میرے

MashalBooks.org

دماغ کے اندر گھستی چلی جا رہی ہے اور طرح طرح کے خوفناک خیالات دماغ میں گھس گھس کر دھمکیاں سی دے رہے ہیں، وہ ابھی بھی پوری تن دہی سے پنکھے سے کشتی لڑ رہی ہیں وہ اس کو کسی ایسے رخ پر گھما دینا چاہتی ہیں کہ پنکھے کی ہوا صرف ہماری طرف پہنچے۔۔۔۔۔۔۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ مجھے اٹھ کر ان کی مدد کرنا چاہیے لیکن یہ نیک خیال سر اٹھاتے ہی غائب ہو جاتا ہے، جیسے بدن ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ غلط بات ہے اور خطرناک حد تک غیر انسانی اور ان سوشل بات ہے اور مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ اگر یہاں اس کمپارٹمنٹ میں ماں موجود ہوتیں تو وہ سارے ہی ایسے ان سوشل بندھن توڑ کر ان کی مدد کرنے کو اٹھ کھڑی ہوتیں تو پھر ان کے ساتھ مجھے بھی اٹھنا پڑتا۔ سارا زور لگا کر چلتی ٹرین میں اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے، چیز کو قرینے سے رکھنے اور ٹھیک کرنے لگتی۔ پر دوستو یہ اتنی آسان بات نہیں ہے اور اب جو ماں موجود نہیں تو اب تو میں جو چاہوں کر سکتی ہوں۔ ہاں بھئی میں تو ان مشرقی ستم کوش مہیلاؤں کی کوئی مدد کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر سکتی کہ جو آسمانی رنگ کی نائلون کی کارچوب کے کام والی ساری اور اس موسم میں لال سرخ چپل پہن کر تلے اوپر کے پانچ پانچ بچوں کے ساتھ کہ ابھی کوئی بچہ بھی پانچ سال کا نہیں ہو پایا ہے تن تنہا رات کے وقت سلیپر میں سفر کرنے چل پڑی ہو۔ معاف کیجئے میں اس کی مدد کرنے پر تیار نہیں ہو سکتی۔ تو خیر وہ پنکھے کا رخ ٹھیک کرنے میں کامیاب ہو چکی ہیں، ہوا بہت نہیں تو کچھ نہ کچھ لگنے ہی لگی ہے اور ان کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا ہے۔ انہوں نے اپنے سب سے چھوٹے گود والے بچے سے کھیلنا شروع کر دیا ہے اور میری طرف دیکھ کر مسکرائی ہیں۔ میں سوتی بن گئی ہوں، میں ہرگز ان کے جواب میں مسکرا کر بہناپا جوڑنے نہیں بیٹھ سکتی۔ اب وہ اپنے بچے سے کھیل رہی ہیں۔ خاص رسے بسے گھر اور کنبے کا ایک منظر۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں؟ "ان کا چہرہ ممتا کی محبت کے نور سے ابھی تک دمک رہا ہے۔ میں جگہ کا نام لیتی۔

"ہاں !تو پھر ہم تو آپ سے پہلے ہی اتر جائیں گے"۔ اور ایک ہی سانس میں بولتی ہوئی پوچھ رہی ہیں۔

"تو پڑھتی ہو؟ یہاں پڑھ رہی ہو؟"

جب میں بتاتی ہوں کہ یہاں ہی پڑھ رہی ہوں تو پھر وہ بڑے اچنبھے سے کہتی ہیں:

MashalBooks.org

"اچھا عجیب بات ہے میرے پتی تو یہاں کئی سال سے لگے ہوئے ہیں اور تم یہاں اتنے دنوں سے پڑھ رہی ہو۔ پھر بھی ہم آپس میں ایک دوسرے کو جانتے ہی نہیں، کتنی عجیب بات ہے کہ آج ہم یہاں ملے ہیں۔

گویا میرے یہاں رہنے اور پڑھنے کے لئے ضروری تھا کہ میں ان سے ملتی۔ ان سے یہاں اپنے رہنے اور پڑھنے کی توثیق کراتی تو بات بنتی۔ بڑی اہمیت ہے ان کے دل میں اپنی ذات کی۔ انا نیت تو دیکھو۔ ایک تو میں ان کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھی ہوں، دوسری بات یہ کہ مجھے آ رہی ہے نیند، اتنی سخت نیند کہ میں ان کی باتوں پر جل بھی نہیں پا رہی ہوں۔۔۔۔۔ میری خاموشی کی پرواہ کئے بغیر اب انہوں نے ہمارے ہوسٹل کی سب سے نکمی اور کند ذہن لڑکی کا نام لیا ہے۔

"پربھا کو جانتی ہو؟"

"ہاں بالکل۔۔۔۔۔ !" اب میں نے بھی چہچہا کر جواب دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ اب میرے اندر یہ خواہش پیدا ہو رہی ہے کہ اب میں ایک بڑا ڈرامائی جھوٹ بولوں اور جیسے شاہین پرواز کے لئے بے تاب ہو کر پھڑ پھڑاتا ہے، اسی طرح میرے اندر سے یہ جھوٹ بھی باہر نکلے اور عقاب کی طرح یہاں سے وہاں تک پھیل جانے کو بے تاب ہے۔ بات یہ ہے کہ جھوٹ کے پیر نہیں ہوتے تو کیا پر تو ہوتے ہیں۔ سو میں نے کہا:

"ارے پربھا وہ تو میری بہت پیاری دوست ہے اور بڑی ذہین اور ہوشیار اسٹوڈنٹ ہے"۔

"اچھا؟ "ان کی آواز میں شک کے ساتھ ساتھ کچھ خوشی بھی ہے۔

"لو جی پربھا کا رشتہ تو پکا ہو گیا ان کے پتی کے کزن اور ان کے دیور سے"۔

"اچھا میں نے یہ تو سنا ہے کہ اچھی خاصی سندر ہے پر یہ ہوشیار اور ذہین؟"

آپ دیکھیں نا دو طرح کے پڑھنے والے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو ہر دم اپنی ناک کے آگے سے کتاب ہٹاتے ہی نہیں اور ایک دم رٹو طوطے، اپنی جان توڑ کے پڑھتے ہیں اور امتحانوں کے دنوں میں ان کی شکلیں تباہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ایک دم بے رونق"۔

اب میری زبان خوب تیزی سے چل پڑی ہے اور میں ان کو بتا رہی ہوں کہ "وہ جو

پڑھاکوقسم کے اسٹوڈنٹ ہوتے ہیں، امتحانوں میں تو ان کی شکلیں ایسی ہو جاتی ہیں"۔ میں جھریائے ہوئے دسہری آم کی طرح منہ لٹکا کر بتاتی ہوں۔ "اور دوسری قسم پڑھنے والوں میں وہ ہوتے ہیں جو امتحان سے ایک دو مہینے پہلے پڑھ کر کسی نہ کسی طرح پاس ہو جاتے ہیں۔ اتنے اعلی درجے کے نمبر تو نہیں لیتے پھر بھی کسی نہ کسی طرح نکل ہی جاتے ہیں۔۔۔۔ "میری زبان اب تیزی اور بڑے اعتماد سے چل رہی ہے اور وہ میری باتوں کو دلچسپی سے سن رہی ہے۔

"ارے بھئی تم اتنے دلچسپ منہ بنا کر لوگوں کے خاکے اڑاتی ہو"۔ وہ ہنس رہی ہیں اور میں بولے جا رہی ہوں۔ "اور یہ جو اپنی پربھا ہے نا وہ بس خاص ہی قسم کی ہے، نہ تو وہ کتابی کیڑا ہے کہ ہر وقت کتاب ہاتھ میں لئے رہے، نہ وہ گھسٹ گھسٹ کر پاس ہونے والوں میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی صورت شکل پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور وہ ایک دم تازہ چاق و چوبند اور سندر نظر آتی ہے"۔ جب میں یہ سب بیان کر رہی ہوں تو مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ کاہلی کا تو نام بھی نہیں اس کے اندر۔ تو یہ کہتے وقت میں بالکل ماں کی آواز میں بول رہی ہوں۔ اب صورت حال دلچسپ بنتی جا رہی ہے۔ اب میں بالکل ہوشیار ہوں کوئی نیند وِند نہیں آ رہی ہے۔ وہ کہہ رہی ہیں:

"ہاں یہی تو سب سے اہم بات ہے۔ دیکھو نا آج کل اچھی لڑکیاں ملنا مشکل ہے جو اپنا گھر بار سنبھال سکیں اور اپنے دیور کے لئے پریشان ہوں"۔ ان کا دیور جس نے اتنے بڑے شہر کی یونیورسٹی میں پڑھا ہے۔ "ہوسکتا ہے کہ جو لڑکی ہم دیکھیں وہ بہت تیز طرار قسم کی ہو"۔

ان کی اس بات نے تو مجھے خوش کر دیا ہے۔ "بھئی واہ واہ دیکھا نہ کیا خریدار پھانسا ہے تم نے ایک ہی کمبا مارا اور چڑیا جال میں۔ میرے اندر جیسے ہنسی اور قہقہوں کے فوارے ابل رہے ہیں۔ گھر جا کر جب بھیا اور چھوٹکا کو بتاؤں گی تو ہنس ہنس کر ان کا تو برا حال ہو جائے گا کہ میں نے ریل میں بیٹھے بیٹھے ایک رشتہ طے کروا دیا۔ واہ بھئی واہ۔۔۔۔ہا۔۔۔ہا۔۔۔۔ہا۔۔۔۔اب تو وہ مجھے پوری پکی وچولن۔۔۔۔۔ کٹنی کا خطاب دے دیں گے کہ میں نے کیسے چلتی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ایک بیاہ کا سمبندھ کروا دیا اور وہ بھی کس کا کہ پربھا رانی کا جو اپنے قلم کی روشنائی سدا اپنے دوپٹے سے ہی پونچھتی ہے اور لیکچر ہو رہا ہو تو بہت ہی اٹھلا اٹھلا کر بیچ بیچ میں ٹوکتی رہتی ہے۔" کیا کہا سر میں سمجھ نہیں سکی"۔

تو خیر اب وہ صاحبہ اپنے دیور کی خوبیاں اور اوصاف گنوا رہی ہیں۔ "ارے بھئی اس

کے تو اتنے رشتے آتے رہتے ہیں، جو ہے اپنی بیٹی کے لئے مانگ رہا ہے اور مودی پور والوں نے تو یہ اشارہ تک دے دیا ہے کہ وہ لڑکے کے نام ایک پوری شوگر مل کر دیں گے۔ پر میرا دیور نہیں مانا۔ اس کا تو کہنا ہے کہ لڑکی کا رنگ گورا ہو اور انگلش اسکول کی پڑھی ہوئی ہو، وہ مودی پور والے تو یوں راضی تھے نا کہ ان کے اپنے کنبے برادری میں کوئی اتنا لائق لڑکا تھا ہی نہیں۔ پر کیا کریں کہ ہمارا لڑکا مانا ہی نہیں، وہ تو انگلش میڈیم کی پڑھی گوری چٹی لڑکی چاہتا ہے۔ بس اسی کارن ہم نے ان کو جواب دے دیا۔ ہاں نہیں کی۔

ہاں تو ٹھیک ہی کیا ہے بھئی، ان کا دیور ہے جو اے ون قسم کا ہو۔ اس کے گھر کے رکھ رکھاؤ کے بارے میں اتنا کچھ معلوم ہے کہ ہم تم کو بھی نہیں پتہ ہاں تو اور کیا۔ "وہ اپنی کمپنی کی طرف سے ایک مہینے کے لئے جاپان گیا تھا (یقیناً کمپنی ہی کے خرچے پر گیا ہوگا) وہاں سے واپس آیا تو ایک بلنڈر، پلاسٹک کا پورا مکمل ڈنر سیٹ، ایک ٹیلی ویژن اور ولی جارجٹ کی درجنوں ساریاں بھابی کے لئے ڈھیروں سینٹ کی بوتلیں اور بھتیجوں کے لئے۔۔۔۔۔ اب تم ہی بتاؤ کہ آج کل کہ زمانے میں کون اتنا خیال کرتا ہے اپنے بڑوں کا؟"

"ہاں جی آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں، کون خیال کرتا ہے کوئی بھی تو نہیں"۔ میں سنجیدگی سے سر ہلاتی ہوں اور بتی بجھا دیتی ہوں۔

"اچھا یہ نہ سمجھنا کہ وہ برے بھلے کا فرق نہیں سمجھتا"۔ وہ مجھ سے کہہ رہی ہیں۔ "وہ تو مجھے کئی بار کہہ چکا ہے کہ بیاہ کے بعد میں لڑکی کو ہرگز کام کرنے نہیں دوں گا۔ بات یہ ہے کہ لڑکی نے گھر سے قدم نکالا نہیں کہ برباد ہوئی نہیں۔ ارے بھئی میں نوکری کے لئے باہر نکلنے والیوں کی بات کر رہی ہوں۔ پڑھنے والی لڑکیوں کی نہیں۔ ہاں یہ نہ سمجھ لینا کہ میں گھر سے باہر جا کر پڑھنے والیوں کی بات کر رہی ہوں۔۔۔۔۔ یہ بات یہ سوچ کر کہہ رہی ہوں کہ کہیں میں ان کی بات کا برا نہ مان جاؤں اور اب وہ اپنی حیرت انگیز مہارت اور تیزی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ ہلتی جلتی چلتی ٹرین میں انہوں نے گرم پانی اور خشک دودھ کو پھرتی سے ملا کر ہلایا اور دودھ کی بوتل میں بھر کر سب سے چھوٹے بچے کے منہ میں نپل ٹھونس دیا۔ "لو اب جلدی سے پی جاؤ، ابھی پندرہ منٹ میں ہمارا اسٹیشن آ جائے گا"۔ واقعی گاڑی اب دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اسٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔ میں اٹھ کر اب ان کی مدد کر رہی ہوں۔ ان کے بچوں کو پکڑ پکڑ کر ایک طرف اکٹھا کر کے ان کی ٹوکریاں

ہولڈال سوٹ کیس، دودھ کی بوتلیں، چمچے اسٹیل کے ڈونگے اور لٹیاں سمیٹ سمیٹ کر اکٹھا کروا رہی ہوں۔

"اچھا بھئی نمستے بڑا اچھا وقت گزر گیا؟ "میں نے ان کے گود والے بچے کے گال کو تھپ تھپایا ہے اور جو کوئی ان کو لینے آیا تھا اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔

گاڑی چھوٹنے سے کچھ پہلے دو موٹی تھل تھل پنجابی عورتیں ہانپتی کانپتی ایک دوسرے کے ململ کے ڈوپٹوں کو پکڑے ڈبے میں چڑھ آتی ہیں اور سیٹ میں دھنس کر بیٹھ گئی ہیں، ان کے ساتھ ساتھ کپڑے کے غلافوں سے ڈھکے ہوئے ان کے بھاری بھاری سوٹ کیس پھولے ہوئے ہولڈال اور چھوٹے چھوٹے پیچ دار چمچوں سے کسا ہوا ناشتے دان۔ ان میں سے ایک دھیمی آواز سے منہ ہی منہ میں جپ رہی ہے۔ "ہے پر بھو تو ہی ہے پالن ہار۔ "دوسری نے کھڑے ہو کر ایک زوردار آواز سے اپنے اندر کی ہوا خارج کی ہے اور زور سے ڈکار لے کر "اوم " کا نعرہ لگایا ہے۔

"تم نے مجھے اتنے پراٹھے زبردستی کھلائے کہ اب میرے باؤ گولہ کا درد اٹھنا شروع ہو گیا ہے"۔ وہ اپنی ساتھی سے کہہ رہی ہے اور مجھے اپنی دادی ماں یاد آ گئی ہیں کہ انہیں بھی ایسی ہی پراسرار بیماریاں اور تکلیفیں لاحق رہتی تھیں۔ باؤ گولہ کا درد چلک کی دھڑکن اور دل دھڑکنے کا عارضہ وغیرہ وہ اپنی ان تکلیفوں کو دور کرنے کے لئے ایسی ہی پراسرار ترکیبیں اور ٹوٹکے کیا کرتی تھیں۔ مثلاً ستوانسے بچے کو ریڑھ کی ہڈی کے آس پاس ٹیڑھے میڑھے قدموں سے چلا کر یا جنتری کے حساب سے چندر ماں کی لگن کے آٹھویں مہینے ڈال پر لگنے والے نیبو کا اچار بنا دانت صاف کئے، سویرے سویرے تازہ تازہ کچی مولیاں چبانا۔ غرض ایسے ہی نفسیاتی ٹوٹکے اور عطائیوں والے نسخے اور ترکیبیں اور اس سے بھی بڑھ کر مافوق الفطرت قوتوں سے منتیں اور گنڈے جھاڑ پھونک سے علاج کروایا کرتی تھیں۔ یہ کیا؟ شاید یہ لوگ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہی ہیں۔ شاید وہ یہ معلوم کرنا چاہتی ہیں کہ میں کہاں جا رہی ہوں اور کب نکلوں گی کمپارٹمنٹ سے۔ میں گونگی بہری بنی انکی صورت تک رہی ہوں۔ جیسے انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا جاؤ چولھے بھاڑ میں۔۔۔۔۔ دفع۔۔۔۔۔ اور ایک بار پھر آپس میں ایک دوسری کے ساتھ مصروف ہو گئیں۔ ان میں سے ایک نے اپنے بھجن کی جاپ شروع کر دی ہے۔

تار ماتا تارینی۔ سب دکھ نروان پہلی سنگھی تارینی تار ماتا تارینی (اے شام کی ماتا

MashalBooks.org

ہمارے سب دکھ دور کر دے)۔ میں غافل ہو کر سو جاتی ہوں۔

ایک زمانہ تھا جب ہم اپنے گھروں کو جاتے تو اپنی روانگی سے ایک ہفتہ پہلے ہی اپنی روانگی کی اطلاع دیا کرتے۔ اپنے سوار ہونے اور گاڑی کے پہنچنے کا صحیح وقت لکھ دیا کرتے تھے، پر یہ تو گئے دنوں اور گزرے ہوئے سمے کی بات ہے۔ اس سمے کی جب ہم اپنے دروازوں کی کنڈیاں اور چٹخنیاں سختی سے بند نہیں کیا کرتے تھے، نہ اپنی چیزوں کو چھپا چھپا کر رکھتے اور نہ ہی بکسوں اور الماریوں کو کنجی تالا لگا کر رکھنے کے عادی تھے۔ تب سمے اور وقت کا پہیہ اپنے اسی مثالی انداز میں گھومتے گھومتے ایک اور ہی اور کو گھوم گیا۔ اب لوگوں نے اپنے سامان اور چیزوں کو لکا چھپا کر رکھنا، بکسوں اور الماریوں کو تالے لگانا شروع کر دیئے اور گھروں کے دروازے سختی اور مضبوطی سے بند کر کے گھروں میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ اسی پر بس نہیں ہوئی بلکہ اب ہم نے اپنے خطوں میں اپنے ذاتی معاملات اور باتیں بھی لکھنا بند کر دیں۔

"ارے وہ دن اور تھے جو بیت گئے ہیں اور تھے، اب سب کچھ وہ نہیں رہا جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ بابو نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا ہے اور ان کی بات پر چاچا جو ان کے قریب ہی کب سے چائے کی پیالی پکڑے بیٹھے ہیں یوں بوکھلائے جیسے ان کے ہاتھ سے کوئی بڑی قیمتی اور ضروری چیز پھسل پڑی ہو۔

چاچا حال ہی میں ایک مہینے کی یاترا کے بعد لوٹے ہیں۔ اپنے گرو کے بڑھیا قسم کے آشرم سے۔ جہاں ہر قسم کی جدید راحتیں اور آسائشیں میسر ہیں۔ چاچا اپنی اندر کی بیٹری چارج کروانے کے خیال سے وہاں اکثر جاتے رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب آدمی کے اندر شانت ہو تو یہ باہر کی ہل چل اور گڑ بڑ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اب اس وقت جب وہ اپنی انا کو شانت کر کے آئے ہیں تو ان کا چہرہ اپنے اندر کے سکون اور شانتی سے ایسا چمک رہا ہے مانو وہ ریڈیم والی رسٹ واچ ہو۔ وہ کہتے ہیں جب وہ اندر سے شانت ہو جاتے ہیں تو ان کو یوں لگتا ہے کہ ان کے بھیتر سے ایک کنول کھلتا ہوا باہر آ رہا ہے اور پھر وہ ان کی ناف پر پھوٹا اور کھل اٹھا ہے۔ جس کے بیچوں بیچ ان کے گرو جی بیٹھے ہوں۔ گرو جی بھی اور ان کا آشرم بھی انہیں اس بھول کئے بیچ بالکل صاف نظر آتا ہے۔ میں اپنی چشم تصور سے اس کھلتے ہوئے کنول کے بیچ گرو جی اور ان کے آشرم میں پلنے والی بے شمار گایوں کو دیکھتی ہوں۔ صحت مند اور دودھ سے بھرے تھنوں والی گائیں ان

کے جاندار بچھڑے اور بچھڑیاں بھی جو کسی آسٹریلیوی بیل کے تخم کے پھل پھول ہوتے ہیں۔ خیر یہ بات تو ہم سب ہی کو معلوم ہے کہ ان بچھڑوں اور بچھڑیوں کے والد صاحب کی درآمد کس طرح ایک خصوصی اجازت نامے کے تحت ممکن ہوئی تھی اور یہ پروانہ یا اجازت گرو جی کو چاچا کی افسری اور اقتدار کے بل بوتے پر ملی وہ جو ایک محاورہ ہے نا کہ چاندی کی پلیٹ میں رکھ کر پیش کرنا تو گرو جی کی خدمت میں آسٹریلوی بیل کی درآمد کا پروانہ چاندی ہی کی پلیٹ میں پیش کیا گیا تھا۔ گرو جی چاچا سے شکوہ کرتے:

"بھائی وہ ہمارے دو جرمن ٹریکٹر بمبئی کے یارڈ میں پڑھے ہیں"۔ وہ بچوں کی طرح ہنستے ہوئے بتاتے "اور وہ جو تمہاری نکمی سرکار ہے نا وہ آبجکشن پر آبجکشن لگائے جا رہی ہے۔ ارے بھائی میں تو ان کی قیمت بھی فارن کرنسی میں ادا کر چکا ہوں۔ اس کی رسید بھی میرے پاس موجود ہے۔ یہ دیکھو"۔ انہوں نے مگرمچھ کی کھال کے بٹوے سے رسید کھینچ کر نکالی اور چاچا کے آگے کر دی۔

"بس ہو جا"۔ چاچا کے منہ سے نکلا اور ہو گیا۔۔۔۔۔ اور یوں تم مجھ سے اپنے اندر کے آپ کی صفائی اور تہذیب کا بھی کام کروا سکتے ہو؟ چاچا کے اپنے روتھ مین پیکٹ سے ایک سگریٹ کھینچ کر نکالی ہے اور بھیا سے مخاطب ہو گئے ہیں:

"بھئی ایسا کرو کہ اپنی باہر کے سنسار کو اپنی آشاؤں اور اچھاؤں کے حوالے کر دو۔ انہیں بھینٹ چڑھا دو"۔

" کیا مطلب؟ "بھیا بھنا کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ گھر کھنچاؤ اور تناؤ سے جیسے چرچرا رہا ہے۔

"ارے بھابی آپ ان باتوں کو اپنے دل پر نہ لیا کیجئے"۔ چاچا ماں کو تسلی دینے کی جی توڑ کوشش کر رہے ہیں جو بری طرح شرمندہ اور گھبرائی ہوئی ہیں، وہ کہہ رہے ہیں:

"بھئی ہم تو ان کی ان باتوں سے بالکل نہیں گھبراتے۔ ارے بھابی یہ تو ان کی عمر کا تقاضا ہے۔ ارے جب ان کی عمروں میں تھے تو۔۔۔۔۔"

"ارے چاچا۔۔۔۔۔ میں آپ کی اس عمر کو بڑی اچھی طرح دیکھ سکتی ہوں۔ اس سے بھی بالوں میں تیل چپڑا ہوا۔ عجیب وحشت ناک سویٹر پہنے۔ ہاں سویٹر جو خاص آپ کی پسند

ہے۔ہاں آپ کی ماتا جی جو ہاتھ میں سدا جنگی کلہاڑا پکڑے رہتی ہیں۔ہاں تو چاچا آپ تو تیل چپڑے بالوں اور ماں کے من پسند سویٹر میں بالکل للو ہی دکھائی دیتے ہیں پر چاچا ہیں کہ اپنی بانی کہے جارہے ہیں۔اپنی بھی نہیں اپنے گرو کی بانی سنائے جارہے ہیں۔

" بھئی گرو جی کا تو یہ کہنا ہے کہ اگر منش کو اپنی کایا اور کلپنا کے نروان اور شانتی کی کھوج ہے تو نروان اور شانتی کو جو سیدھا راستہ جاتا ہے وہ تو یہی ہے کہ پہلے منش اپنے کالبد اور من کی اچھائیں پوری کرلے۔پہلے اندر کے شریر اور موہ مایا کی پوری تسلی کرلے پھر کایا کے نروان اور شانتی کی چنتا کرے، جو منش اپنے اندر کی مانگ کو اپنے کالبد کو شانت نہ کرے گا اس کے نروان کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔سو پہلے اپنے اندر کے بھانبڑ کو شانت کرو۔یوں کہ اندر کی بھانبا اور موہ کایا کی شانتی کی راہ کبھی کھوٹی نہیں کرتی"۔

روح کی بالیدگی نفس امارہ کی آسودگی پر چاچا کا بھاشن کچھ زیادہ ہی لمبا ہوتا جارہا ہے اور میں یہ سوچ رہی ہوں کیا آپ کو یاد نہیں ابھی پچھلے ہفتے ہی کی تو بات ہے۔جب منا چاچا ہمارے ڈرائنگ روم میں، اپنی کنڈلیاں، جنتریاں اور جنم پتریاں پھیلائے بیٹھے تھے تو جناب یہ آپ ہی ذات شریف تو تھی جوان کے آگے منمنا منمنا کر گڑ گڑا گڑ گڑا کر پوچھ رہے تھے یہ بتاؤ کہ سور یہ زحل میں کب داخل ہوگا۔میری جنم کنڈلی میں۔۔۔۔۔ہاں بھئی آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ یہ ہمارے بیوروکریٹ کس طرح ایک دوسرے کی تاک میں لگے رہتے ہیں۔آپ ذرا چوک جائیں تو وہ فوراً اپنا جیک لگا کر چلتی گاڑی سے الگ کر کے آپ کی جگہ خود فٹ ہو جائیں گے یا کسی اپنے کو دھانس دیں گے۔

سو چاچا تو کسی کو موقع دیتے ہی نہیں ایک دم چوکس ہی رہتے ہیں۔بھئی ان کی تو یہ شہرت ہے کہ تیز بخار میں اسی میل کا سفر کر کے اپنے سینئر افسر کی بیٹی کے بیاہ کے لئے ہاتھی کا انتظام کرنے پہنچ گئے تھے اور حال یہ ہے کہ کسی منتری کی سفارش لانے والے ہر امیدوار کو انٹرویو میں پاس کر دیتے ہیں پھر بھی بھائی صاحب ستاروں کی چال کا بھی خیال کرنا ہی پڑتا ہے کہ ان کے اتار چڑھاؤ ہی کا تو سارا کھیل ہوتا ہے، اب اگر میرا زحل چڑھ رہا ہوگا تو اور بات تھی پر اگر مریخ اتار پر ہے تو پھر بھائی، میرا تو سارا اوشواس ہی ڈگمگا جائے گا، اپنے آپ پر سے"۔وہ سر ہلا ہلا کر منا چاچا سے کہہ رہے ہیں۔

MashalBooks.org

اب اس سے چاچا سگرٹ کا ایک لمبا کش لے کر بڑے اطمینان سے کہہ رہے ہیں کہ اب جبکہ ان کا نام سیکرٹریوں کے پینل پر آ چکا ہے تو اب کوئی مائی کا لال بھی ان کو اس پوزیشن سے ہلا نہیں سکتا۔ بس ایک بار پہنچنے کی دیر ہے۔ بھابی یہ اب سرکاری نوکری میں کچھ رہ نہیں گیا ہے۔ بھابی آپ کچھ بھی کہیں میں تو یہی کہوں گا کہ کیا بات تھی برطانیہ کی۔ ارے انگریز کو آدمی کی پرکھ تھی، وہ آدمی کی صلاحیتوں کی قدر کرتا تھا اور نہیں تو کیا یوں ہی صدیوں تک ہمارے دیس پر راج نہیں کر گیا۔ ارے بھائی پرانے افسر کی کیا بات تھی، وہ سچ مچ افسری کے لائق تھے۔ کیا تو ان کا لباس اور سج دھج کیا بات چیت، ہر ایک بات کا سلیقہ اور فن آتا تھا ان کو، واہ کیا شائستگی اور شان تھی، ہر ایک بات اور ادا میں اور ایک یہ ہمارے مقامی دیسی افسر لوگ ہیں، ایک جملہ تک تو انگریزی کا صحیح بول نہیں پاتے یا پھر خود کو ماؤ اور چے گویرا کا چیلا ظاہر کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہائے   یہ ہماری نئ نسل کا کیسا انحطاط ہے۔ نہ کوئی آدرش نہ کوئی سیاسی تعلق اور رشتہ بنا کر رکھتے ہیں کسی قسم کی سیاست سے"۔

"اچھا تو پھر ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو اپنے سیاسی وچاروں اور آدرشوں کے کارن جیلوں میں پڑے ہیں۔ ان کے بارے میں آپ کی شبھ رائے کیا ہے؟"
بڑے بھیا کی آواز ابلتے دودھ کے کڑھاؤ میں نیبو کے قطرے کا کام کر گئی ہے۔

"ارے وہ۔۔۔۔ وہ نکسل باڑیئے فاشسٹ ٹائپ لوگ۔۔۔۔ ارے بھئی تم نئے لوگوں نے ان کو جھنڈے پر چڑھا کر ہوا بنایا ہوا ان کا"۔ چاچا نے درشتی اور حقارت سے کہا ہے۔ پھر جیسے ایک دم ہی ان کو اپنی روحانی عظمت اور اپنے گرو کی تلقین کا خیال آ گیا ہے، یوں کہ ان کے لہجے میں تھوڑا دھیما پن اور سبھاؤ سا آ گیا ہے اور وہ کہہ رہے ہیں:

"ہاں ٹھیک ہے کبھی کبھی پولیس کی طرف سے زیادتی اور ہنسا بھی ہو جاتی ہے اور ان کو ان کے تشدد کا نشانہ بننا پڑتا ہے مگر اس کا بھی ایک کارن ہے نا۔۔۔۔ دیکھو نا یہ جو جونیئر پولیس افسر ہیں ان کے دماغ چھوٹے نرے، بے مغزے ہوتے ہیں اور اوپر سے آئے ہوئے حکم سمجھے بغیر اس کا غلط استعمال کرنے لگتے ہیں، ایک دم گھامڑ سر پھرے (ساتھ ہی وہ ایک غلیظ گالی بھی دے دیتے ہیں اور ساتھ ہی تائید کے لئے ہماری طرف دیکھتے ہیں)۔ اور یہ بات بھی ہے کہ سختی سے کام لئے بنا آپ حکومت چلا بھی نہیں سکتے۔ یہ گر ہمیں انگریز سکھا کر گیا ہے۔۔۔۔ "یہ کہتے ہوئے وہ کرسی پر

MashalBooks.org

پھیل کر انگڑائی لیتے ہیں، بڑی آسودگی سے۔

"ارے بھئی انگریز چلا تو گیا ہے پر ابھی ہمیں اس سے بہت کچھ سیکھنا ہے"۔

اصل بات یہ ہے کہ چاچا باہر کا ایک لمبا ٹور لگا کر آئے ہیں، ان کی سربراہی میں جو وفد گیا تھا، اس سلسلے میں وہاں کا حق نمک بھی تو ادا کرنا تھا۔ وہاں کا آب و دانہ ابھی ان کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہا ہے۔ اب انہوں نے اپنی باتوں کا رخ بدل دیا ہے۔

"شالینی جی۔۔۔۔۔ میں اس بار آپ کا مکسر لے آیا ہوں"۔ اب باتوں میں وقفہ کر دیا ہے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد۔۔۔۔۔

"اچھا اب اجازت میں چلتا ہوں"۔

" کیوں خیر تو ہے؟ تم اتنی جلدی کیسے آ گئیں۔ تمہارے امتحان تو مہینے کے آخر میں ہوں گے۔ کیوں کیا امتحان میں بیٹھنے کا ارادہ نہیں ہے"۔ چھوٹا اور بھلا ایسے براہ راست سوالات نہ کرے۔۔۔۔۔ اس نے میرا سوٹ کیس اٹھا لیا اور میں نے اپنا بیگ۔

"نہیں یہ بات نہیں ہے، پر کیا، خیر امتحان ملتوی بھی ہو سکتے ہیں۔۔۔۔ پر ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا"۔

"تم لوگ ہڑتال پر نہیں گئے؟ "چھوٹے کے ہاتھ سے سوٹ کیس پھسل گیا، اس نے ایک کونے میں سوٹ کیس کو دھم سے پٹختے ہوئے کہا:

"ارے اس میں کیا پتھر بھر لائی ہو جو اتنا بوجھل ہو رہا ہے؟"

"یہ آج سویرے سویرے سب گھر والے چلے کہاں گئے؟ "میں نے اپنی پسینے میں تر بتر ہتھیلیاں اپنے کھولوں سے رگڑ کر خشک کرتے ہوئے پوچھا۔

" گھر میں اتنا سناٹا ہو رہا ہے بابو اور اماں کہاں گئے؟"

"ہسپتال۔۔۔۔ "چھوٹا نظر نہ آنے والی مکھی کو ہاتھوں سے مارنے کی کوشش کر رہا ہے۔

"ہائیں۔۔۔۔ ہسپتال کیوں گئے ہیں؟ "میری زبان دیہاتی لوکی کی طرح باہر لٹک آئی ہے۔

"بیمار لوگ کہاں جاتے ہیں۔۔۔۔۔ مندر میں؟"

یہ کہتے ہوئے اس نوعمری اور بلوغت کے درمیان پکی ہوئی آواز میں جھنجھلاہٹ ہے۔ایک دم میری نگاہ اس کے چہرے کی طرف گئی۔اس کا منہ اترا ہوا ہے۔اس کی بھیگی مسوں کے پیچھے چھپی ہوئی خوف کی تحریر نظر آ رہی ہے۔

"لیکن بیمار کون ہے؟ "میں نے ذرا نرم آواز میں پوچھا۔

مجھے معلوم ہے کہ اس سے زوردار آواز میں بات کروتو وہ سہم جاتا ہے اور ماں کی گود میں منہ چھپا کر رونا شروع کر دیتا ہے۔۔۔۔۔چوزہ کہیں کا۔

"اماں کے سوا اور کون ہوسکتا ہے، وہی تو گھر بھر میں ایسی ہیں جنہیں اپنے اندر اندر چپ چاپ قسم کے روگ پالنے کا بڑا شوق ہے"۔یہ کہتے کہتے اس نے میگزین اٹھالیا ہے اور پھر بے کل سا ہو کر پرے اچھال دیا ہے۔"ہاں تو اگر تم چائے پینا چاہتی ہو تو تھوڑا انتظار کرلو، اس لئے کہ ہری سودا لینے بازار گیا ہوا ہے۔

"اماں کو تکلیف کیا ہے؟"

"پتہ نہیں۔۔۔۔کہتے ہیں ان کی چھاتی میں کوئی گلٹی سی ہے۔اسی کی بایوپسی ہوگی، دو دن سے اماں ہسپتال میں داخل ہیں۔آج یا کل ان کے ٹانکے کاٹے جائیں گے، پر وہ آج ہی گھر آ جائیں گی۔ بھیا اور بابو لینے گئے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ "پھر وہ ہوا میں ادھر ادھر ہاتھ ہلا کر وحشت زدہ سے اشارے کرتا ناک سکوڑ کر کہتا ہے:

"تم جا کر نہا کیوں نہیں لیتیں، تمہارے پاس سے بکریوں کی سی بو آ رہی ہے"۔

میں نے اس کو بری طرح کھا جانے والی نظروں سے دیکھا ہے اور غسل خانے میں آ گئی ہوں۔ یہ اماں بھی خوب ہیں۔ ہر کام ایسے ڈرامائی وقت اور حساب سے ہوتا ہے ان کا کہ بندے کے اوسان ہی خطا ہو جائیں۔انہوں نے اپنی بیماری کے لئے بھی کیا وقت ڈھونڈا ہے۔ امتحانوں کے ہونے یا ملتوی ہونے نہ ہونے کی چنتا کم تھی کہ یہ اور اپنی بیماری لے بیٹھیں۔میرے ہاتھ سے صابن پھسل کر نہانے والے پٹرے کے نیچے گر گیا ہے۔۔۔۔۔اچھا خیر تم کو تو میں اچھی طرح سمجھ لوں گی، میں نے صابن پر دانت کٹکٹائے اور نہانے والے لکڑی کے پٹڑے کے نیچے ہاتھ ڈال کر صابن کو پکڑنے کی کوشش کی۔لکڑی کا پٹڑا اوپر سے تو بالکل صاف اور چکنا نظر آ رہا تھا، پر نیچے سے عجب حال تھا، پانی پڑ پڑ کر نیچے کی لکڑی گل کر پھول گئی تھی۔ نیچے سے ایک دم لب لبا ہو

رہا تھا۔ صابن نکل آیا تو اپنے ناخنوں کے آگے سے پھنسی ہوئی گلی سڑی لکڑی کا لبلبا لبلبا گودا نکالتے ہوئے میں نے جی میں ٹھان لی تھی کہ باہر نکل کر ہنگامہ کر دوں گی۔ یہ حالت ہے اس گھر کی صفائی کی۔ اوپر اوپر سے صاف کر کے چمکا دیا جاتا ہے اور کونوں کھدروں یا چیزوں کے نیچے دیکھنے کی فرصت نہیں ہے۔ کتنا گند جمع ہے۔ اوہ تولیہ لینا چاہا تو پتہ چلا کہ تولیہ تو لانا ہی بھول گئی ہوں۔ اپنی بھول پر دانت پیستے ہوئے میں نے چھوٹے کو پکارا ہے۔

"چھوٹے ذرا تولیہ تو پکڑا دو"۔ کسی اور وقت میں نے چھوٹے کو آواز دے کر تولیہ پکڑانے کو کہا ہوتا تو مجھے تنگ کر ڈالتا۔ پہلے تو بڑبڑ کرتا ہوا اٹھتا پھر دروازے کی کھلی ہوئی درز میں سے ایک کونہ لہراتا اور فوراً ہی واپس کھینچ لیتا۔ جب اچھی طرح جھکا لیا تو پھر اندر اچھال دیتا۔ اس طرح وہ پانی میں گر کر بھیگ کر شرابور ہو جاتا۔ پر آج۔۔۔۔۔ آج تو اس نے پہلی آواز پر چپ چاپ تولیہ پکڑا دیا ہے۔

بال خشک کرتے کرتے میں نے چھوٹے سے پوچھا:

"یونین کے بجٹ پر یہاں کیا ردعمل ہوا؟"

"ہونہہ !" چھوٹا کندھے سکیڑتا۔ ارے بھئی ہونا کیا تھا۔ سب ہی جانتے ہیں کہ ہونا ہوانا کچھ نہیں۔ بس باتیں ہی باتیں۔ ہر بار ہی یہی تماشہ ہوتا ہے۔

"اچھا مانو کہ اگر اس بار مختلف بات ہو تب؟"

"ارے تم وہاں کبھی اخبار بھی پڑھتی ہو؟ " جیسی تیسی بنائی ہوئی چائے کی پیالی میرے سامنے رکھتے ہوئے چھوٹا کہتا ہے۔ اگر کبھی کبھار اخبار دیکھ لیا کرتیں تو یہ سوال نہ کرتیں۔ ادھوری بات چھوڑ کر وہ اپنی پیٹھ کھجانے لگا ہے۔

"نہیں بھئی تم مجھے بتاؤ کہ اگر تم ووٹ ڈالنے کی عمر کو پہنچ گئے ہوتو اب کی بار تم کسے ووٹ دو گے۔ اگر تم ووٹ ڈالنے کے قابل ہو تو؟"

" کیوں تم کو کیوں بتاؤں"۔ چھوٹے کی آنکھوں میں ایک لحظہ بھر کو وہی پرانی شیطنیت چمکی۔

"ضروری ہے کہ تم کو بتا کر ووٹ ڈالوں"۔ پھر وہ آگے کی طرف جھک کر کہتا ہے۔

"تم کو پتہ ہے اس معاملے میں ہر ایک کا منہ بند ہے، سمجھو کہ ہونٹ سی دیئے گئے

ہیں۔ ہری تک اس بارے میں زبان نہیں ہلا سکتا۔ اگر تم اس سے پوچھو بھی تو وہ جواب دینے سے کترا جائے گا"۔

" کیا مطلب؟"

"مطلب کیا۔۔۔۔۔یہی کہ ووٹ کیوں دیتے ہیں۔ ووٹ دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے"۔ ہم دونوں ہی تھوڑی دیر کو خاموش ہو جاتے ہیں۔ کسی بھی بات اور چیز کا مطلب ہی کیا ہو سکتا ہے۔ اب۔۔۔۔۔ ایک دم مجھے احساس ہوتا ہے کہ چھٹیوں میں میرا گھر آنا بے وجہ اور بے مقصد ہی ہے۔ خصوصا جب آپ گھر واپسی کو اپنی اصل، اپنی جڑوں سے وابستگی کا وسیلہ سمجھتے ہوں۔ اچھا بھگوان بھلی کرے، میرے حق میں۔۔۔۔۔ میں اپنے آپ سے کہتی ہوں۔ مجھے یہاں صرف دس دن گزرانے ہیں۔ میں ردی کی ٹوکری میں اپنے ٹوٹے ہوئے بالوں کا گچھا ڈالنے کو اٹھی ہی تھی کہ باہر سے کار رکنے کی آواز سنائی دی اور پھر چھوٹے کی چیخ "سدھا آ گئی ہیں، اندر ہیں۔ ایسا لگتا ہے، ان کے کالج میں ہڑتال ہونے والی ہے"۔

میں اتنی دیر میں خود بھی باہر پہنچ گئی تھی۔ اماں بالکل ویسی کی ویسی نظر آ رہی ہیں۔ سوائے اس کے کہ ان کے ماتھے پر سیندور کی بندیا نہیں نظر آ رہی ہے اور بال بھی پریشان ہیں، وہ تھکی تھکی نظر آ رہی ہیں، شاید بکھرے بکھرے بالوں کی وجہ سے۔

"تم کب پہنچیں؟ "اماں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا ہے۔

"ارے تار تو دے دیا ہوتا۔ اسٹیشن سے گھر کس طرح پہنچیں"۔

"ڈرائیور جو ہے نا انجن چلانے والا، اس سے میری واقفیت ہے، بس وہی گھر کے دروازے تک گاڑی لے آیا تھا"۔

"دیکھا۔۔۔۔۔اس لڑکی کی شوخی دیکھی"۔ اماں کی آواز میں سدا جیسی کچھ خفگی اور کچھ ہنسی کی ملی جلی کھنک ہے۔ وہ مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیتی ہیں مگر چمٹا کر گلے سے نہیں لگاتیں، یہ فاصلہ میں نے خود ہی تو پیدا کیا ہے۔

"تم کب آئے؟ "میں نے بھیا سے پوچھا۔

"دو تین دن پہلے"۔ بھیا سرسری سا جواب دے کر بابو کے ساتھ مل کر گاڑی سے سامان اتارنے لگتے ہیں۔ اماں، بابو اور بھیا تینوں ہی کے پاس سے ہسپتال کی تیز بو آ رہی ہے۔

ہسپتال کی بو اور وہی ماحول تھکے تھکے، بیمار اور بجھے بجھے سامان پر سے پھسل کر تھرمس فلاسک دھم سے گر جاتا ہے۔

"ٹوٹ گیا؟ "اماں اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھتی ہیں۔

"نیا تھا۔۔۔۔۔؟"

"بالکل"۔ان کی آواز میں تھکن اور ملامت ہے۔ بابو کندھے جھٹک کر کہتے ہیں۔

"دھیان سے کام کیا کرو"۔ہسپتال والی بد بو اور تیز ہو گئی ہے۔ بھیا کا چہرہ تن گیا ہے۔ وہ چھوٹے سے کہہ رہے ہیں:

"بیس روپیہ اور ستاون پیسے قیمت تھی، اس کی۔ آیا سمجھ میں کچھ، کوڑمغز کہیں کے اور ہاں ٹیکس اوپر سے"۔ چھوٹا کہہ رہا ہے "وہ بھی آج سے بہت پہلے کی بات ہے جب ہم نے خریدا تھا اور اب۔۔۔۔۔اب تو۔۔۔۔ "بھیا اور چھوٹا ہنس رہے ہیں۔

اماں اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی ہیں۔

"چائے پئیں گی؟ "میں پوچھتی ہوں۔

"جی نہیں چاہ رہا ہے، اگر پی بھی تو نہانے کے بعد ہی پیئوں گی"۔

میں اٹھ کر نکل جاتی ہوں۔۔۔۔ایک فالتو وجود منہ اٹھائے ادھر ادھر پھر رہی ہوں۔ ایک دفعہ ہی چھوٹے پر نظر پڑتی ہے۔ میرے بیگ میں سے چوری چوری کتابیں نکال نکال کر ورق الٹ الٹ کر دیکھ رہا ہے۔ میں فوراً ہی اس سے جھگڑنا شروع کر دیتی ہوں۔

"یہ تم کس کی اجازت سے میرے پوچھے بغیر میری چیزیں کھکوڑنے بیٹھ گئے ہو۔ ان میں کوئی بھی خفیہ اور پرائیویٹ چیز نہیں ہے۔ اس گھر میں کسی کی کوئی چیز پرائیویٹ رہ ہی نہیں سکتی۔ ہر چیز پبلک کی ہوتی ہے"۔ غصے کے مارے آواز میرے گلے میں گھٹ کر رہ گئی ہے۔ ناراض ہو کر چھوٹا کتابیں پٹخ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ ہوا میں جوڈو کے ایک دو داؤ چلاتا ہوا چلا یا ہے۔

"ہاں معلوم ہے"۔ اب وہ ان کتابوں کو کبھی بھی ہاتھ نہ لگائے گا۔ حالانکہ یہ کتابیں میں اسی کے لئے لائی ہوں۔

بابو بیٹھے ہوئے اخبار دیکھ رہے ہیں۔

"تمہارے امتحانوں کی کیا خبر ہے؟ "میں مگھم میں جواب دیتی ہوں، وہ مجھے ڈھیلے

ڈھیلے نظر آ رہے ہیں۔ بابو جب بھی مجھ سے بات کرتے ہیں تو ایسے کھوئے کھوئے نظر آتے ہیں جیسے ان کا دھیان کہیں اور ہو۔ مبہم سا جواب دے کر میں ایک میگزین اٹھالیتی ہوں۔ بابو دوبارہ اخبار کی سرخیاں دیکھنے لگتے ہیں۔

"اس مرتبہ ٹیکس کچھ ہلکے ہیں"۔ میں جمائی کو روک کر کہتی ہوں۔

"ہاں دیکھتے ہیں آگے چل کر کیا رہتا ہے"۔ یہ بات بابو نے یوں کہی ہے۔ جیسے کہہ نہ رہے ہوں بلکہ اخبار سے پڑھ کر سنا رہے ہوں۔ چھوٹا اندر آ گیا ہے، اپنے پیچھے دھڑک سے دروازہ بند کرتا ہوا۔

" کوشش کیا کرو کہ دروازہ دھیرے سے بند ہو جائے بجائے اس شور شرابے کے"۔ بابو ناگواری سے اخبار کو جھٹک کر صفحہ کھولتے ہیں، جس کے ایک کونے پر ایک تصویر میں ایک ماڈل اپنے بالوں میں گوبھی برابر پھول سجائے مسکرا رہی ہے اور اپنی دلکش مسکان سے پرچا پرچا کر ہمیں ٹی وی خریدنے پر اکسا رہی ہے۔ ہمارے قصبے میں تو کوئی ٹی وی سب اسٹیشن تک نہیں۔ البتہ پچھلے برس مقامی سینما ہال کے مالک نے مقامی لوگوں کی تفریح کے خیال سے سترہ ملی میٹر کا ایک ٹیلی ویژن لگوالیا تھا اور ہمارے قصبہ میں یہ آج تک ایک عجوبہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ تاج محل سے بھی بڑا عجوبہ بنا ہوا ہے، یہاں کے لوگوں کے لئے۔

ہائے پتہ نہیں۔۔۔۔۔اس مرتبہ چھٹیاں کٹیں گی کیسے۔ پہلے تو ہم چھٹیوں میں ایک دو فلمیں دیکھ آیا کرتے تھے اور ہر بار جب فلم دیکھنے کے بعد گھر میں گھستے تو اپنے اندر کسی نہ کسی ایکٹر یا ایکٹریس کو بسا کر لایا کرتے اور ہم سب ہی پیدائشی ایکٹر اور ایکٹریس ہیں۔ ہمارے ہر کام میں اداکاری کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ مثلاً پردے سرکانے کے انداز میں بھنویں اچکا کر باتیں کرنے کی اداء۔ ہم لوگ دن رات یوں اداکاری میں لگے رہتے ہیں، جیسے ان دیکھے ناظرین ہماری ہر ادا پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ بابو ہماری ان بچکانہ حماقتوں کو قطعی پسند نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ زندگی کے دو ہی رخ ہیں کہ یا تو آپ کامیاب ہوں گے یا ناکام رہیں گے اور بس ان دو کے علاوہ کوئی تیسرا درمیانی راستہ ہے ہی نہیں۔ لہذا ہم کو چاہیے کہ ایسی حماقتیں ترک کر کے زندگی کو سنجیدگی سے لیں مگر ہم کو یہ بھی پتہ ہے کہ بابو کی یہ سب باتیں اور ناپسندیدگی ایک طرح کی اداکاری ہی ہے ہماری طرح۔ اچانک ہی مجھے بابو پر پیار آ رہا ہے۔

"ارے بھائی وہ مریضہ کدھر ہیں؟ "میرا پیار بھرا دل بیٹھنے لگا ہے۔ بیٹھتے بیٹھتے میرے گٹوں میں اترا جا رہا ہے۔ چاچا کے مادی وجود اور سراپا کو دیکھتے ہی جو پھلوں کی ایک ٹوکری سمیت آ موجود ہوتے ہیں۔

"آؤ بھئی۔۔۔۔۔ "بابو ان کو دیکھتے ہی اخبار ہاتھ سے رکھ دیتے ہیں۔ میرے اندر خطرے کی گھنٹی بج اٹھتی ہے۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ میں اپنے بھائیوں کو مطلع کر دوں۔ آج اتوار ہے چھٹی کا دن ہے۔ایک کے بعد دوسرے آنا شروع ہو جائیں گے۔ آنے والوں کا تانتا ہی بندھ جائے گا۔

"بھابی ہیں کدھر؟ "چچا اپنی آواز دھیمی کر لیتے ہیں۔

"سو رہی ہیں شاید"۔

"نہیں سو تو نہیں رہی ہیں، نہا رہی ہیں"۔ چھوٹے کی نوعمری کی نوخیز آواز میں سچائی کی کھنک ہے۔

"ارے چھوٹے ایک منٹ کو ادھر کو تو آؤ"۔ چاچا نے بابو کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا ہے۔ "چلو آج ہماری ملاقات اپنے ناراض نوجوان سے ہو ہی جائے۔ کیوں بھئی چھوٹے سننے میں آ رہا ہے کہ ان دنوں لوگ بڑے شدھ مارکسٹ ہوتے جا رہے ہیں؟"

"چھوٹے "بابو کی آواز میں تحکم ہے۔ جسے سن کر میرے پیٹ میں جیسے کوئی تیز کٹیلی سی چیز گھستی چلی گئی ہے۔ خیر پچھلی اسٹیج پر کوئی حرکت یا آواز سنائی نہیں دے رہی ہے، چھوٹا دوسری طرف سے آتا ہے۔

کیا زمانہ آن لگا ہے۔ میں خود اپنے ہی گھر میں اجنبی اور غیر ہو کر رہ گیا ہوں۔ یہ جو ہمارے ذرا، ذرا سے لونڈے ابھی زمین سے سر نہیں اٹھا پائے ہیں کہ ایسا لگنے لگتا ہے جیسے وہ ہمارے باپ ہوں اور وہ جو ہیں ہمارے راج کنور صاحب کراؤن پرنس ان کی تو پوچھئے ہی نہیں۔ وہ تو یہ سمجھتے ہیں کہ جو کوئی بھی ان سے بڑا ہے وہ ان کا جانی دشمن ہے۔ ارے کبھی ہم پر بھی جوانی آئی تھی۔ پر ہم نے تو کبھی اپنے بڑوں سے ایسا برتاؤ نہ کیا تھا"۔ بابو واقعی بے مہری اور بدسلوکی کا نشانہ بن کر رہ گئے ہیں۔ بالکل ہندی کی گھڑی گھڑائی بارہ مسالوں والی خلموں کے ہیرو۔ ان کے بیچ بس ایک ہی کسر نظر آ رہی ہے وہ ہے ایک ساٹن کے ڈریسنگ گاؤن اور ایک

سگریٹ کی۔ ورنہ تو وہی تیکھے تیکھے کرارے کرارے مکالمے وہی ہذیانی اور جذباتی حرکات اور اشارے دیکھنے اور سننے کے قابل۔ میں بڑی مشکل سے اپنی ٹانگیں پیچھے کی طرف کھینچتی ہوں۔ پھر وہی تلخیاں، وہی گلے شکوے اور وہی ٹینشن شروع ہوگئی ہے۔ جی چاہ رہا ہے خوب زور زور سے چیخیں مار مار کر رونا شروع کر دوں۔

صبح! سویرے کا سمے ہے۔ سارا گھر سویا پڑا ہے، ہر چیز پر نندا سا پن چھایا ہوا ہے۔ میں نے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر گھر کر کھڑا کر کے جمانے کی کوشش کی ہے اور پھر ایک بار ہی اوپر اچھالا ہے اور خود ہی لپک کر کیچ کر لیا ہے، اب وہ میری ہتھیلی پر چت پڑا ہوا ہے۔ امید وبیم، آشا نراشا کے دبدھے میں کہیں پھر کوئی دوبارہ اچھال کر سب کچھ ہی الٹ پلٹ نہ کر دے۔ ایک بار پھر میں نے اس کو ہتھیلی پر جما کر کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے۔ پھر چادر کھینچ کر اپنا منہ ڈھانک لیا ہے۔

سر تک تان لی ہے چادر۔ بھلا ابھی کیا تک ہے اتنے سویرے سویرے اٹھنے کی اور مجھے اٹھ کر کرنا بھی کیا ہے۔

ہمارے قصبے میں دیر تک سو کر اٹھنے کا رواج نہیں، یہاں ہر کوئی سحر خیز ہے اور یہ کوئی حیرانی کی بات ہے بھی نہیں۔ اس لئے کہ یہاں شام کے سات بجے ہی سے سڑکیں اور گلیاں سونی ہو جاتی ہیں اور آمدورفت بندھ ہو جاتی ہیں۔ دس بجتے بجتے تو پورا قصبہ گھمبیر سناٹے میں ڈوب چکا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ نہ صرف رات کے سمے یہ حال ہوتا ہے بلکہ دن کو بھی دوپہروں میں بھی پورا قصبہ ایسی ہی نندا سی فضا میں ڈوب جاتا ہے۔ جیسے ہر شے پر غنودگی کا عالم طاری ہو۔ ہر چیز دبے دبے دھیرے دھیرے حرکت کرتی ہے۔ جیسے ساگر کے پانیوں تلے چپ چاپ پھیلتے اور پلنے والی ہریالی اور سرسبزی یوں تو خوابیدہ سی کیفیت بہت رومانی اور شاعرانہ سی لگتی ہے۔ جیسے کوئی سوئی سوئی سی کویتا پر اپنے اندر ایک جنگلی گھوڑے کا سا کس بل لئے ہوئے اٹھارہ سالہ انسانی مخلوق کے لئے یہ پاگل کر دینے والی خاموشی ناقابل برداشت ہے۔ اکتاہٹ اور بے زاری کے اس عالم میں ہمارے جیسے، اپنے آپ کو آزاد خیال سمجھنے والے والدین کا تو یہی مشورہ ہوتا ہے کہ بھئی باہر چلے جاؤ کہیں گھوم پھر آؤ۔ سوال یہ ہے کہاں؟ کدھر؟ کہاں ہو آئیں۔ کس طرف کو گھوم پھر آئیں۔ لے دے کر ایک وہی سول بازار ہی تو ہے، نو عمر اور نوجوان لڑکے لڑکیوں کی تفریح یا گھوم پھر آنے کی جگہ، جہاں وہ سوفٹی آئس کریم کی تلاش میں پہنچتے ہیں اور وہاں کے اندھیرے اور گندے سے

MashalBooks.org

انگریزی نام والے ریستوران میں ایک بار گھس جائیں تو پھر جانے والے کی خیر نہیں نظر آتی۔ایک تو کچی پیاز اور بھنے ہوئے فینل کے بیجوں کی مہک سے پورا ریستوران بسا ہوا ہوتا ہے۔اوپر سے شوربے کے دھبے لگی جیکٹوں میں یہاں سے وہاں تک منڈلاتے ہوئے ویٹروں کا نرغہ جو آپ کے ہاتھ میں پکڑا ہوا مینو جھپٹنے کو مستعد کھڑے ہوتے ہیں کہ جیسے آپ آرڈر دیں وہ آپ کے ہاتھ سے مینو کارڈ اچک لیں اور آپ کا آرڈر لانے کو چل پڑیں اور اگر یہ پسند نہ ہو تو ایک متبادل یہ بھی ہے کہ بازار میں ایک قطار سے بنی دکانوں کے ساتھ ساتھ مٹرگشت کرتے پھریں جہاں پلاسٹک کی سستے قسم کی بنے ہوئے بجلی کے گھریلو آلات اور چیزیں سجی ہوں یا پھر تیز چمکیلے رنگوں کی ساریاں ملتی ہوں۔چلتے چلتے دکانوں کی یہ قطار کھادی آشرم پر ختم ہوجاتی ہے۔ جہاں سال سال پھر پرانے ڈھول میں لحاف اور گدے بھی لگے ہوئے ہوں گے اور آخر میں نیون سائن والی کیمسٹ کی دکان پر آکر یہ قطار ختم ہوجائے گی۔چلیں چھوڑیں بھی اس مٹرگشت اور ایسے گھومنے پھرنے کو۔

آج کا دن بھی نکل آیا ہے۔ایک انگڑائی لے کر پوری طرح جاگ اٹھا ہے۔آنگن میں دھوپ اترائی ہے اور بھلی لگ رہی ہے۔کچھ دیر بعد اس کی تیزی اور گرمی بڑھ جائے گی۔ہم سب ہی دن کا سامنا کرنے سے کترا رہے ہیں۔۔۔۔۔۔اماں پوچھ رہی ہیں ارے تم لوگوں نے ٹھیک سے ناشتہ تو کرلیا ہے نا۔ہمارے ناشتہ کی طرف سے مطمئن ہوکر انہوں نے دوبارہ کتاب اٹھا لی ہے۔میں جب ان کو یہ گھٹیا اور سستے رومانی ناول پڑھتے دیکھتی ہوں تو میرا دل گھٹنے لگتا ہے،اس عمر میں جذباتی رومانی ناول اور اس میں ان کی محویت کو دیکھ کر جیسے میرے بال حکایتوں والے بادشاہ یا پاتی کی طرح سفید ہونے لگتے ہیں۔ان کے لئے یہ ناول میں ہی لائی ہوں،اچھا ناول ہے۔میری طرف دیکھ کر وہ پسندیدگی سے مسکرائی ہیں۔گویا میرے ذوق اور انتخاب کو سراہ رہی ہیں۔"ارے جیون بڑی اتھاہ پہیلی ہے"۔پھر وہ اپنے مخصوص خیال دہراتی ہیں۔"میں کہتی ہوں یہ ہمارے ہندی کے لیکھک ایسی دلچسپ کتابیں کیوں نہیں لکھتے۔یہ بات تو نہیں ہے کہ ہمارے جاگیردار گھرانے نہیں یا ہمارے دیس کی مٹی رومان اور پریم کو راس نہیں آتی،ہمارے دیس میں ایسا کال تو نہیں پڑا ہوا ہے،ایسے پلاٹوں کا۔پھر کیوں نہیں لکھتے ایسی کیا بات ہے؟"

میں ایک دم پھٹ پڑتی ہوں:

"جب آپ بڑے لوگ اپنی نوجوان نسل کا ساتھ دینے پر تیار نہیں ہوں گے اور ہماری

دنیا سے الگ تھلگ اپنی ہی خیالوں کی دنیا بسانے پر اصرار کرتے رہیں گے تو پھر نئی نسل کو کیوں مجبور کرتے ہیں کہ وہ آپ کے اشاروں پر چلے۔ آپ لوگوں کی پسند اور ناپسند کا لحاظ کرے وہ بھی آپ لوگوں سے بے پرواہ ہو کر اپنی ڈگر اختیار کرنا چاہے گی"۔

" بھئی ہم تو تمہارے اس سنسار میں کچھ دن کے مہمان ہیں۔ سدا تو بیٹھے نہیں رہیں گے، پھر تمہاری نسل کے ماں باپ بننے کے سنسکار کا کچھ تو پرائشچت دینا ہی پڑے گا۔ ہم لوگوں کو۔۔۔۔۔۔ "وہ یہ کہتے ہوئے لیٹ گئی ہیں۔ پورا کمرہ آنکھیں چوندھیا دینے والی دن چڑھے کی کڑی دھوپ سے بھر گیا ہے۔ چھوٹا اور بھیا پراسرار جادوئی بونوں کی طرح چپکے سے کھسک کر الوپ ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔اب باقی میں رہ گئی۔۔۔۔۔وہی آپ کی یہ خاکسار تابعدار۔

ٹررن۔۔۔۔۔ٹررن فون کی گھنٹی بج رہی ہے، میں فون اٹھاتی ہوں۔

وہ اماں کو پوچھ رہی ہیں۔

"جی وہ تو آرام کر رہی ہیں اس سمے"۔

" کیوں؟ بات کیا ہے؟ طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا؟"

"جی!"

"ارے کیا تکلیف ہے، کیسی ہیں؟ "وہ پھر سوال کر رہی ہیں۔

"وہ جی کوئی خاص بات نہیں وہ چھاتی میں گلٹی پڑ گئی تھی نا وہی نکلوائی ہے بایوپسی کے لئے"۔ میں جواب میں کہتی ہوں۔

"رپورٹ مل گئی؟ "ان کی آواز کچھ یوں آ رہی ہے جیسے اونٹ جگالی کر رہا ہو۔

"ابھی تو نہیں ملی۔ کل یا پرسوں تک آ جائے گی"۔ ان کی آواز میں کھوج دلچسپی اور ٹوہ لینے کا انداز ہے۔

"لو ذرا دیکھو تو ایک شہر میں رہ کر ہم کو ایک دوسرے کی خبر نہیں ہوتی۔ بات یہ ہے نا کہ کبھی میں ہی فون کر لوں تو کر لوں، تم لوگوں کو کبھی اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ فون کر کے اچھے بری کی خبر دے دو۔ اب ہمیں تو اتنا پتہ بھی نہیں کہ تم سب آئے ہوئے ہو۔ آؤ نا کسی دن تم کو اشیش اور نیشا یاد کرتے ہیں، سلام کہہ رہے ہیں۔ جی بہت اچھا میں سعادت مند بھتیجوں کی آواز میں کہہ رہی ہوں اور فون رکھ دیتی ہوں۔

بوا کے اور ہمارے گھروں کے درمیان رنجشوں اور تنازعوں کی ایک لمبی ڈور تنی ہوئی ہے، جس پر تاروں میں اٹکی ہوئی کٹی پھٹی کنکیا کے کاغذوں کی طرح ان گنت بدمزگیوں، افواہوں، غلط فہمیوں اور افواہوں کے پر پھڑ پھڑایا کرتے ہیں اور ان سب باتوں پر ایک مہذب اور شائستہ قسم کا پردہ پڑا رہتا ہے جو کنبے کی پالیٹکس اور سماجی بندھنوں کے تار و پود سے تیار ہوتا ہے اور یوں ہوتا ہے کہ رشتوں اور خون کے ناتے محبت اور نفرت کے درمیان کوئی توازن قائم کرنے کے بجائے ایک رسمی اور سماجی رکھ رکھاؤ کے دکھاوے باقی اور قائم رکھنے کی پوری کوشش جاری رہتی ہے۔ خوشی یا غمی کے موقعوں کے لئے اس کے اظہار کو ضرورتاً استعمال کرتے ہیں۔

"فون کس کا تھا؟" اماں باہر بیٹھی ہوئی ہیں۔

"بوا کا"۔

"ناراض تھیں کیا؟"

"پتہ نہیں۔۔۔۔۔اماں اگر وہ ناراض بھی ہوں تو آپ کو پرواہ نہیں کرنا چاہیے"۔

"ارے بھئی تم ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو سمجھ بھی نہیں سکتیں"۔

اماں کا لہجہ اب مجھے اکسا رہا ہے کہ میں بھی اس خاندانی پالیٹیکس کے کشن پر جم کر بیٹھوں اور اپنی عورتوں والی بدی غیبت کی خواہش اور جبلت کی تسکین کا سامان کروں۔ پر اسی دم اماں ایک گہری اور ٹھنڈی سانس لے کر بولنا شروع کر دیتی ہیں اور وہ اس تمام صورت حال کو ایک گہری صوفیانہ اور سادھوانہ روحانیت سے متعلق کر دیتی ہیں اور اس طرح میں خاندانی پالیٹیکس میں حصہ لینے کا خیال ترک کر دیتی ہوں۔

"ارے چھوڑیں بھی ماں آپ کیوں ان چکروں میں پڑتی ہیں۔ یہ باتیں تو آپ کو روگ لگا دیں۔ کاہے کو آپ ان باتوں کو سوچ کر اپنے آپ کو ہلکان کرتی ہیں"۔ میں ایک کتاب اٹھا لیتی ہوں۔

"تمہارے امتحان کب ہو رہے ہیں؟"

"معلوم نہیں"۔

"کچھ تو اندازہ ہوگا"۔

"مجھے بالکل نہیں معلوم۔۔۔۔۔میں نے آپ کو بتا تو دیا ہے کہ پرچے اچھے نہیں ہو

سکیں گے۔ یہی کچھ ہونا ہے"۔اماں ہنسنے لگتی ہیں۔

"جیسے تمہارے پرچھے ہمیشہ خراب ہی تو ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی ہوئے ہیں خراب؟"

"پر اس بات کی کوئی گارنٹی بھی تو نہیں دی جاسکتی۔ میرے اندر تو منحوس اور بدشکل عفریت کلبلانے لگتے ہیں امتحانوں کے نام سے۔ اب ہے آپ کے یا آپ کے منا چاچا کے پاس اس کا کوئی توڑ، بتائیں۔ منا چاچا کا کوئی ستارہ یا سیارہ مجھے اس سے نجات دلاسکتا ہے؟"

اماں بحث کے موڈ میں نہیں ہیں، اس لئے وہ اس بحث کو ختم کر دیتی ہیں۔

"چلو خیر۔۔۔۔ اگر تم کو وشواس نہیں پھر بھی یہ بات تو ہے کہ منا چاچا کہتے ہیں کہ زحل دور ہے نا۔۔۔۔ اس میں آدمی کی ذہنی قوتیں پورے زور پر ہوتی ہیں"۔

"فرض کیجئے کہ منا چاچا کی پیشین گوئی کے باوجود اس کو غلط ثابت کرنے کے لئے میں فیل ہو جاؤں تو کیا آپ روک لیں گی؟"

اماں اگر جھگڑنے کے موڈ میں نہ ہوں تو پھر ان کو نرادنی بھی جھگڑنے پر آمادہ نہیں کر سکتے۔ سو اس وقت بھی میرے ریمارکس سنکر ہنس پڑی ہیں۔

"بھئی ایک بات ہے کہ تم جو صبح سے جھگڑا کرنے کے موقع تلاش کر رہی ہو۔ تم کچھ دیر کو باہر کیوں نہیں ہو آتیں، یہاں تمہارے اتنے پرانے دوست، ہم جولی ہیں، کسی سے کہو کہ تم کو پہنچا دے وہاں تک"۔

میں نے اپنے آپ کو غلیل کی طرح تان کر کھینچا اور مسہری پر سے گرا دیا ہے۔۔۔۔۔ اور زمین پر پیر ٹکاتے ہوئے کہا ہے:

"وہ ہم جولی اور دوست۔۔۔۔۔ ارے وہ ایک سے ایک پرائز بور ہیں"۔

"اماں میں آپ کو بتاؤں"۔ میں نے پوری سنجیدگی سے کہا ہے۔ "آپ ایسا کریں میری شادی کر کے مجھے چلتا کر دیں"۔ میں نے ٹانگیں ہلاتے ہوئے کہا۔ "بس میری صرف چار مانگیں ہیں، ایک تو یہ ہے کہ وہ آدمی بہت اچھی طبیعت کا ہو جو کبھی ناز نخرے نہ دکھائے اور یہ کہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہو تاکہ کوئی نندوں شندوں کا ٹنٹا نہ ہو۔۔۔۔۔ تیسری مانگ یہ ہے کہ معقول صورت شکل کا ہو۔ چوتھی بات کہ دماغی طور پر بالکل زیرو ہو"۔ بھیا ایک دم ہی نمودار ہوتے ہیں۔

"ارے اتنی تعلیم حاصل کرنے کے بعد تم کو صرف اونچا لمبا اور چوڑا چکلا چمپینزی

چاہیے"۔

میری لات مارنے کی کوشش ہمیشہ کی طرح رائگاں گئی ہے۔ پر یہ ضرور ہے کہ آج اس سمے ہم سب بہت دن کے بعد جی کھول کر ایک ساتھ ہنس رہے تھے اور میں خوش خوش کوئی اور ایسی ہی مسخری بات سوچ رہی تھی کہ جس سے ہم سب کو مل کر ہنسنے کا موقع مل جائے۔ پر جیسا کہ میں نے کہا نا کہ خوشیاں لحاتی طور پر بھولی بھٹکی ہی آتی ہیں اور پھر یوں ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہیں جیسے کافور غائب ہو جاتا ہے۔ ابھی بات سوچ نہ پائی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی ہے۔ دونوں ماسیاں اپنے بچوں، چابیوں اور باسکٹوں کے ساتھ لدی پھندی آ پہنچی ہیں اور ہم نے جلدی یہاں سے کھسک جانے کی سوچنا شروع کر دی ہے۔

8 edulcni$[-d:\work\mashil\bmas.hml]

"ارے بھئی آج تو لگتا ہے گھر میں بڑی گہما گہمی ہے"۔ مالینی موسی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ شالینی موسی نے اپنے لاڈلے اور بگڑے ہوئے چھوٹے بیٹے کو انگریزی میں جھڑکنا شروع کر دیا ہے۔

"سدھا بیٹی جا کر رکشا والے کو یہ پیسے تو دے آؤ"۔ مالینی موسی نے اپنے پرس سے پیسے نکالتے ہوئے کہا۔

" کیوں گاڑی کو کیا ہوا؟ "اماں شالینی موسی کی بیٹی چمٹا کر پیار کر رہی ہیں۔

"ارے گاڑی کا تو نام ہی نہ لو۔ اتنی پرانی گاڑی ہو چکی ہے۔ ارے ہر ہفتے تو گیراج بھیجنا پڑتا ہے اور پھر دو سو سے کم بل نہیں بنتا۔ ارے بھئی ہم کو تو اس مہنگائی نے مار چھوڑا ہے"۔

چھوٹا اور بھیا زیادہ چالاک ہیں، جھٹ رکشا والے کو پیسے دینے پہنچ جاتے ہیں اور اب میں پھنس کر رہ گئی ہوں حال میں۔

" کیوں شالینی ۔۔۔۔۔ تمہاری آپا نے کیا فیصلہ کیا رکے گی یا چلی جائے گی؟"

اماں کا پوچھنا ہی تھا کہ شالینی موسی نے نہ معلوم کب کب کا غبار جو دل میں بھر رکھا اور کیسے کیسے روک روک کر رکھا ہوا تھا ایک ہی سانس میں اگلنا شروع کر دیا۔ اس وقت ان کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی اس عورت کے اندر بھی ایک فرسٹ کلاس اعلی دماغ ہوا کرتا تھا

جو تین بجے رات کو اٹھ کر ای۔ایم۔فارسٹر پر نوٹس تیار کرتی تھیں۔ دراصل شالینی موسی کے اس درجہ بودے اور دبو پن کا سبب ایک طرف مالینی موسی کا ترک اور تیاگ ہے۔ دوسری طرف منا چاچا کا جوتش کنڈلیاں اور جنم پتریوں کا چکر، اوپر سے چاچا کی چھیڑ چھاڑ اور مذاق نے تو اور بھی موم کی ناک بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس حد تک کہ ان کی اصل روح اور فطرت کو بالکل ہی کچل کر رکھ دیا ہے۔ بھیا کا ان کے بارے میں یہ تجزیہ تھا کہ اگر شالینی موسی کو کوئی چوٹ لگ جائے اور زخم بھی کھا لیں تو وہ خون کے آنسو بہانے کے بجائے آنسوؤں کا خون بہا دیں گی۔ وہ ہر بات کا ایسا دکھڑا اتیار کر لیتی تھیں اور اتنے فیل مچاتی ہیں کہ مالینی موسی اور ماں تک ان پر بے حد وحساب ترس کھانے لگی تھیں۔ دونوں کی دونوں ان کو اپنے پروں میں لے کر بیٹھ جاتی تھیں اور ان کے مصائب سن سن کر چوزوں والی مرغی کی طرح کڑک کڑک کرتیں۔ انگریزی بول کر اظہار تاسف کرتی رہتیں۔

"ہائے بیچاری۔۔۔۔۔ سچ بڑی بپتا ہے اس پر تو"۔

"ہاں ٹھیک تو ہے ایک اس کا اکیلا دم، ننھے ننھے بچے اور کوئی اس کا ہاتھ بٹانے والا بھی نہیں اور پھر یہ کہ یہ ہے کیسے نازوں کی پالی میں ہوئی"۔

"واقعی دیکھو تو ہمارا سماج کتنا بدلتا جا رہا ہے، ایک دم مغربی طور اور چلن آ گئے ہیں، پر عورت اسی چکی میں پس رہی ہے۔ اس سماج میں ہاؤس وائف کو کیا آسانی مل گئی ہے؟ ویسٹ میں گھر والی کی زندگی کتنی آسان ہو گئی ہے، پر ہماری ہاؤس وائف کو اپنی کٹھناؤں سے نبٹنا ہوتا ہے، اوپر سے مہنگائی تو دیکھو، ہر چیز کا بھاؤ چڑھتا ہی جا رہا ہے"۔

میں نے چپ چاپ اپنی کتابیں سمیٹ کر اٹھنا چاہا تو شالینی موسی نے جواب اپنے دکھڑے رو کر اور اپنی بہنوں کے دم دلاسے اور تسلیاں وصول کر کے نسچنت ہو کر بیٹھی تھیں مجھے اٹھتے دیکھ کر ٹوکا۔

"ارے اب تم کہاں چلیں۔ بیٹھو ہمارے پاس"۔

"مجھے پڑھنا ہے"۔

"ارے چھوڑو پڑھائی کا کیا ہے وہ تو تم ہر روز ہی پڑھ رہی ہو اور ہم کون سا روز روز آتے ہیں، اب آ گئے ہیں تو چھن بھر ہمارے پاس بھی بیٹھ جاؤ"۔

"ذرا آرام سے بیٹھو اور مجھے یہ بتاؤ کہ یہ جو دن رات کی پڑھائی ہے تمہاری اس سے تم

کو ملے گا کیا؟"

مالینی موسی نے سوال کیا ہے۔شالینی موسی کی خطرناک حد تک چمکیلی نگاہیں جیسے دور کہیں کچھ کھوج رہی ہیں۔

کوئی تین سال پہلے کی بات ہے جب انہوں نے سوچا تھا کہ اپنی پڑھائی مکمل کر لیں۔ پرائیویٹ پڑھ کر امتحان دے دیں۔۔۔۔۔۔ پرمنا چاچا نے یہ انکشاف کیا کہ بھیر گو سمجھتا کو یہ اشارہ ملا ہے کہ ان کے جیون کے ستارے زحل کے کرودھی اثر میں آئے ہوئے ہیں اور ہم زحل کے کرودھ اور حسد کی آخری اور انتہائی اسٹیج ہے اور یہ بہت ہی کٹھن سمے ہے۔ ایسی حالت میں کبھی کوئی نیا پروجیکٹ شروع ہی نہیں کرنا چاہیے۔ پھر ایک مسئلہ ان کے پتی کا بھی تھا کہ اس وجہ سے وہ کسی پریشانی یا بے آرامی سے دوچار نہ ہوں۔ پھر بچے کے کام کے لئے کوئی بھروسے کی عورت تلاش کرنے کا بھی سوال تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں چاچا سے مشورہ لیا گیا تو ان کا یہ کہنا تھا کہ عورت کا پہلا فرض اپنے پتی، بچوں اور گھر کی سیوا کرنا ہے،سو اس کو چاہیے کہ اپنے گھر بار بچوں اور سسرال والوں کی سیوا کرے اور یہی اس کا اخلاقی فرض ہے۔

اب یہ اتنی اچھی صلاح اور ایسا دانش مندانہ مشورہ تھا کہ اماں تو بہت ہی متاثر اور مرعوب ہو گئیں۔ واہ کتنی اچھی اور سبھاؤ کی سوچ ہے تو کیا ہوا اگر چاچا نے خود بیاہ کیا ہی نہ تھا اور بالکل ہی چھڑے تھے۔ سو شالینی موسی سے یہی کہا گیا کہ "شالینی تمہیں کس بات کی کمی ہے۔ بھگوان کی دیا سے سب ہی کچھ تو ہے تمہارے پاس۔ پھر کیا ضرور ہے کہ تم ڈگری لو۔ پھر ان ہی دنوں شالینی موسی دوبارہ پریگیننٹ ہو گئیں اور پڑھائی وڑھائی کا چکر کھٹائی میں پڑ گیا۔

میں دوبارہ اٹھنے کی کوشش کرتی ہوں، مالینی موسی بڑے پیار سے میرا ہاتھ پکڑ کر کہتی ہیں:"رکو تو ذرا دیر کو"۔ان کے ہاتھ کا لمس ان کی شفقت اور محبت جیسے میرے اندر اتر جاتی ہے۔

"بہت دبلی ہو رہی ہو"۔ پھر وہی مخصوص ازلی اور ابدی سوال۔

"بہت پڑھائی کر رہی ہو کیا؟"

" نہیں تو اتنی زیادہ تو نہیں"۔ پر اب مالینی موسی کا دھیان کسی اور ہی طرف بٹ جاتا ہے۔

"ارے جیجی دیکھیں نا میرا وزن کتنا بڑھ گیا ہے"۔

"عاجز آ گئی ہوں میں تو اپنے بڑھتے ہوئے مٹاپے سے"۔ اماں پورے خلوص سے کہتی ہیں:

"ارے نہیں اب ایسی بھی موٹی نہیں ہوئی ہو"۔ اب شالینی موسی کو بھی اپنے پھیلنے کا احساس ہونے لگا ہے۔ اچانک ہی خیال آ گیا کہ وہ بھی اب ضرورت سے زیادہ پھیلتی جا رہی ہیں۔ ساتھ ہی ان کو ایک انگلش میگزین میں، دبلے ہونے کے بارے میں دیئے ہوئے مشوروں کا خیال آ گیا ہے کہ دبلے ہونے کی کیا کیا تدبیریں ہیں۔ ان کی مجوزہ غذائیں اور ورزشیں یاد آ گئی ہیں اور وہ ان کو بیان کر رہی ہے۔ میں نے اپنی جمائیوں کو بمشکل روکتے ہوئے پوچھا ہے:

"نپٹو اب کس کلاس میں ہے؟"

شالینی موسی نے اپنے بیٹے کو غمناک نگاہوں سے دیکھا جو بڑے اطمینان سے مٹھائیاں ٹھونسنے میں مصروف ہے اور بتایا کہ "تیسری میں ہے"۔

"ہاں تو بھئی نپٹو کون کون سے سبجیکٹ ہیں تمہارے؟ "اپنے اس سوال کے منہ سے باہر نکلتے ہی مجھے اس کی لایعنیت اور کھوکھلے پن کا احساس ہو رہا ہے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہر بچے سے کسی نہ کسی وقت اور موقع پر اس کے بڑے کرتے رہتے ہیں۔ بے مقصد اور بے تکا سا سوال اور بچہ ہمیشہ اس سوال کا جواب گول کر جاتا ہے۔ بھلا کیا جواب دے تو نپٹو بھی کیوں میرے سوال کا جواب دیتا۔

"دیدی کیا پوچھ رہی ہیں، دیدی کی بات کا جواب دو۔ وہ انتظار کر رہی ہیں تمہارے جواب کا"۔ شالینی موسی نے نپٹو کو انگریزی میں کچوکا ہے۔ شالینی موسی کی پورے وقت یہی کوشش رہتی ہے کہ وہ اپنے بچوں سے انگلش ہی میں بات کریں۔ نپٹو چپ چاپ بیٹھا دبا دب مٹھائی ٹھونسنے میں لگا ہوا ہے اس کی جگہ میں ہوتی تو بھی یہی کرتی۔ ٹھیک !شابش۔۔۔۔ بچو کر ڈالو اپنی من مانی، جب تک بن پڑے۔۔۔۔۔۔ اب میں اس کی ماں سے پوچھ رہی ہوں۔

"اسکول اس کا اچھا ہے؟ "ابھی وہ جواب دے نہیں پائی ہیں کہ مٹھائی والی پلیٹ پھسل کر چھن سے ٹوٹ جاتی ہے۔ ڈر اور شرمندگی سے سہا ہوا نپٹو اپنی جگہ پر جما کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ بجلی کے کوندے کی سی تیزی سے لپک کر اس کی ماں نے اس کے منہ پر دو چانٹے جڑ دیئے ہیں۔

"احمق گدھا کہیں کا"۔

"خود ہی ہوگی احمق گدھی"۔ نٹو نے چلا کر کہا ہے۔ اس کا منہ آنسوؤں سے بھیگ رہا ہے۔ شالینی موسی ٹھٹک کر رہ گئی ہیں اور اس پر چلانا بھول گئی ہیں۔۔۔۔۔ان کی چیخیں سن کر مالینی موسی اور اماں ایک ساتھ بیچ بچاؤ کے خیال سے چلانا شروع کر دیتی ہیں۔ کیا ہو گیا ہے شالینی بچہ ہی تو ہے۔ پلیٹ ٹوٹ گئی تو کیا غضب ہو گیا۔ بیٹا رو نہیں چپ ہو جاؤ میں ابھی اس سے اچھی اور بڑی مٹھائی کی پلیٹ تمہارے لئے منگواتی ہوں۔ دونوں ہی اس کو بہلانے اور چپ کرانے میں ناکام ہو چکی ہیں۔ پچھلی طرف سے چھوٹا نمودار ہوتا ہے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے پوچھتا ہے بات کیا ہے؟ ہمارے گھر میں ایسی باتیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ یہ کوئی نیا سین تو نہیں ہے اور ایسی باتوں کا کسی پر کوئی اثر بھی نہیں ہوتا۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر روزمرہ گھروں میں یہ شور شرابہ اور ہنگامے نہ ہوں تو زندگی کی یہ یکسانیت اور جمود ان بیچاری ماؤں کو پاگل کر دے۔

ہری آ کر ٹوٹی ہوئی پلیٹ کی کرچیاں چن کر سمیٹ لیتا ہے اور نئی پلیٹ مٹھائیاں اور چٹ پٹے کھاجے لا کر سامنے رکھ دیتا ہے۔ شالینی موسی اپنے بچوں پر جلی بھنی نظر ڈال کر جیسے طے کر لیتی ہیں کہ اب انہیں بھی نارمل ہو جانا چاہیے۔ اب باتوں کا دھارا بجٹ کے بعد چیزوں کے بھاؤ چڑھنے اور مہنگائی کی طرف پلٹ جاتا ہے۔ اتنی مہنگائی اور اس پر سے مہمانوں ملاقاتیوں کا آنا جانا، سب سے بڑھ کر رشتہ داروں کا تو تانتا ہی لگا رہتا ہے۔ اب اتنے تھوڑے پیسے میں کوئی کس طرح گزر کرے اور سب سے زیادہ تو یہ اپنے پرائیویٹ مشینری اسکول اور دیوالہ نکال دیتے ہیں، ان کا تو ہر وقت ہاتھ ہی پھیلا رہتا ہے۔ اب کسی سینٹ کا کھانا ہے۔ کل پوپ کی سالگرہ ہے، پر کریں کیا کہ اپنے ہندی اسکولوں کا تو یہ حال ہے کہ ان کی پرنسپل تک انگریزی کے جملے صحیح نہیں بول سکتی۔ اب کریں تو کیا کریں، کاش ہم ان کو یہاں سے باہر کسی اچھے ہوسٹل میں ڈال کر پڑھوا سکتے۔ وہ جو لوگ ہیں نا کہ اگر اپنے بچے کو برباد کرنا ہے تو کسی ہندی اسکول میں ڈال دو۔ ان کے اتنی مایوس باتوں اور دل شکستہ لہجوں نے ان کا نرم دل دکھا دیا ہے۔ وہ بڑی نرمی سے ان کو سمجھاتی ہیں۔ ایک فلسفیانہ قول فلسفیانہ انداز میں کہتی ہیں:

"ارے بھئی بھگوان کی دیا پر وشواس رکھو دیکھو سیانے کہہ گئے ہیں، آدمی کا دل اور جیون خالی الماری کے سمان ہوتا ہے۔ بھگوان کی دیا سے اس الماری کے سارے خانے ایک کے

بعد ایک بھر جاتے ہیں۔ بس تھوڑے صبر کی ضرورت ہے۔ صبر ہی اصل چیز ہے باقی تو موہ اور مایا کا جال ہے۔ چھوٹے سپنے اور آشائیں اور منش کو صبر کے ساتھ ساتھ اپنے اندر اچھے اور برے کی تمیز کو باقی رکھنا ہوتا ہے۔ باقی تو سب بھگوان کی دیا اور کرپا ہی سے ملتا ہے"۔

میں اپنے کان بند کر لیتی ہوں اور ایک دم کھڑی ہو کر زیر لب بڑبڑاتی ہوں:

"بھئی مجھے پڑھنا ہے"۔ بھیا اور چھوٹا غائب ہیں۔ غدار کہیں کے مگر آج کے خیال یا خبر سے بھی تو محروم رہے۔۔۔۔۔۔ یعنی کہ زندگی ایک خالی الماری ہے۔۔۔۔۔۔ چلو خیر اب چاچا آ چکے ہیں اور لونگ روم میں موجود ہیں۔ اب ہماری کوشش یہ ہے کہ ہماری گھریلو اور فیملی گپ شب اور باتیں کمرے سے باہر نہ نکل سکیں اور اخبار کے صفحوں کی سرسراتی ہوئی آوازیں دب جائیں۔ پر کیا کیا جائے تین جوڑ کانوں میں یہ سرسراہٹ پڑ چکی ہے اور وہ اب اسی طرف لگے ہوئے ہیں کہ اخبار کے صفحے سنسنی خیز مسئلوں اور باتوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اقلیتوں کے حقوق کی باتیں، جنتا کی بپتائیں اور دکھڑے، مظلوم مہیلاؤں کی دلخراش آہیں اور پکار۔ پھر انقلاب کی باتیں اور کالیں۔ اخباروں کے اداریئے اور اداریوں میں زیر بحث آنے والے مسائل، اخراجات اور ان کے لئے دی جانے والی مالی امداد۔ سرمایہ اور سرمایہ کاری۔

"بجٹ۔۔۔۔۔۔ بجٹ۔۔۔۔۔۔ بجٹ۔۔۔۔۔۔" اماں کہہ رہی ہیں۔

"یہ دیکھو لونگ روم میں بھی یہ لوگ بجٹ ہی کی بات کر رہے ہیں"۔ اماں کا کہنا ہے کہ منا چاچا کے پتر اور پیشین گوئیاں دو سال تک تو جنتا کے کرم کی لیکھ کے بارے میں کسی بھی تبدیلی کی کھوج لگا نہیں پائیں گی۔ کچھ بھی تو کھوج پا نہ سکیں گے یا پھر وہ چاہتے ہی نہیں کوئی ایسی نئی بات کے بارے میں کچھ دیکھنا اور کہنا۔۔۔۔۔۔ ارے تو بتاؤ نا کچھ تو کہو"۔ اماں اس طرح کہہ رہی ہیں جیسے وہ آنے والے وقتوں کے بارے میں ہر بات سننے کو تیار ہیں اور سننے کا حوصلہ بھی رکھتی ہیں۔ جیسے انہوں نے ہمارے اندرونی خیالوں کو تاڑ لیا ہے۔

"اچھا پھر اس کے سوا جنتا کے پاس کوئی دوسرا چارہ ہے بھی تو نہیں"۔ یہ کہتے کہتے وہ رک گئی ہیں اور بڑی گھمبیر آواز میں کہتی ہیں:

"میں پوچھتی ہوں یہ بات وہ تین چار نہیں چار سو اور ستاونویں بار کہہ رہی ہیں۔ کہہ کیا رہی ہیں اپنی دانش اور فلسفے کے موتی بکھیر رہی ہیں۔ ہاں ان کے لئے جوان کی بات پر کان دھرنا

چاہتے ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ میں پوچھتی ہوں کہ کسی چیز کو توڑنا اور تباہ کر دینا تو آسان ہے پر اس کی جگہ کوئی چیز بنانا اتنا آسان نہیں۔ یہ ان ہونی سی بات ہے۔ اب یہ جو نئے لوگ ہر ایک بات میں توڑ پھوڑ کا دستہ پکڑ رہے ہیں۔ تو ہے کوئی دوسری تدبیر ان کے من اور سوچ میں۔ اب یہ جو موجودہ سسٹم اور چلن ہے تو اس کو توڑ کر کون سا نیا چلن اور سسٹم لانے کی سوچ رہے ہیں۔ کیا انہوں نے کوئی نئے آدرش اور نئے اسٹینڈرڈ سوچ رکھے ہیں۔ بھئی جن آدرشوں اور چلن کی توڑ پھوڑ میں وہ جی جان سے لگے ہوئے ہیں، اس کو تباہ کر کے وہ کون سی نئی ریت اور چلن لائیں گے۔ آخر ہمارا ایک کلچر ہے، ہماری تہذیبی روایتیں ہیں، اس جگہ کون سی تہذیب اور سماجی اقدار آئیں گے۔ یہ جو اگلے پچھلوں کے درمیان نئے پرانے کا جھگڑا ہے تو یہ ایک چکر ہے، پہیہ ہے جو صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ ایک دھیمی سی مدھم سی آواز کہہ رہی ہے۔ بس ایک بار چل تو پھر اس کے رکنے کا کوئی امکان نہیں رہتا۔ اچھا اب سوال یہ ہے کہ اس چکر پھیر میں کوئی پروگریس آئی نظر کبھی کسی کو۔

"نہیں۔۔۔۔۔۔ نہیں بھئی ایسی بات تو نہیں"۔ حکومت ہند، بھارتیہ سرکار کے ایک وفادار کی آواز، بے مثال اور روشن کارکردگی دکھانے والی سرکار کے شاندار کاموں اور کارناموں کے اعداد و شمار کی لمبی چوڑی فہرست سنائی جا رہی ہے۔ ہڑتالوں کی روک تھام اور قابل قبول تصفیے جی این پی میں اضافہ اور آبادی کے پھیلاؤ میں کمی۔ تشدد اور فسادات پر قابو پانا۔ سوچنے کی بات ہے اگر یہ لوگ نہ ہوتے اور ان کی حکومت نہ بنتی تو کیا یہ سب ممکن ہوتا اور یہ کامیابیاں جواب حاصل ہوئیں سننے میں بھی آتیں۔

"آپ یہ دیکھیں بھابی۔۔۔۔۔ "چاچا کی شارک مچھلی کے تیز دھار دار سفنوں کی مانند تیز مخفی کٹیلی آواز کانوں کو چیرتی ہوئی دماغ تک پہنچ رہی ہے۔

"بات یہ ہے کہ یہ اپنی اپنی سوچ اور برتاوے کی بات ہے کہ میز پر آدھا گلاس پانی رکھا ہے، اب چاہے آدھا بھرا کہہ لیں، چاہے آدھا خالی۔ بات تو وہی رہے گی۔ پانی تو اتنا ہی رہے گا جتنا گلاس میں ہے۔ اب ہمارے یہاں آپ جیسی دھارمک اور منصفانہ سوچ رکھنے والے جو چند لوگ ہوں گے وہ تو یہی کہیں گے کہ آدھا بھرا ہے۔ پر اس دیس میں بسنے والی جنتا کی اکثریت تو یہی مانے کی آدھا گلاس خالی ہے۔ اب صاحبو! آپ ہی بولیں کہ میں غلط کہہ رہا ہوں یا ٹھیک"۔ کمرے میں تائیدی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور سنائی دے رہا ہے۔ چھتے کے آس پاس شہد کی

مکھیوں کی بھن بھناہٹ جیسا۔۔۔۔۔۔جس پر چاچا کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد فرماتے ہیں:

"میرے گرو جی کا تو یہ قول ہے کہ یہ جیون کیا ہے ایک بند مٹھی اور بس"۔

اس گھر میں جیسی بھانت بھانت کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، کبھی یہ کہ "جیون تو ایک الماری سمان ہے"۔ کبھی آواز آتی ہے کہ "جیون تو ایک بند مٹھی ہے"۔ ان کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ ایک دن یہ بات بھی سننے میں آ جائے گی کہ یہ جیون تو "ایک تابوت ایک ارتھی ہے"۔

"ہاں تو بند مٹھی کا تو یہ ہے کہ اس کو جتنا کس کر بھینچ کر بند کر لو گے یہ تنگ ہو جائے گی اور اس کی سمائی اور گنجائش بالکل ختم ہو جائے گی اور جتنا کھول دو گے ہاتھ کھل جائے گا۔ فراخ دستی آ جائے گی۔ پکڑ مضبوط ہوتی جائے گی۔۔۔۔۔ کیوں بھابی! آپ کا کیا خیال ہے"۔

اب کے چاچا نے بات ختم کر دی ہے اور ایک نیا ہی موضوع چھڑ گیا ہے، وہ ہے چاچا کے گرو جی کے تصوف اور روحانی بدھی کا۔ کیا کہنا ان کے گیان اور بدھی کا۔ بات یہ ہے کہ گرو جی کوئی ایسے ویسے نہیں۔ یورپ کے ایک شاہی گھرانے سے ان کا نسبی تعلق ہے اور یہیں پر تو آ کر یہ بات کھلتی ہے۔ مشرق کی بڑائی اور مہانتا کی۔ یورپ کے پاس ہے ہی کیا سچائی اور آتما کی شانتی کھوجنے والوں کو دینے کے لئے۔ خالی خولی کھوکھلی مادیت تو پرم آتما کی۔ کھوجی کی تسلی نہیں کرتی نا جو خود ہی شانت نہ ہو تو کسی دوسرے کو کیا شانت کرے گا۔ بس اسی کارن گرو جی نے انڈیا آ کر اپنا ڈیرا جمایا ہے۔ "اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ پیسہ ہے کیا چیز، پیسے کی حقیقت ہے کیا؟ اصل چیز تو آتما کی شانتی اور تسلی ہے کہ آدمی کا اندر کا اپنا آپ شانت رہ سکے"۔

اب مہنگائی اور قیمتوں کے چڑھنے والی بات تو بھٹک چکی ہے، اب اور ہی باتیں نکلتی آ رہی ہیں۔ پورا کمرہ بڑی گمبھیر رومانیت سے معمور ہو رہا ہے اور جیسے جلتی ہوئی اگربتی سے اٹھتا ہوا خوشبودار دھواں آس پاس موجود ہر ایک کے اندر داخل ہوتا اور اس کو اپنی لپیٹ میں لیتا چلا جاتا ہے۔ ایسا ہی اس روحانیت کی بات کا اثر کمرے میں موجود لوگوں پر ہو رہا ہے۔ ایک پراسرار سی نند اسی کیفیت ہر کسی پر طاری ہے۔

اچانک ہی کوئی ایک بول اٹھتا ہے:

"بھئی انگریز تو اب ایک ہاری ہوئی قوم ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ان کے زمانے لد گئے ہیں۔ اگر دیکھو تو ان کا وقت بگڑ چکا ہے"۔ اسی بات پر کوئی اور ٹکڑا لگاتا ہے۔

MashalBooks.org

"ارے اب تو امریکہ کی باری ہے۔ اب اس کی چڑھی کمان بھی اترنے ہی کو ہے۔ بس ایک دن رومن ایمپائر کی طرح اس کا بھی زوال ہوگا۔ بھٹہ بیٹھ کر رہے گا۔ اب بہت جلد ان کے کرتوتوں کا بدلہ ان کو مل کر رہے گا اور کیا جیسی کرنی ویسی بھرنی اور ساتھ اٹلی بھی ڈوبے ہی ڈوبے۔ میں تو کہتا ہوں کہ جرمنی اور جاپان بھی تباہ ہو کر رہیں گے۔ یہ اتنی مادیت پسندی ان کو نہ لے ڈوبی تو نام بدل دینا"۔ کچھ دیر سننے والوں پر اپنی بات کا اثر دیکھنے کے لئے چپ ہو گئے۔۔۔۔۔اور پھر ایک دم بول پڑے ہیں۔ "بھئی میں فرانس میں تھا تو۔۔۔۔۔ذرا سننے کی بات ہے کہ ایک روز ایک بوڑھی خاتون مجھے لوور میں ملی اور باتوں باتوں میں مجھ سے کہنے لگی کہ مرنے کے بعد اگر میرے بس میں ہوا تو میں تو یہی کہوں گی میرا اگلا جنم انڈیا میں ہو"۔

"اگر تو اس دنیا کی کٹھنائیوں اور الجھنوں کے مسئلے کا حل ملے گا تو دیکھ لینا تیسری دنیا ہی میں ملے گا"۔ بابو اپنی ٹھہری ہوئی آواز میں انگلش میں یہ بات کہہ رہے ہیں۔ آخر میں جا کر ترقی پذیر ملکوں ہی کا دنیا کی معیشت پر کنٹرول ہوگا اور یہی ترقی پذیر مما لک ہی ایک نیا ورلڈ آرڈر بنائیں گے۔ بھئی لکھ لو میری بات کہ یہی کچھ ہو کر رہنا ہے"۔

اس الہامی اور تقریباً ناقابل یقین بیان کے ساتھ ہی کمرے میں ایک گہرا سناٹا اور گھمبیر خاموشی چھا جاتی ہے۔ اسی اثنا میں ہری تازہ گرم گرم بھاپیں اٹھتے ہوئے پکوان اور چائے کے ساتھ کھانے والی چیزیں لے کر آ جاتا ہے۔ بات کا رخ پھر بدل جاتا ہے اور پورے زور شور سے باتیں ہونے لگی ہیں۔

مالینی موسی کہہ رہی ہیں۔ "آپ انگریزی کے بنا اپنا کام چلا ہی نہیں سکتے۔ یہ ان کی سب سے من پسند تھیوری اور بات ہے۔ دیکھیں نا کہ آج جو نئے زمانے کے اتنے سارے علوم ہیں ان سے ہمارا ناتا صرف ایک انگریزی کے ذریعہ تو قائم ہے، تو اب ہم انگلش کے بنا آج کے نئے زمانے کی وِدیا سے کیسے اپنا ناتا جوڑ سکتے ہیں اور کیسے ان نئے علوم کی جان کاری حاصل کر سکتے ہیں اور یہ تو بڑی ناانصافی کی بات ہے کہ ہم انگلش سے ناتا توڑ لیں"۔

"بھئی ساری بات یہ ہے کہ یہ سارے کا سارا پروپیگنڈا جو ہے سب ہندی بولنے والی بیلٹ کا ہے۔ مالینی موسی کے پتی کہہ رہے ہیں۔ "بھلا کوئی ان ہندی کے پربھوں سے پوچھے کہ ان کے اپنے بچے کن اسکولوں میں پڑھتے ہیں؟ اور پھر یہ ہندی اسکول جو ہیں ان کی حالت تو یہ

ہے کوئی آداب سکھاتے ہیں نہ کوئی ڈسپلن ہوتا ہے"۔ شالینی موسی اپنی کونونٹ والی سکہ بند ترشی ترشائی انگریزی میں کہتی ہیں۔ ان کا چھوٹا بیٹا دو پلیٹ پکوڑے، ان گنت مٹھائیوں کے ٹکڑے اور چار عدد زناٹے دار تھپڑ کھا چکنے کے بعد اب سو گیا ہے۔

"فراڈ۔۔۔۔۔۔ کہیں کے"۔ بھیا اخبار ایک طرف ڈال دیتے ہیں۔ اسی وقت ہری اندر آ کر اماں کا پیغام دیتا ہے کہ وہ ہم کو اپنے کمرے میں چائے پینے کے لئے بلا رہی ہیں۔ "ان سے کہنا کہ ہم ادھر ہی چائے پئیں گے۔ بڑے بھیا میرا کندھا دبا کر مجھے اٹھنے سے روک دیتے ہیں۔ بیٹھو تم یہاں سے نہیں اٹھ سکتیں"۔

"ٹھہرو۔۔۔۔ یہ شادی نہیں ہو سکتی"۔ چھوٹا سپاٹ چہرہ لئے ہندی فلموں کا مکالمہ دہراتا ہے۔ ہری پھر واپس اماں کے پیغام اور چائے پر بلاوے سے انکار کا جواب لے کر واپس گیا ہے۔ اچانک ہی ایک دم خاموشی اور سناٹا چھا جاتا ہے۔ ہم نے اپنی سانس روک لی ہے، ہر چیز اپنی جگہ پر ٹھہر گئی ہے۔ جیسے فلم چلتے چلتے رک گئی ہو۔

پیالیوں کی جھنکار کے ساتھ باتوں کا سلسلہ پھر جاری ہو جاتا ہے۔

"یہ جو سرکشی ہے نا یہ بھی اس نقالی کا ایک حصہ ہے جو مغربی ٹین ایجرز اپنے بڑوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ میں آپ سے کہہ رہا ہوں، اب وہ زندگی کے ہندوستانی آدرش تو باقی نہیں رہے۔ اب مغرب زدہ تعلیم کا یہی کچھ نتیجہ سامنے آئے گا۔ ارے بھئی ہم بھی تو کبھی جوان تھے اور ہم نے انگریزی پڑھی تھی۔ مگر ہم تو اپنے کلچر اور آدرشوں سے ناتا نہیں توڑ بیٹھے تھے۔ ملی جلی آوازیں کانوں میں چلی آ رہی ہیں۔ سرمایہ۔۔۔۔۔ عیب جوئی، ملکیت، اپنے حقوق کی جانکاری اور شعور نکتہ چینی۔۔۔۔۔ تجربہ۔۔۔۔۔ گیان ودیا وغیرہ وغیرہ۔

"بات یہ ہے"۔ چاچا نے اپنی بلند بانگ اور رعب دار آواز کو صاف کرنے سے پہلے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ کمرے میں موجود سامعین پکوڑے چباتے ہوئے مٹھائیاں اور چٹ پٹی چاٹیں کھاتے کھاتے ان کے اگلے بیان اور ارشادات کے منتظر ہیں۔ "بات ساری یہ ہے کہ ہمارے آج کے نوجوان تو خالی برتنوں جیسے ہیں اور یہ مثل تو سب جانتے ہیں کہ خالی برتن شور زیادہ کرتے ہیں"۔ اجتماعی قہقہہ بلند ہوتا ہے۔ چاچا کی باری جاری ہے۔ "یہ جو اپنے نوجوان لوگ ہیں نا۔۔۔۔ بھائی ان کا تو کہنا ہے کہ ہر ایک کا اپنا جیون ہے ہر کوئی اپنے لئے جیتا ہے اور یہ بھائی

بہن۔۔۔۔۔ ماں باپ۔۔۔۔۔ یہ تو بس نام ہی نام کے رشتے ہیں اور ان کی اصل حقیقت ہے ہی نہیں۔ جاتی (قوم) کلچر۔۔۔۔ دھرم سارے کے سارے بے معنی ہیں۔ ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ اچھا بھائی میں کچھ غلط کہہ رہا ہوں"۔ چاچا نے مالینی موسی کے پتی کو مخاطب کیا اور فیصلہ ان پر ایسے چھوڑ دیا جیسے اولمپک کی مشعل ان کے ہاتھ میں تھما دی ہو کہ اب تم آگے بڑھاؤ اور ان کا تو یہ ہے کہ ایک گھاگ پیشہ ور فلور کراسر جس طرف کا پلہ جھکتا جھٹ اسی کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دیتے۔ سوفرمارہے ہیں:

"ارے بھئی آپ نے تو پورم پور ملین ڈالر اسٹیٹمنٹ دے ڈالی ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی تو مالینی جی سے یہی بات کہہ رہا تھا کہ ہم کو چاہیے کہ ان سے کبھی یہ توقع ہی نہ رکھیں کہ یہ بڑھاپے میں ہماری سیوا کریں گے اور آرام پہنچائیں گے، جو سچ پوچھیں تو یہ جو اپنے بچوں سے اتنا پریم اور مامتا ہے تو وہی تو ہماری ساری چنتاؤں اور اداسیوں کا کارن ہے۔ ارے دیکھ لینا کہ یہ لوگ ہم جن کے آگے پیچھے پھرتے اور اپنا دم چھڑکتے رہتے ہیں، یہی لوگ ایک دن ہمیں یوں اڑن چھو کریں گے جیسے دھان میں بھوسہ چھڑ کر الگ کر دیا جاتا ہے۔ ایک پھونک سے اڑا دیں گے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ہم سب سے تو تم ہی اچھے رہے کہ ہر چنتا سے آزاد مگن۔۔۔۔۔ نہ بیاہ، نہ پتنی، نہ بچے۔۔۔۔ وہ جو لوگوں کا کہنا ہے نا۔۔۔۔ "نہ جورو نہ جاتا اللہ سے ناتا"۔ اب پیالیاں پھر کھنکنے لگی ہیں۔ دھڑام سے کچھ گرتا ہے۔ شاید چھوٹے کے ہاتھ سے کوئی چیز چھوٹ گئی۔

اچانک ہی مجھے ایک خیال آتا ہے اور احساس ہوتا ہے کہ ہم لوگ کتنے کوڑھ مغز اور گدھے ہیں کہ بلاوجہ ہی اپنے بے قصور معصوم والدین سے کھینچا تانی کرتے رہتے ہیں اور ان کو رنج پہنچاتے ہیں جبکہ ہمارے اصل دشمن کے چہرے سے تو آج نقاب اٹھی ہے، یہ جو چھچھوندرا ہے نا کہ جس نے اپنے آپ کو ہر ذمہ داری سے بری الزمہ کر رکھا ہے۔ یہی ہے ذمہ دار۔ نہ شادی نہ بیاہ، بیوی نہ بچے، شتر مرغ کی طرح اپنے گرد کی خواہشوں اور ان کے دیئے ہوئے بھاشنوں کی ریت میں اپنی گردن ڈال کر اپنے آپ کو ہر دنیاوی ٹنٹے سے محفوظ سمجھ لیا ہے۔ اپنی کچلی ہوئی خواہشوں کو ایک بھری بندوق کی طرح اپنے اندر تھام کر روک کر رکھا ہوا ہے اور اس بھری بندوق کا ایک ہی نشانہ ہے اور وہ ہیں ہمارے معصوم اور بیچارے والدین۔ اپنی بھری بندوق کا ان کی طرف نشانہ باندھ کر ان کو ڈراتا رہتا ہے کہ کیا تم کو یقین ہے کہ تمہارے بچے تم سے محبت کریں گے اور

MashalBooks.org

تمہاری عزت کرسکیں گے۔ غدار خبیث، گندگی کا ڈھیر، خدائی خوار کتا۔ بھلا کوئی بات ہے کہ جس دیس کے ستر فیصد کسان بھوکے مررہے ہیں اس دیس کا یہ خوشامدی کتا ایک خودساختہ بدیسی گرو کی سیوا میں تن من سے لگا ہوا ہے۔ اس کی زمینوں کے لئے جرمن ٹریکٹر، اس کے فارم کے آسٹریلیا کے بیلوں کی جوڑی اور گائیں امپورٹ کرتا پھرتا ہے، اپنی ساری حاکمانہ اور افسرانہ قوتوں کو اس کی سیوا کے لئے استعمال کررہا ہے۔ یہ اس کے ٹرک اور بلڈوزر ہی تو ہیں جو جاکر غریبوں کی جھونپڑ پٹیوں کو مسمار کرکے حرف غلط کی طرح مٹا رہے ہیں اور پھر جب یہ بستیاں ڈھادی جاتی ہیں تو پھر یہی لوگ بجی سجائی سوشل ورکرز، مہیلاؤں کو ان کی ڈھارس بندھانے کے لئے پہنچادیتے ہیں جو زرق برق، لباسوں، زیورات سے سجی بنی ٹھنی موقع پر پہنچتی ہیں اپنے سن گلاسز آنکھوں پر چڑھا کر لاشوں اور مردہ جسموں کا معائنہ کرتی ہیں۔

یہ شخص لوگوں کی جس قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں ناکارہ اور نالائق استاد، چالاک کاؤنسلر، اقتدار کے بھوکے سیاست دان اور کرپٹ رشوت خور کلرک شامل ہیں کہ ان ہی کے گٹھ جوڑ نے اس طبقہ کو جنم دیا ہے۔

فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔

خاموشی!

گھنٹی دوبارہ بجی ہے۔

بابو ریسور اٹھا کر بات کرتے ہیں اور فون واپس رکھ دیتے ہیں۔ بابو بتا رہے ہیں کہ "اماں کی رپورٹ آ گئی ہے۔ سب ٹھیک ہے، وہ جو گلٹی نکالی گئی ہے اس میں کینسر کے آثار قطعی نہیں ہیں۔ سکون اور اطمینان کے اثر سے ان کی آواز دب گئی ہے، بہت کمزور سی نکل رہی ہے آواز۔

اماں ہنستے ہوئے کہہ رہی ہیں مجھے تو پہلے ہی یقین تھا کہ سب ٹھیک رہے گا۔ اس لئے کہ مناچاچانے میری جنم کنڈل دیکھ کر بتایا تھا کہ چنتا والی کوئی بات مجھے تو نظر نہیں آتی۔

"ارے بھائی ہری تھوڑی چائے تو اور لاؤ"۔ چاچا ہری کو آواز دیتے ہیں۔ "اچھا دیکھو اس بار اچھی اور خوب اسٹرونگ ہونا چاہیے"۔ کمرے میں پھر سے باتوں کی گونج سنائی دینے لگتی ہے۔

اچانک بھیا اچھل کر بروسلی کے خطرناک داؤ والے انداز میں کراٹے کا ہاتھ چھوٹے

کی گردن کی طرف ہوا میں چلاتے ہیں۔۔۔۔۔۔"اسمگلر کی گردن"۔

"ہیو۔۔۔اپ۔۔۔۔ "چھوٹا پہیے کی طرح چکر پھیر لیتا ہے اور اپنا دفاع کرتے ہوئے میری اور ایک ڈنکی کک چلاتا ہے۔۔۔۔۔وہ سپر اسٹار امتیابھ بچن سمجھ رہا ہے اپنے آپ کو۔

"ہو۔۔۔۔۔ "میں نے لیک کراس کی پشت پر اپنی گرفت کو مضبوط کر لیا ہے۔ میں سپر مہیلا۔۔۔۔سپر وومن ہوں۔

اور پھر ہم آپس میں گتھم گتھا ہو کر ایک دوسرے کو کھیڑتے ہوئے فرش پر گر جاتے ہیں۔اس طرح جیسے ہم مہلک اور جان لیوا زخموں سے چور چور ہو چکے ہوں۔

(ہندی سے انگریزی میں منیشا چودھری نے ترجمہ کیا)

☆ ☆ ☆

MashalBooks.org

تامل افسانہ

منیا کا

لکشمی کانن

منیا کا نے خود کلامی کے فن میں ایسی مہارت حاصل کی ہوئی تھی کہ جس کا جواب نہ تھا، وہ بے جھجک اکیلے میں اپنے آپ سے باتیں کرتی تھی۔ باتوں سے اس کا کوئی وقت خالی نہ ہوتا، جب دیکھو چلی جا رہی ہیں، باتوں میں مگن، چھن بھر کو زبان رکتی نہ تھی۔ کبھی نیچی آواز میں بڑبڑ کرتی اور کبھی اونچی اور صاف آواز میں بک بک کرتی رہتی۔ اچھا ایک بات اور تھی کہ اس کی ان ہی باتوں کا کوئی معنی مطلب اسی وقت سمجھ میں آ سکتا تھا جب وہ صرف اپنے آپ سے ہی بات کر رہی ہوتی تھی۔ اب تو ہر کوئی اس کے یوں بے جھجک اور اپنے آپ سے بولتے رہنے کا عادی ہو چکا تھا۔

پتلی پتلی تکلہ سی ٹانگوں پر اس کو تیز تیز چلتے دیکھ کر نقارے پڑتی ہوئی چوبوں کا خیال آتا تھا پر سچی بات ہے کہ ان ہی پتلی پتلی سوکھی سوکھی ٹانگوں پر وہ اپنے وجود کو اٹھائے بڑی ترک پھرک اور چاق چوبند تھی۔ بنگلور کی سردی میں کانپتی تھرتھراتی ہوئی وہ حیرت انگیز پھرتی سے اپنے سارے کام انجام دیتی رہتی تھی۔ کبھی دیکھو تو سویرے سویرے ٹھنڈے برف پانی سے لوگوں کے برتن بھانڈے دھو مانجھ کر لگا رہی ہے، ان کے کپڑے دھو دھو کر نچوڑنے اور الگنی پر پھیلانے میں جتی ہوئی ہے۔ کبھی گھروں کے احاطوں میں جھاڑو بہارو کر رہی ہے اور پھر دروازوں کے آگے چاول کا آٹا پور پور کر رنگولی کے خوبصورت ڈیزائین ڈال ڈال کر دہلیز سجا رہی ہے۔ اس کام کو بھی وہ پورے سلیقے اور فنکارانہ انداز میں انجام دیتی تھی اور اس تمام محنت اور مشقت کے دوران زبان

چلتی رہتی تھی۔ منٹ بھر کو نہ رکتی۔ مگر یہ نری زڑ اور بکواس نہیں ہوتی تھی۔ با قاعدہ اور مسلسل گفتگو کے انداز میں سوال جواب اور باتیں، جو وہ اپنے عزیزوں کے ساتھ کرتی تھی، ان کے جواب بھی وہ خود ہی ان کی طرف سے اپنے آپ کو دیتی جاتی تھی۔ اس کا سلسلہ کلام دوستوں سے بھی رہتا اور دشمنوں سے بھی۔ بات چیت کا انداز بھی اسی انداز سے چلتا ہنسی مذاق، چھیڑ چھاڑ، گلے شکوے، غم غصہ غرض ہر موقع اور تعلق کے حساب سے بات چیت جاری رہتی۔

اس کو اس چلتے پھرتے باتوں میں مسلسل لگے دیکھ کر آس پاس، گلی محلے میں کھیلنے والے بچوں نے اس کا نام ہی وا کی ٹا کی منیا کا رکھ دیا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی وہ نعرے لگانے لگتے۔ آ گئی آ گئی !منیا کا وا کی ٹا کی موئی یا کا۔ بڑے لوگوں کا یہ تھا کہ وہ اس کو یوں مسلسل بات چیت اور سوال جواب میں محو کام کاج کرتے دیکھتے تو مسکرا دیتے۔ اس کی اس حرکت سے لطف اندوز ہوتے، پر اس کو ٹوکتے نہ تھے۔ اس کے کام کاج کا یہ تھا کہ انجانے یولو کے گھر سے بیس روپیہ مہینہ پر کام کرتی تھی۔ پچیس روپیہ پر واسدیو چھٹی کے گھر کی جھاڑ وٹا کی کے علاوہ برتن کپڑے بھی دھوتی تھی۔ اچھا راما راؤ کے گھر اس نے اتنے عرصے تک کام کیا تھا کہ ان لوگوں نے ایک طرح سے اس کو ریٹائر کر کے اس کی گریجوئٹی مقرر کر دی تھی اور اپنے باغ کے ایک کونے میں ایک چھوٹی سی جھونپڑیا ڈالنے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ اس سے اس کو بڑی سہولت ہو گئی تھی۔ اس کی جھونپڑی کے پاس ہی نلکا لگا ہوا تھا۔ پتھروں کو جوڑ کر نلکے کے ساتھ ایک چبوترہ بنایا ہوا تھا، جس کے اوپری حصہ پر سیمنٹ لگا ہوا تھا۔ اسی چبوترے پر وہ راما راؤ کے گھر کے کپڑوں کے ساتھ ساتھ اپنے کپڑے بھی دھولیا کرتی تھی۔ اپنے پھٹے پرانے گودڑے چھیتڑوں کو وہ ایک چھوٹی سی الگنی پر ڈال کر سکھالیا کرتی تھی۔ الگن کی رسی کا سرا ایک طرف نیم کے ساتھ بندھا ہوا تھا اور دوسرا سرا اس کے قریب ہی کھڑے ناریل کے پیڑ کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔

سارے گھروں کے کام کاج سے فراغت پا کر وہ راما راؤ کے گھر واپس آ جاتی تھی۔ مسز راما راؤ ایک نیک دل خاتون تھیں اور منیا کا سے وہ اپنے گھر کے بزرگوں کا سا برتاؤ کرتی تھیں۔ ان کے گھر کی کوئی بھی تقریب اس کے بنا پوری نہ سمجھتی جاتی تھی۔ اچھے برے ہر کاج میں اس کی شرکت ضروری سمجھی جاتی تھی۔ اپنی فرصت کے اوقات میں رتنا راؤ منیا کا کے ساتھ بیٹھ کر گپیں لڑاتی اور ادھر ادھر کی باتیں کیا کرتی تھیں۔ نیم سنجیدہ اور نیم مسخری باتیں۔ وہ منیا کا کو نئی نئی

باتیں بتایا اور سنایا کرتیں اور وہ ان کی باتوں کو مسخرے انداز میں سن سن کر مزے لیا کرتی تھی اور رتنا راؤ بھی اس کی پگلی پگلی مسخری باتوں سے محظوظ ہوا کرتی تھیں۔ تمام دن گھروں میں کام کاج ختم کر لیتی تو سب سے آخر میں وہ ساتھ والے مندر میں جا کر کام کرتی تھی۔ جہاں سے اسے پندرہ روپئے مہینہ ملتا تھا۔ مالی فائدے کے ساتھ ساتھ اس کی آتما کو بھی سکون ملتا تھا۔ دن ڈھلے وہ مندر کا فرش اور سیڑھیاں دھو کر صاف کر دیتی۔ تب کہیں جا کر اپنی جھونپڑی میں گھسنا نصیب ہوتا۔ جہاں جا کر وہ سکون کی گہری سانس لیتی، مٹی کے دیئے میں تیل بھر کر چراغ جلاتی، اس کی ٹمٹماتی روشنی کی لو میں لکڑیاں چولھے میں لگا کر آگ سلگاتی۔ ہنڈیا میں دال ابلنے کو دھر دیتی پھر باجرے کا آٹا گوندھ کر نرم نرم روٹیاں ڈالتی، تھوڑا سا سالن بناتی تب جا کر کھانا کھانے بیٹھتی۔ اکیلی اور تنہا بھوجن کرتے ہوئے وہ اپنی تھالی میں بھر بھر چمچے کھانا پروستی اور جی بھر کر اپنے مرحوم پتی اور بیٹے کو جو عرصے سے غائب تھا، جھڑکیاں دیتی اور زور زور سے صلواتیں بھی سناتی جاتی تھی۔ اس احساس کے تحت کہ وہ اپنے جھونپڑے میں تن تنہا ہے بلا شرکت غیرے اور یہ کھانا بھی صرف اسی کے لئے ہے اور یہاں کوئی اس کا ساتھ دینے والا نہیں ہے۔ اسے غصہ آنے لگتا۔ وہ انتقام کے طور پر بھوکے گدھ کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑتی اور اس کا آخری ریزہ تک چن چن کر کھا جاتی۔ اس کو اس خیال سے بڑی تسکین ملتی کہ کھانا اس کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آیا اور اس کے اپنے ہی ہاتھوں سے بنا ہے۔ کسی دوسرے نے ہاتھ اٹھا کر نہیں دیا۔

جب خوب سیر ہو کر کھا چکتی تو پھر اپنی جھونپڑی کو اچھی طرح جھاڑو لگا کر صفائی کرتی اور اس کے بعد گڑ کا ایک ٹکڑا لے کر بیٹھ جاتی اور کتر کتر کر کھاتی، جب ٹکڑا کھا کر ختم کر لیتی اور اپنے منہ میں رہ جانے والے ذرات کو اچھی طرح چوس چوس کر اپنے حلق کے نیچے اتار رہی ہوتی تو رات کے جھکے اندھیروں کی اور اس کی آنکھیں کسی ایک نقطہ پر جم جاتیں۔ خاموشی کے سمے اس کو لگتا کہ وہ اندر سے بالکل خالی، بالکل ڈھنڈھار ہو چکی ہے۔ اس کا اندر کا آپ ہر قسم کی آلائش اور ہر طرح کے بندھنوں سے آزاد اور پاک ہو چکا ہے، جیسے اس کی جھونپڑی صاف ستھری اور خس و خاشاک سے پاک ہو چکی ہے۔ اس کے اندر کا اپنا آپ بھی ہر طرح کی سوچ اور احساس سے خالی اور پاک ہو چکا ہے۔ ایک دم گونگا اور بہرا کہ نہ کوئی باہر کی آواز اور صدا اندر داخل ہو سکتی ہے نہ اندر کی صدا باہر جا سکتی ہے۔ پر اس گمبھیر خاموشی اور ڈھنڈھار پن کے باوجود ایک احساس تھا جو اس کی کایا کے

اندر بھی اور باہر بھی چھایا ہوا تھا اور وہ احساس تھا اتھاہ اور گمبھیر شانتی اور سکوں کا۔

وہ اپنے بڑھاپے کے اثر سے ٹمٹماتی آنکھوں کی مدھم جوت کو گگن پر پھیلے اندھیاروں پر گاڑ کر ٹکٹکی باندھ کر بیٹھ جاتی۔۔۔۔۔۔راؤ صاحب کے بنگلے کے باغ کے ایک دور افتادہ گوشے میں ناریل کا ایک جھنڈ کھڑا تھا۔ ناریل کے اس کنج کے پچھلی طرف کٹھل کا ایک گھنا اور چھتنار پیڑ کھڑا تھا۔ جس کی چھایا تلے منیا کا کی جھونپڑی ایک ننھے سے گھونسلے کی طرح چھپی ہوئی تھی، جس میں وہ ایک کمزور اور ناتوان چروٹے کی طرح محفوظ بیٹھی ہوتی تھی۔ بنگلور کی اندھیری راتوں میں جب ٹھنڈی اور تیز وتند ہواؤں کے جھکڑ چلتے اور باغوں اور کنجوں میں کھڑے ناریلوں اور چھتنار پیڑوں کی ڈالوں میں سائیں سائیں کرتی اور غراتی کراہتی ہوائیں گزرتیں تو منیا کا کو ناریل کے جھومتے ہوئے پتے اور ڈالے کسی ناری کے کھلے اور لہراتے بالوں کی طرح دکھائی دیتے، اور اسے ایسا لگنے لگتا کہ کالی رات کی ہوا میں لمبے لمبے بال لہراتی ہوئی کوئی بلا ناچ رہی ہے۔ ناچے جا رہی ہے، شیطانی رقص میں مگن"۔

"بنگلور سے کچھ فاصلے پر کوکنیا ہلی منیا کا کا گاؤں تھا۔ وہاں کے لوگ بھوتوں پریتوں کو بڑا مانتے اور ان سے خوف زدہ رہتے تھے اور بھوتوں پریتوں کی بڑی باتیں کیا کرتے تھے، وہ کہتے تھے کہ " بھوت پریت سدا ناری کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ شیطانی قوتیں اور بھوت پریت ایک بھیانک بڑے بڑے دانتوں والی چڑیل اور پاگل ڈائن عورت کے روپ میں ہی پدھارتے ہیں جو اپنے بڑے بڑے اوبڑ کھابڑ دانت باہر نکوسے اور ہونٹوں پر گھناؤنی مسکان سجائے آتی ہے اور آواز اس کی جیسے کالے کالے بادلوں میں آتی ہوئی گرج، لمبے لمبے بال منہ پر لہراتی ایک مستی اور مدہوشی کے عالم میں شیطانی تال اور گت پر ناچے چلی جاتی ہے، ناچے جاتی ہے۔

بنگلے کے باہر باغ کے ساتھ جو چار دیواری تھی، اس کے ساتھ ایک پیپل کا گھنا اور اونچا پیڑ کھڑا تھا، جس کے پتے چاند کی دھیمی دھیمی مدھم چاندنی میں چاند کی طرح لشکارے مارتے تھے۔

راؤ گھرانے کا یہ باغ دونوں میاں بیوی کی توجہ سے ہرا بھرا لہلہاتا رہتا تھا۔ دونوں کے لاڈ پیار اور توجہ نے اس باغ کو بنگلور بھر کے باغوں میں بڑی انفرادیت دے رکھی تھی۔ طرح طرح کے توانا اور سرسبز پودے قسم قسم کے رنگ برنگی پھولوں سے لدی کیاریوں کے علاوہ ان کا باغ

پھلوں کے شاداب اور توانا درختوں کے لئے بھی مشہور تھا۔ جن کی ڈالیں پھلوں سے لدی رہتی تھیں۔ پھولوں اور پھلوں کے علاوہ باغ کے ایک حصہ میں ہر موسم کے اعتبار سے ہر قسم کی سبزیاں بھی بکثرت لگی ہوتی تھیں۔ اس باغ کی سرسبزی شادابی اور بارآوری کو دیکھنے والا کچھ دیر کو یہ بھول جاتا تھا کہ دنیا میں غربت، بیماری، بے کسی اور دکھ نام کی کوئی چیز بھی ہوسکتی ہے اس باغ کے پھلوں سے لدے درختوں اور قسم قسم کے پودوں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ یہ بڑے نازوں کے پالے بچے ہیں۔ منیا کا کو اس باغ سے بڑا پریم تھا۔ جی جان سے فدا تھی اس پر۔ پتے پتے بوٹے بوٹے پر جان چھڑکتی تھی۔ دوپہر کے وقت جب مالی باغ میں کام کر رہا ہوتا اور پودوں کو پانی لگا رہا ہوتا تو وہ اس کے مقابلے پر اتر آتی تھی۔ بالٹیوں پر بالٹیاں پانی بھر بھر کر ڈالے جاتی، ڈالے جاتی، پورے باغ میں بھاگی بھاگی پھرتے پھرتے اس کی کمر ٹوٹنے لگتی۔ پھر کچھ ہی دیر کے بعد دن ڈھلنے لگتا تو سارے باغ پر سونا سا بکھرنے لگتا۔ جیسے یونانی داستان کے بادشاہ میڈاس کا ہاتھ چھو گیا ہو اور باغ کا چپہ چپہ سونے میں ڈھلنے لگا ہو۔ اس وقت منیا کا کی دیکھنے والی حالت ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا سونے میں ڈھلتا ہوا یہ باغ اس کی موروثی جاگیر ہو۔۔۔۔۔ وہ وہاں سے اس وقت تک نہ ٹلتی جب تک کہ باغ پر اندھیرے نہ اتر آتے۔

جب آسمان پر اندھیرا چھا جاتا تو وہ واپس اپنی کٹیا سے باہر آ جاتی۔ اندھیرے میں جھومتے ہوئے پودوں اور پیڑوں کی ڈالوں کا نظارہ کرنے جو اس وقت اپنے اسی شیطانی اور آسیبی انداز میں رقص میں مصروف ہوتے۔ دیکھتے دیکھتے اس کو ایسا لگتا کہ اس کا تیزی سے دھڑکتا ہوا دل بھی اسی شیطانی ناچ کی گت پر دھڑکنے لگا ہے۔ ہوا کے تیز و تند تھپیڑوں کے ساتھ ساتھ ان گنت زہریلے سانپوں کی پھنکاریں جیسے کانوں میں گھسنے لگتیں۔ جن کو سنتے سنتے اس پر عجب طرح کی بے خودی طاری ہونے لگتی۔ جیسے وہ اپنے آپ میں موجود نہ ہو اور باہر کے اس رقص کا حصہ بن گئی ہو۔ کالی ماتا کا بہروپ دھار چکی ہو۔

راؤ صاحب کے بنگلے کی کھڑکیاں جلدی جلدی بند کرنے اور ان کی چٹخنیاں لگانے کی آوازیں اور شور سنائی دے رہا ہے۔ راؤ صاحب کے ملازم اور بڑی بیٹی ہوا کے تیز و تند اور سرد جھونکوں کی مدافعت کے لئے جلدی جلدی کھڑکیاں بند کر رہے ہیں۔ باہر ہوا کے جھکڑ کھڑکیوں کے شیشوں سے ٹکرا ٹکرا کر شور برپا کئے ہوئے ہیں اور اندر کی روشنی شیشوں سے چھن چھن کر باہر

باغ کے مختلف حصوں پر پڑ رہی ہے اور باغ کے پیڑوں اور پودوں کے پتے پتے کو نمایاں کر رہی ہے۔ بنگلے کے اندر مکمل سکون ہے۔ مگر باغ کے درمیانی حصے میں اندھیرا ہے، بے چینی ہے، درختوں کا پتہ پتہ جیسے بڑھ کر ناگ کے پھن جتنا پھیل کر پنکھے کی طرح ہل رہا ہے، جھوم رہا ہے، سائیں سائیں ان گنت زہریلے ناگوں کی پھنکاریں بن کر ہوا کے جھونکے ان کے بیچ سے سرسراتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ اندھیری رات میں پھنکاریں مارتی ہوا کی سائیں کو سن کر ایسا لگ رہا ہے کہ ناگوں کے جھنڈ نے منیا کا کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔ تنہا اور اکیلی منیا کا۔ ہزاروں پھنکاریں مارتے ہوئے زہریلے ناگوں کے بیچ پھنس گئی ہے۔ ہری ہری گھاس پر سانپ ہی سانپ، کبھی بھورے کبھی کالے، کبھی گھاس کے رنگ کے اندر ہی اندر لہراتے بل کھاتے اپنے پھن اوپر نیچے کرتے، ان کو اگر کوئی چھت کی کڑیوں سے لٹکتا دیکھ پائے تو بانس کا ایک ٹکڑا پکڑ کر مارنا شروع کر دے۔ مار مار کا بھرتہ نکال دے، پھر وہ کالا سیاہ ناگ راج کو برا اگر تاج کی طرح پھن اٹھائے کنڈلی مار کر بیٹھ جائے تو پھر آپ کٹورا بھر دودھ اس کے آگے رکھ کر ہاتھ جوڑ کر اس کو پرنام کریں گے۔ اس کی گرم گرم زہریلی پھنکاروں سے ڈر کر ماتھا ٹیک دیں گے اور اگر کہیں یہ پتہ لگ جائے کہ یہ ناگ تو بے حس و حرکت ہے نہ پھنکاریں مار رہا ہے، نہ بل کھاتا ہے اور پھن لہراتا ہے، اپنی جگہ پر جم کر پتھر کا بن گیا ہے تو آپ اس پتھر کے ناگ کو دیوتا بنا کر مندر کے ایک گوشے میں سجا دیں گے یا پھر کسی گھنے چھتنار شہتوت کے پیڑ کے سایے میں رکھ دیں گے اور پھر اس کی پوجا پاٹ میں زندگی گزار دیں گے۔ اس کے سخت سنگین پھن پر سیندور کے ٹیکے لگا کر اس کی کنڈلی پر ماتھا ٹیک کر پرارتھنا کریں گے۔ اپنے من میں بسیرا لینے والی آرزوؤں اور تمناؤں کو اس کے سامنے کھول کر رکھ دیں گے۔ اس سے منتیں مرادیں مانگیں گے۔ اس کے آگے ناریل پھوڑیں گے چڑھاوے چڑھائیں گے۔ اس کو اپنے لرزتے کانپتے ہاتھوں سے آشانئ کرائیں گے۔ نرم نرم کچے ناریل کو پھوڑ پھوڑ کر اس کا پانی چھڑک چھڑک کر اسے نہلائیں گے۔ بھجن اور منتر کے بول منہ ہی منہ میں دہرائے گئے اور وہ پتھرایا ہوا بت آپ کو عقیدت اور آشاؤں کی پھوار میں تر بتر دیکھتا رہے گا۔ آپ کو اور آپ کے پیٹ میں پڑ جانے والے اس گڈھے کو جو آپ کے اس برت کے کارن پڑا ہے جو آپ نے اپنی مراد مانگنے کے لئے منت کے طور رکھا ہوا ہے۔

ناگ دیوتا کے استھان کی صفائی ستھرائی گلے سڑے شہتوتوں کے علاوہ مٹھائیوں کے

شیروں اور ٹکڑوں کو سمیٹنا، ناگ دیوتا کے پھن اور کنڈل کو صاف کرنا یہ سب منیا کا کی ڈیوٹی تھی۔ وہ اس ساری جگہ اور دیوتا کے پھن کو بالٹیوں پانی سے رگڑ رگڑ کر دھوتی۔ سخت تار والے برش سے مانجھ کر داغ دھبے دور کرتی۔ جھاڑو سے رگڑے لگا کر صفائیاں کرتی۔ گلہریوں کی گرائی ہوئی ادھ کھائے بیروں کی گٹھلیوں کے ڈھیری کی ڈھیریاں اٹھا اٹھا کر سمیٹتی۔ ساتھ ہی بڑبڑ بھی کرتی جاتی تھی۔ ساتھ ہی ان ناریوں اور مہیلاؤں کو صلواتیں بھی سناتی جاتی تھیں جو یہاں آ کر پوجا کرتی اور ناگ دیوتا سے منتیں مرادیں مانگنے آ کر یہ گندگی کے ڈھیر چھوڑ جاتی تھیں۔ سارے مندر کو گندگی کا ڈھیر بنا کر چل دیتی تھیں۔ پاگل کہیں کی۔ آ کر یہاں ماتھا رگڑتی ہیں، پرارتھنائیں کرتی ہیں کہ مجھے ایک بیٹا دے دو۔ مہا آتما! ناگ راج مہاراج ایک بیٹا دے دو۔۔۔ گدھیا نہیں تو۔۔۔۔ ارے کاہے بیٹا مانگتی ہے۔۔۔۔ کاہے بنتی کرتی اور ماتھا رگڑتی ہے۔ ہاں تو کبھی ہم بھی پاگل تھے۔ ارے، ہم نے بھی بنتی کی تھی، مہاراج ناگ راج دیوتا سے ہم کو بیٹا دے دو۔ ارے اس سمے ہم جوان تھے۔ مار پتھر سے ماتھا رگڑ رگڑ بیٹے مانگے ہم نے پھر مل گئے نا تین تین بیٹے۔ بڑا مان تھا ہم کو ان پر۔۔۔۔ پھر کیا نتیجہ مل گیا وہ ہمارے کون کام آ رہے ہیں۔ میں سوچتی تھی۔ ارے ہمارے تو تین گھر ہیں، تین تین ٹھکانے ہیں۔ میں کتنے چاؤ سے کتنے مان سے ان کے گھروں پر گئی، پر کسی نے ایک چمچہ دال پروسی نہ ایک گھونٹ پانی پوچھا۔ ارے تینوں کے تینوں کو اپنی اپنی گھر والیوں کی چوما چاٹی سے ہی چھٹی نہیں، جیسے اب ان کو ماتا کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ نلجے حرامی۔۔۔۔۔۔ آخر اسی نکھٹو بائی راپا ہی کی تو ہڈی بوٹی ہیں، اس نے ہم کو کیا دے دیا۔ بے کار نکما جیون، شراب، سگریٹ اور جوئے میں بتا کر ہماری ہڈیاں توڑنے والی محنت کی کمائی اڑا کر پرلوک کو چل دیا۔ بائی راپا تجھ پر بھگوان کی مار ہی پڑے۔

"ہاں تو کیا سماچار ہیں آ جی! آج کا کام ختم ہو گیا نا"۔ مندر کا مالی تھم مائیا کسی جھاڑی کے پیچھے سے نکل کر سوال کرتا۔

"ہاں تھم مائیا۔۔۔۔ کام تو ختم ہو گیا ہے پر کل صبح بہت سویرے سویرے اٹھنا ہے ہم کو۔ بہت کام کرنا ہے۔ وہ کیا ہے، کل اس نکھٹو پتی بائی راپا کی برسی ہے۔۔۔۔۔ ارے ہم کو تو اپنا قرض ادا کرنا ہے نا کل اس کا شرادھ کرنا ہے اپنی جھونپڑی میں۔۔۔۔ تو کل آ جائیو ادھر ہی کھانا کھا لینا۔ کل میں خاص کھانا بناؤں گی۔ آئے گا نا؟"

"ہاں کیوں نہیں۔۔۔۔۔بالکل آؤں گا"۔ٹھم مائیانے کہا۔

"پر آ جی یہ بتاؤ کہ سب سامان تو لے آئی ہونا شرادھ کے لئے کوئی چیز رہ تو نہیں گئی۔
ارے تم کوئی کسر تو چھوڑتی نہیں ہو بائی راپا کا تیل پروسنے میں۔۔۔۔ہاں۔۔۔۔کیلے کے تیل پر اس کی من پسند بیڑی سے لے کر گڑ میں پکے ہوئے بند اور وہ گرم مصالحے والا بھات۔۔۔۔۔
اور۔۔۔۔۔اور تاڑی اوں ہوں۔۔۔۔۔ٹھم مائیانے ہونٹ چاٹتے ہوئے کہا۔ جیسے ابھی سے کھانے کے لئے اس کی رال ٹپکنے لگی ہو اور بھوک کے مارے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے ہوں۔
اس کی بات پر منیا کا زور سے قہقہہ مار کر ہنسی۔

"اچھا تو پھر ٹھیک ہے کل آ جائیو۔ تجھے اپنی من پسند ہر ایک چیز اس حرامی بائی راپا کے تیل پر پروسی ہوئی ملے گی"۔

اس مرتبہ بھی منیا کا نے بائی راپا کے شرادھ کا پورا اہتمام اسی طرح کیا تھا جیسے وہ ہر سال کیا کرتی تھی۔ یہ وہ کاج تھا جسے پورا کرنا اس کے بیٹوں پر فرض تھا۔ پر انہوں نے تو کبھی یہ خیال نہ کیا کہ انہیں اپنے باپ کے شرادھ کی رسم ادا کرنا چاہیے۔ البتہ منیا کا اس فرض کو پورے اہتمام سے ادا کرتی تھی۔ ہر سال اس دن کے لے کے صاف تیل پر مچھلی کا سالن، نرم نرم پکی ہوئی کرم کلے کی بھاجی گڑ میں پکے بند، گرم مصالحے والے بھات کے ساتھ اس کی من پسند برانڈ کی بیڑی اور ایک چھوٹی سی تاڑی کی بوتل سجا دیا کرتی تھی۔ اس تیل پر وہ ہر وہ کھانا پروس دیا کرتی تھی جو بائی راپا کو پسند تھا۔ اس روز اس کے چہرے پر ایسی تازگی اور چمک آ جاتی تھی جیسے وہ پھر سے جوان ہو گئی ہو اور آج تو اس نے اپنے ماتھے پر کم کم کی بندیا لگانے کی جرأت بھی کر لی تھی۔ جوڑے کو پھولوں کی بینی سے سجایا تھا اور اپنے بوڑھے بدن پر ایک صاف ستھری سوتی ساری بھی لپیٹ رکھی تھی۔

اور جب مسز رتنا راما راؤ نے اس کو اس سارے بناؤ سنگھار کے ساتھ شرادھ کی رسوم پوری کرتے ہوئے تیل کو پورے روایتی انداز میں پروستے اور اپنے مرے ہوئے پتی کو جھڑکیاں دیتے ہوئے دیکھا تو ان کو بڑا ہی مزا آیا۔ خوب ہنستے ہوئے اس کو اپنی سریلی آواز میں خوب چھیڑا، ان کی چھیڑ چھاڑ پر منیا کا شرم سے لال ہو گئی تھی۔ وہ ان کی ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ اور ہنسی میں خود بھی شریک ہو گئی۔

سارے کاموں سے فارغ ہو کر منیا کا نے اپنی جھونپڑی میں جھاڑو لگائی اور خوب

صفائی کی۔۔۔۔۔۔ارے کیا فضول باتیں ہیں۔۔۔۔۔پتی۔۔۔۔۔۔۔بیٹے۔۔۔۔۔ارے یہ بھی کوئی ناتے ہوئے۔ایسا لگتا تھا جیسے اس کی جھونپڑی کے ساتھ اس کا چہرہ بھی بدل گیا، ایک بالکل نئی تازگی سی نظر آ رہی تھی اس پر۔صفائی ستھرائی کرنے کے بعد وہ باہر نکل آئی تھی اور ہمیشہ کی طرح ڈگ مگ چلتی باہر کی دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئی تھی۔دور کہیں اندھیاروں کے اور تاکتی ہوئی۔ اب پیڑوں نے اسی پرانے شیطانی رقص کے انداز میں جھومنا شروع کر دیا تھا اور وہ اس وقت اس رقص سے ایک عجب یکتائی کے احساس کے ساتھ ماورائی انداز میں لطف اندوز ہو رہی تھی کہ جیسے اس وقت سے اور اس نظارے سے ماسوا اس کے کوئی دوسرا مزے لینے والا ہو ہی نہ۔ایک اندرونی اور بالکل ذاتی خوشی سے وہ دوچار تھی۔عجب سی سنسنی خیز سرشاری کے عالم میں اپنے چاروں اور بھیگی بھیگی مٹی کے سوندھے پن کو اپنے اندر اترتا محسوس کر رہی تھی۔دور کہیں آسمان پر بادلوں کی گرج سنائی دے رہی تھی۔

اچھا ہے کل صبح مجھے باغ کو پانی نہیں لگانا پڑے گا۔رات کو پانی پھٹ پھٹ کر برسے گا یہ سارے پیڑ یہ پودے پتھر کا ناگ دیوتا بھی دھل دھلا کر بارش کے پانی میں نہا کر صاف ستھرا ہو جائے گا۔ ہر چیز پانی سے دھل کر صاف ہو جائے گی۔ یہ میری کٹیا بھی اور اس کے آس پاس سارا کچھ برکھا کے پانی میں نہا کر دھل کر بالکل پاک صاف ہو جائے گا۔

ہوا کے جھکڑ بہت تند تھے۔ناریل کی ڈالیں عجب طرح سے جھوم رہی تھیں۔منیا کا اب راکھشس کے اسی وحشیانہ ناچ کی منتظر تھی جس کو دیکھتے دیکھتے وہ اس کی ہم رقص بن جایا کرتی تھی۔آج بھی وہ اسی ناچ کی تال پر ناچنے کو تیار بیٹھی تھی۔تا کہ اس کے قدم سے قدم ملا کر اسی کی تال سے تال ملا کر اسی میں گم ہو جائے۔ایسی اندھیاری رین میں ایک ننھے سے بے حقیقت اور حقیر نقطے کی طرح بیٹھی دور کسی اور تکتی وہ سوچتی تھی:

"راکھشس کون ہے؟ اور کون نہیں ہے؟

میں کون ہوں؟

اور تم؟ تم کون ہو؟

میں کہاں جا رہی ہوں؟ اور کب؟

اور کیوں؟

اور کہاں؟"

☆ ☆ ☆

MashalBooks.org

انگریزی افسانہ

سپاہی آدھی رات کا

وشواپریا آئینگر

میرے پاس ایک ساگر تھا۔ کاہے کا بنا ہوا تھا وہ ساگر؟ ہے بھگوان ! یہ کیا بات ہوئی کہ ساگر تو بس ساگر ہی ہوتا ہے۔ میرا ایک بیٹا تھا، میرا ایک دیوتھا گارسیالورکا۔

سمندری قازیں ایک لمبی قطار میں اڑی چلی جارہی تھیں، تپتے ہوئے آسمان پر پھیلی پیلی پیلی دھوپ چاندی کے ورق جیسی لگ رہی تھی۔ ساگر کی سبزی مائل نیلگوں موجیں بے چینی سے سنسان ساحل کی ریت سے ٹکڑا ٹکڑا کر پاش پاش ہو رہی تھیں۔ ان کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ آنے والے سیپیوں کے چمکیلے خول ساحل کے کناروں پر جمع ہو رہے تھے جو چاندی کی ڈھیریوں کی مانند نظر آرہے تھے۔ ساحل سے تھوڑے فاصلے پر پانی کی سطح پر لہراتی بل کھاتی بڑی بڑی موٹی موٹی موجیں دور سے یوں نظر آتی جیسے کالی کالی بے شمار کشتیاں لہراتی بل کھاتی ساگر پر سے بہتی دور کہیں کو چلی جارہی ہوں۔

اس کے جھونپڑے کی دیواریں پھونس سے بنی ہوئی تھیں، وہ کچھ اس طرح اور ایسے زاویہ سے ڈھیتی نظر آتی تھیں، جیسے انہیں پتہ ہی نہ ہو کہ ان کو یہاں کس مقصد سے کھڑا کیا گیا ہو اور ان کو کرنا کیا ہو۔ ٹونی ساحل کی گرم گرم ریت میں دھنسا ہوا دھوپ میں سویا ہوا تھا۔ میٹلڈا نے ایک چھوٹی سی ٹین کی صندوقچی کا تالہ کھولتے ہوئے سونے والے کی طرف کنکھیوں سے دیکھا اور کپڑے کی ایک تھیلی میں سے کچھ نوٹ نکال کر گننے لگی۔

ٹونی کا منہ سوتے میں کھلا ہوا تھا اور دھیرے دھیرے کھلتے بند ہوتے منہ کے نیچے ٹھوڑی پر جمی ہوئی قے کی پتلی سی لکیر نظر آ رہی تھی۔ اب بھی جھونپڑی کی پوری فضا شراب کی بو میں بسی ہوئی تھی۔ چاپی میٹلڈا نے میڈونا کی بیماری والی تصویر کے بیضوی فریم کے پیچھے چھپا دی تھی۔ اس تصویر میں سفید لیس کے لبادوں میں ملبوس فرشتوں نے میڈونا کو اپنے حلقے میں لیا ہوا تھا، جیسے وہ جھکے ہوئے اس سے کچھ بات کر رہے ہوں۔ میٹلڈا کا خیال تھا کہ وہ اس کو اس شاندار محل کے بارے میں بتا رہے ہیں جو جنت میں اس کی آمد کا منتظر ہے۔

اس کا بدن لنگی کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے سے ہی ڈھکا ہوا تھا۔ اس نے آگے سے کروشیا کی طرح مڑی ہوئی میخ ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑی ہوئی تھی۔ اس کا سر لپٹے ہوئے جال کے بنڈل پر رکھا ہوا تھا۔ جس کی مرمت اس کو کرنا تھی۔ اس جال کے پانچ سوخانے کھل کھل کر ٹوٹ گئے تھے اور اس جال کی مرمت اس کو آج شام سے پہلے پہلے ہی کرنی تھی یعنی کشتیوں کے سمندر میں اترنے سے پہلے پہلے جال کو ٹھیک کرنا تھا۔ ان کی بیٹی تیا اپنے باپ کی کہنی اور بازو کے بیچ میں گھسی ہوئی سو رہی تھی اور جب باپ کروٹ لیتا تو بچی بھی ساتھ ساتھ کروٹیں لینے لگتی تھی۔

میٹلڈا ریتلے ساحل کی تپتی ہوئی ریت پر دوڑی چلی جا رہی تھی۔ اس کے پھیلے ہوئے پنجوں اور بے جگری سے بھاگتی ایڑیوں کے نقش ریت پر بنتے جا رہے تھے۔ اب کشتیاں ساحل کی طرف آ رہی تھیں، آتی ہوئی کشتیاں بڑی بڑی نظر آ رہی تھیں۔ اس کی نگاہیں دھند کے پار اور اس سے بھی آگے کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ اس کے ہاتھ ابھی سے اس انداز میں اٹھے ہوئے تھے جیسے وہ چاندی جیسے چمکتے پٹیوں والی مچھلیوں کا وزن جو کھ رہی ہو۔ موٹی تازی اور بھاری مچھلیوں کو ہاتھوں میں پکڑ کر تاڑ رہی ہو۔ تیز چلتی ہواؤں کی تندی کو محسوس کر کے اس نے اپنی بے تابی کو لگام دی اور جہاں کی تہاں رک کر کھڑی ہو گئی۔ کشتیوں کے ساحل سے لگنے کے انتظار میں ساحل سے ٹکراتی ہوئی موجوں کے جھاگ اس کے قدموں سے لگ لگ کر اس کے پیروں کو دھو رہے تھے۔

پسینہ بہہ بہہ کر اس کی سیاہی مائل بھوری کمر تک آتا جا رہا تھا اور اس کی توانا رانوں تک آئی ہوئی سیاہ اور سرخ چارخانے کی قمیض کو تر کر رہا تھا۔ اس نے اپنے پاؤں گیلی ریت میں گاڑ دیئے اور سیپیوں کے خولوں کو اپنے پیروں سے ادھر سے ادھر بکھیرنے لگی۔ سلیم نیلا میہ ابھی سے کنارے پہنچ چکا تھا۔ اس نے اپنی لنگی سمیٹی اور اس کے بل میں سے بیڑی نکال کر سلگا لی۔

گاؤں کے آوارہ کتے نے آ کر اس کے گرد منڈلانا اور اس کے ٹخنے چاٹنا شروع کر دیئے۔اب مچھلی والیاں بھی اپنے ٹوکرے اٹھائے جمع ہونا شروع ہو گئی تھیں۔خالی انتظار میں بیٹھی جمائیاں لے رہی تھیں۔نگاہیں ان کی ساحل کے قریب آتی ہوئی کشتیوں کی طرف ہی لگی ہوئی تھیں۔سلیم نے مچھلی کے کانٹے تیر کی طرح کتے کی طرف اچھال دیے جو اس پر ٹوٹ پڑا اور دیکھتے دیکھتے سارا چٹ کر گیا اور پھر دانت نکوسے سلیم کے پاس اس امید پر منڈلانے لگا کہ شاید وہ اس کو مزید کچھ کھانے کو دے گا۔ہوسکتا ہے کہ کشتیاں ساحل پر پہنچنے کے بعد ایک ادھ مچھلی ہی اس کی طرف اچھال دے اور اس کا پیٹ بھر جائے۔

اب کشتیاں ایک کے بعد ایک آگے پیچھے پہنچنے لگی ہیں۔میٹلڈا اسی طرف کو ٹکٹکی باندھے تاک میں لگی ہوئی ہے کہ کسی طرح سلیم کی لگائی ہوئی بولی کے داموں تک اس کی باریک آواز کی رسائی بھی ہو جائے۔ساحل کی چلچلاتی ہوئی چکرا دینے والی دھوپ میں جب کوئی بولی نہیں آتی ہے تو سلیم اپنی سرخ سرخ مردہ مچھلی کی سی آنکھوں کو اس کی آنکھوں میں ڈال دیتا ہے۔اس کو اکساتا ہے کہ وہ بولی دے مگر وہ خاموش ہے اگلی کشتیوں کے انتظار میں ہے۔ممکن ہے کہ ان کشتیوں کی کھیپ میں سستی مچھلی مل سکے۔آج اس کے پاس صرف تیس ہی روپے ہیں۔پچھلے چھ ماہ سے اس نے پکا ارادہ ایک آہنی عزم سے کیا ہوا ہے کہ اب وہ سلیم کا مزید قرضہ نہیں اٹھائے گی۔پر وہ جو ٹونی ہے نا اس نے اس کی ساری جمع جتھا ڈبو دی ہے، بات یہ تھی کہ پچھلے برس کاٹا ماروں کے لئے جو بلی ڈالی وہ اتنی پرانی اور خراب ہو گئی تھی کہ اس کو تبدیل کرنا ضروری تھا۔اس پر تقریباسات سو روپے اٹھ گئے۔

ٹونی نے تو کبھی آج تک کسی کا قرضہ چکایا نہ اس میں اتنی ہمت تھی، وہ تو اس کو بھات خریدنے تک کے پیسے نہ دیتا تھا۔اس نے تو اس کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اس کے پلے کچھ نہیں ہے، کیوں؟ اس لئے کہ اس کا باپ پہلے قرضہ اٹھا چکا ہے۔سلیم سے نہیں، وہ کوئی اور سود پر روپیہ چلانے والا ہے، اس سے قرضہ لیا تھا اس کے باپ نے اور وہ اس کا قرضہ چکائے گا۔پھر جس سال ان کا بیاہ ہوا، اسی سال ان کا جال ایک ٹرالر کی زد میں آ کر تباہ ہو گیا تھا۔نیا جال خریدنے کے لئے اس نے اپنی سونے کی چوڑیاں اتار کر ٹونی کے حوالے کر دیں۔اس کے بعد سے انہوں نے آپس میں پھر کبھی قرضہ اتارنے کی بات ہی نہ کی تھی۔وجہ یہ تھی کہ ٹونی کا شراب کے نشے میں

سودخواروں سے جھگڑے ٹنٹے، چیخم دھاڑ روز کا معمول تھا۔ آئے دن ایک ہنگامہ ایک طوفان کھڑا رہتا تھا۔ میٹلڈا تو اب صبر کر چکی تھی کہ جیون یوں ہی بتانا ہے۔

دوسری پھیری والوں کا یہ تھا کہ کشتیاں آتے ہی اپنے ٹوکرے مچھلیاں خرید کر بھر لیتے اور ٹوکرے سروں پر جمائے بھاگتے چلے جاتے، میلوں میلوں دوڑتے دوڑتے چلے جاتے، کچھ مارکیٹ کا رخ کرتے، کچھ ہوٹلوں اور ریستورانوں پر پہنچ جاتے اور سچی بات تو یہ ہے کہ ان ہی ریستورانوں کی وجہ سے آج کل مچھلی کا بھاؤ چڑھ گیا ہے اور وہ بھی کچھ پیسہ جوڑنے کے قابل ہو گئی ہے۔ دانت سے پکڑ پکڑ کر خرچتی اور پائی پائی جوڑتی ہے تا کہ نیلامی میں بولی دے کر مچھلی خرید سکے۔ اب اس کے سر ایک خرچہ تو تھا۔ پال کی دوائیں اور تیا کے لئے ٹونے ٹوٹکے کے عرق۔ اس کے پاس بچتا ہی کیا تھا جو وہ مچھلی خریدنے پر لگاتی۔ بس اس کا تو یہی تھا کہ بیٹھی ہو یا کھڑی ساگر کی اور ٹکٹکی باندھے دعائیں مانگتی رہی کہ ایسا ہو کہ ڈھیر ساری مچھلی پکڑی جائے بھرے بھرے جال نکلیں سمندر سے پھر مچھلی سستی ہو گی تو وہ بھی مال خرید سکے گی۔

روتا منہ بسورتا، پال اس کے پاس آ گیا۔ اس نے اپنے دبلے پتلے اور لمبے بازو میٹلڈا کی نازک پتلی سی کمر کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا:

"مجھے بہت بھوک لگی ہے"۔ اور پھر ہچکچاتے ہوئے کہا: "مجھے پچاس پیسے دے دو ماں"۔

میٹلڈا جو سمندر کے سبزی مائل سفید پانیوں پر نظریں جمائے کشتیوں سے خالی اس کی سطح کو گھور رہی تھی، مڑی اور اپنے خالی ٹوکرے پر گر پڑی۔ وہ جب بھی اپنے بڑے بچے کو دیکھتی تو غصے سے پھن پھنا جایا کرتی تھی۔ سوکھے سوکھے بازو، پتلی پتلی کھچی سی ٹانگیں، پھولا ہوا پیٹ، سوجا ہوا منہ، جس پر جگہ جگہ کھرونچے لگے ہوئے۔ بچے نے ماں کی پسینے سے تر بتر کمر سے لپٹ کر پیار کیا۔ اس کے منہ سے ٹپکتی رال کی پتلی سی لکیر کمر پر ہی رہ گئی تھی۔ اس نے اپنا کلیسا سا منہ کھول دیا، اس کی آنکھوں میں کھانا اور پیسے ملنے کی امید کے دیپ جگمگا رہے تھے۔ میٹلڈا نے اس کے پانی میں بھیگے ہوئے گال پر ایک طمانچہ مارا۔

جھونپڑیوں کی پچھلی قطار سے عورتیں نکل نکل کر ساحل کی طرف آ رہی تھیں۔ آسمان پر اڑتے ہوئے کووں نے اپنی پرواز نیچی کر دی تھی۔ کشتیوں کی نئی کھیپ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر

MashalBooks.org

ایک بار پھر سلیم نے مڑ کر اپنی لال لال مری مچھلی جیسی آنکھوں سے دیکھا۔۔۔۔۔۔ میٹلڈا ہسٹریائی انداز میں چلا چلا کر کہہ رہی تھی۔ "جھوٹا کہیں کا کبھی جو میرے دیئے ہوئے پیسوں سے کچھ لے کر کھایا ہو۔ سارے پیسوں سے مکھیاں بھنکتی مٹھائی لے کر ٹھونس جاتا ہے"۔

سلیم چپ چاپ بیٹھا مڑے تڑے نوٹوں کی چرسیں اور شکنیں اپنے ہاتھوں سے صاف کرتا رہا۔ پاس ہی کتا بیٹھا تھا اور اس کے جوتوں میں بند پیروں کو چاٹ رہا تھا۔ اچانک ہی میٹلڈا کو احساس ہوا کہ سلیم اس کی طرف نہیں دیکھ رہا ہے۔ کوئی بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ قریب ہی املی کے چیٹیوں سے کوئی کھیل کھیل رہا تھا۔

پال پانچ سال کا تھا۔ اس کو بہت دن سے روگ لگا ہوا تھا۔ پر ابھی دو مہینے پہلے سسٹر نے اس کو یہ بتایا تھا کہ "پال کو ایک تو دمہ کی تکلیف ہے اس کے علاوہ اس کے گردوں میں ایسی بیماری ہے جو کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اس کی زندگی کے دن کم ہیں۔ تمہیں اس کی موت کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہیے"۔

اور بالکل یہی بات تریوندرم کے بڑے ہسپتال کے ڈاکٹر نے اس سے کہی تھی۔ پر کسی نے اس سے کہا تھا کہ اس کا علاج ہو تو سکتا ہے پر اس علاج کے لئے اتنا پیسہ چاہیے ہوگا کہ تم اپنے جیون بھر اتنا پیسہ دیکھ نہیں پاؤ گی۔ نئے اعضا خرید کر لگانے میں بڑا پیسہ لگتا ہے۔ ہاں مرتے ہوئے لوگوں کے اعضا خرید کر لگانا آسان تو نہیں۔۔۔۔۔۔ چھوڑو۔ بھول جاؤ ایسی باتوں کو۔۔۔۔۔ بس اتنا سمجھ لو جو اس دنیا میں آیا ہے اس کو ایک نہ ایک دن چلا جانا ہے۔ وقت وقت اور سمے سمے کی بات ہے۔ بوڑھے بچے یا جوان کی شرط نہیں، بس جس کا وقت پورا ہو جائے منش کا آخری ٹھکانا تو پرلوک ہی ہے اور پرلوک میں سورگ ہے جہاں رہنے کو شاندار ٹھکانہ اور اچھا کھانا سب ہی کچھ مل جائے گا۔ پر میٹلڈا کب ہار ماننے والی تھی۔

" کیوں کیا سینٹ ولی اور بزرگ اس کی مدد نہیں کریں گے۔ پال کی زندگی بچانے کے لئے۔ ہو سکتا ہے ٹونی کے ہاتھ بڑی سی شارک مچھلی ہی آ جائے، ایک نہیں کئی شارکیں مل جائیں تب تو پال کی زندگی بچائی جا سکتی ہے۔ اس پیسے سے ایک نہیں دس گردے خریدے جا سکتے ہیں۔ اسی آس میں اچھے خاصے پلے پلائے بچے کو اپنے بازوں میں لے کر میڈونا کی مقدس زیارت گاہ کے چکر کاٹتی رہی تھی جو بیماروں کی شفایابی کے لئے مشہور ہے۔

اتنی دور ساحل کے دوسرے کنارے پر سفر کرتی ہوئی وہاں پہنچی اور وہاں بیٹھ کر بغیر کچھ کھائے پیئے تین دن تک چلہ کاٹا، لگا تار دعائیں مانگیں کہ امید اس کا دامن کبھی نہ چھوڑے پر کبھی کبھی اس کی رال ٹپکتی، خرخراتے سینے سے نکلتی آوازوں اور ندیدے پن پر اس کا جی کھول اٹھتا تھا اور وہ آپے سے باہر ہو جایا کرتی تھی۔

ایک کاٹامارن ساحل کے کنارے کی لہروں پر ڈولتی ڈولتی آگے کو بڑھ رہی تھی۔ لہروں میں شدت کا جوار بھاٹا کبھی بہت اوپر کو اور کبھی بہت نیچا اتار چڑھاؤ تھا اور ملاح بڑی دقت سے کشتی کو کھینچ کر کنارے پر لا رہے تھے۔ کنارے پر پہنچتے ہی جیسے ہی انہوں نے ٹوکرا سلیم کے ہاتھ میں پکڑایا تو میٹلڈا اس کی طرف لپکی۔ سلیم نے ٹوکرا قبضے میں لے کر ایک نیلی اور سرمئی رنگ کی مچھلی اٹھا کر اس کے دمکتے سفنوں کو دیکھا تو اس وقت اس کی آنکھیں ہیرے کی طرح جگمگ کر رہی تھیں۔ اس نے بیڑی کا کش لیا تو راکھ کی پتلی سی لکیر سی جھڑ کر اس کے سفنوں پر جا گری۔ ہر مچھلی اتنی تر و تازہ تندرست اور بھاری تھی۔ پورے آدمی کے لمبے بازو جتنی ایک ایک مچھلی تھی۔ سلیم نے اپنا لمبا سا نوکیلا ناخن مچھلی کے گوشت میں چبھو دیا۔ تازہ تازہ لال لال خون کا فوارہ سا پھوٹ پڑا۔ اس کا مطلب تھا کہ مچھلی بالکل ہی تازہ تھی۔ سلیم نے خون میں لتھڑی انگلی کو سمندر کے پانی میں ڈبو دیا اور پھر ریت پر رگڑ کر صاف کیا۔ میٹلڈا نے ایک اور مچھلی اٹھائی، انگلیوں سے ٹٹول کر اس کے سفنوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا، جس کے اندرونی حصے اور جبڑوں کے سرخ اور نارنجی حلقے اور عضلات، اس کے پیٹ پر ابھری ہوئی موٹی موٹی رگوں کے خون کی کالی رنگت بتا رہی تھی کہ مچھلی بہت توانا ہے اور اس پر کم سے کم دس روپے منافع ضرور مل سکتا ہے۔ ہاں دس روپے کا تو ضرور نفع مل جائے گا۔ پر بات یہ تھی کہ اس کے پاس تو بولی کھولنے کے بھی پیسے نہ تھے۔

فاطمہ دیر سے بیٹھی مچھلیوں کو تاڑ رہی تھی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں جوکھ رہی تھی۔ ٹوکرے میں ہاتھ ڈال کر اس نے ایک موٹی سی مچھلی کو دبوچ لیا۔ میٹلڈا نے اس کی یہ حرکت دیکھتے ہی گلے سے پکڑ لیا اور پھنکارنے لگی مارے طیش کے:

"کنجری کہیں کی، چھوڑ چھوڑ میری مچھلی چھوڑ دے"۔

فاطمہ نے کس کے ایک چانٹا اس کے منہ پر جڑا اور اس کے بال پکڑ کر میٹلڈا کو گرا کر کھینچنا شروع کیا۔ میٹلڈا نے اس کا بازو مڑوڑ ڈالا۔ بوڑھی عورت نے درد سے بلبلا کر چلانا شروع

کر دیا۔ آخر سلیم نے اٹھ کر دونوں کو الگ کیا۔ کچھ دیر دونوں ہانپتی رہیں۔

بولی شروع کرنے سے پہلے سلیم نے فاطمہ کو اکسایا تھا۔ اسے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہیے تھیں۔ اس نے فاطمہ کو بولی بولنے کے لئے کہا، عجیب مضحکہ خیز سی بات تھی اسی برس کی عمر میں وہ اپنی کانپتی لرزتی آواز میں بولی شروع کرنے کھڑی ہوگئی تھی اور پوری طاقت سے چلا چلا کر نمبر پکار رہی تھی۔ حلق سوکھ رہا تھا اور وہ آوازیں لگا رہی تھی۔ اسی اسی، نوے نوے۔۔۔۔ سو۔۔۔۔ایک سوتیس۔۔۔۔ یہ سارے کے سارے نمبر بے کار اور بے معنی تھے۔ اب فاطمہ نے کالے رنگ کی ہتھوڑی کو مار مار کر نمبر دہرانے شروع کر دیئے تھے۔ ساتھ ہی وہ میٹلڈا کی آنکھوں کے کالے تل میں چھپی نفرت اور تلخی کے ساتھ ساتھ اس کے احساس جرم کو بھی گھورتی ہوئی جیسے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہتھوڑی کو ضربیں لگا رہی تھی۔ سلیم نے اپنی مری ہوئی مچھلی جیسی لال لال آنکھیں میٹلڈا پر گاڑ دیں۔

میٹلڈا نے کپڑے کی سلی ہوئی گانٹھ کھولی اور اس میں سے گن کر روپے روپے کے تیس نوٹ نکال سلیم کے قریب جا کر اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

"یہ تیس روپئے رکھ لو کل میں تمہارے سو روپئے بھی ادا کر دوں گی۔ مچھلی سے بھرا ٹوکرا ہی تو اس کی ذات کے توازن کو قائم رکھتا۔ اس ٹوکرے کو سر پر جما کر جب وہ ہانپ جاتی تب ہی تو اس کو یوں محسوس ہوتا کہ وہ ہے ایک احساس، تحفظ اپنے ہونے کا یقین اور اپنے آپ پر اعتماد ہی اس بوجھ تلے آ کر ہوتا، مچھلی بیچنے والی عورتوں کو بسوں پر چڑھنے کی اجازت نہیں ملتی ہے، سو اب اسی بوجھ تلے اس کو پندرہ میل بھاگتے بھاگتے ہی طے کرنا تھے۔

اب تک تو دوسرے ماچھی فیری تک پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ اسے بہت جلدی جلدی بھاگنا چاہیے۔ بھاگتی بھاگتی وہ مٹھائی والے کی دکان کی طرف سے گزری تو دیکھا شیشے کے مرتبان میں بند انڈے کی شکل کی پیلی اور سفید مٹھائی کی گولیوں پر پال کی نگاہیں ایسے چپکی ہوئی ہیں جیسے مکڑی دیوار سے چپکی ہو۔ انڈے کی شکل والی گولیوں میں نہ جانے کون سی بلا بھری ہوتی ہے، بچوں کے منہ کے باہر غباروں اور بلبلوں کی طرح باہر نکل نکل کر پھٹاک پھٹاک کی خوفناک آواز سے پھٹتی رہتی ہے۔ بھاگتے بھاگتے اس نے ایک سکہ پال کے پتلے چھلکا سے کاغذی ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ مسکرایا تو اس کی ماں جو افق تک چڑھتے ہوئے غبار اور دھول کی طرف دیکھتی ہوئی بھاگنے

میں مصروف تھی اس کو مسکراتے دیکھ نہ پائی تھی۔

خالی سنسان راستوں پر چلتے ہوئے۔ چھپروں اور پھوس کی پاس پاس بنی ہوئی جھونپڑیوں کے درمیان سے نکلنے والی تنگ گلیوں میں ڈھلتی دوپہر کے بعد جانے والی کشتیاں سمندر کے چڑھاؤ کی طرف نکل نکل کر جا رہی تھیں۔ رات کی کھیپ پر جانے والی کشتیاں سمندر کی زیریں سطح اور نشیب سے اٹھتی ہوئی گہرے پانیوں کی چڑھتی موجوں کی طرف قطار در قطار چلی جا رہی تھیں، ان پر سب ہی مچھیرے سوار تھے۔ بجز ٹونی۔ ارے ٹونی ٹونی تو نشے میں چور، ٹونی کو تو سمندر کی لہروں کو دیکھ کر ہی چکر آنے لگتے ہیں اور جی متلانے لگتا ہے۔ ٹونی کو تو سمندر کے پانی کے خیال ہی سے جھرجھریاں آنے لگتی ہیں، جیسے کسی نے اس پر تیزاب ڈال دیا ہو۔ ٹونی ارے وہ تو جال کے پانچ سو ٹوٹے ہوئے خانوں کی مرمت کے لئے جال لئے بیٹھا ہے، یہی کچھ سوچتی ہوئی وہ گھر کی طرف چلی جا رہی تھی۔

جتنی بار وہ اپنے جھونپڑے کے اندر داخل ہوتی۔ سرکی اور پھونس سے بنی دیواریں جھونک کھا کر رہتے پڑھنے لگتی تھیں۔ جھونپڑے میں ہر طرف شراب کی بو کے اتنے سخت بھبکے آ رہے تھے کہ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے شراب کی پوری بھٹی اسی ایک آدمی کے اندر انڈیل دی ہو۔

اس نے ٹونی کا چکنا آبنوسی بازو پکڑ کر اتنی زور سے ہلایا کہ اس کے سوئے منہ پر بیٹھی مکھیاں ایک دم اڑ کر چٹائی پر ایسے چمٹ گئیں جیسے کسی نے چٹائی پر بے شمار کیلیں ٹھونک دی ہوں۔ اس کے ہاتھ چٹائی پر اس طرح پھیلے ہوئے تھے جیسے وہ اس کے نہیں یسوع مسیح کے مصلوب ہاتھ ہوں۔ اس نے جلدی جلدی اپنے دل پر صلیب کا نشان بنایا اور خداوند سے معافی مانگی۔ اپنے ذہن میں آنے والی مشابہت پر۔ خداوند یسوع مسیح کب اس طرح سے نشے میں دھت ہوتا تھا۔ پھر اس نے اس کے منہ پر ایک تھپڑ لگایا۔ ایک دم بوکھلا کر اس نے پٹ سے آنکھیں اس طرح کھول دیں جیسے کوئی بچہ بھیانک خواب دیکھ سوتے سے چونک پڑتا ہے۔ اس کے ہونٹوں اور دانتوں پر لیس دار لعاب مکڑی کے جالے کی طرح چپکا ہوا تھا۔

"اب کس وقت جال کی مرمت کرو گے؟ اور سمندر پر کب جاؤ گے؟ کب ! جب سارے لوگ مچھلی پکڑ لیں گے اور تمہاری عورت اور بچے بھوکوں مرنے لگیں گے؟ کیوں یہی ہے نا؟ " طیش کے عالم میں وہ اس کو گھور رہی تھی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ ایک کراہ

سی ابھری۔ اب وہ اٹھ کر سینکڑوں انگڑائیاں لے رہا تھا۔ بل کھا رہا تھا۔ آخر جب اتنی سکت آئی کہ اٹھ کر کھڑا ہو سکے تو دونوں ایک دوسرے کو کھا جانے والی شعلہ بار نظروں سے گھورتے رہے۔

ان کے جھگڑنے کی آوازوں سے بچی جاگ اٹھی تھی۔ اس نے پیں پیں کر کے رونا شروع کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں پر آنسو بہہ بہہ کر سنہری ریت کے ذروں پر بہنے لگے جو اس کے گالوں پر چپک گئے تھے۔ روتے روتے وہ اوندھی ہو گئی تھی اور زمین پر رینگ رہی تھی۔ دیکھ کر لگتا تھا دو بیضوی کولھے زمین پر گھسٹتے چلے آ رہے ہوں۔ اسی حالت میں اس کے کولھوں کے درمیان سے سفید سفید آؤں خارج ہونے لگی جس میں سیاہ رنگ کے خون کی آمیزش تھی۔ میٹلڈا نے بچی کو گھسیٹ کر دبوچا۔ دل چاہ رہا تھا کاش بازار سے واپسی پر کوئی ایسی راہ ہوتی کہ جس پر چل کر وہ گھر پہنچ ہی نہ پاتی۔

تیا کو بہت دنوں سے پتلے پتلے دست لگے ہوئے تھے۔ منتر وید نے بتایا تھا کہ اس کے پیٹ میں چھپکلی پڑ گئی ہے اور کاٹ کاٹ کر اس کو پریشان کیے ہوئے ہیں۔ اس کو نکالنے کے لئے کسی جڑی بوٹی کا برادہ دیا تھا۔ مگر اس کا کوئی اثر ظاہر نہ ہو رہا تھا اور وہ بچی کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کو تیار نہ تھی، اس کا کہنا تھا کہ جس ڈاکٹر کے پاس پال کا علاج نہیں اور جس نے پال کو جواب دے دیا وہ اس بچی کا کیا علاج کر پائے گا۔ اس کو ایک اور بات کا خوف بھی تھا کہ لوگ اس سے یہ کہتے تھے کہ اب تم تیا کا خیال کرو۔ بات یہ ہے کہ پال نے تو بچنا ہے نہیں۔ یہ البتہ زندہ رہے گی۔ سو تم اس کی فکر کرو۔ پر بات یہ تھی کہ ایسا کرنے کا اس میں حوصلہ نہ تھا، وہ زندگی اور موت کے درمیان اپنی محبت کو مچھلی نہیں بنا سکتی تھی کہ جس کو کاٹ کر دو حصوں میں تقسیم کر دیتی۔ اس نے بچی کے کولھوں کے بیچ پھنسی غلاظت کو کھینچ کر باہر نکالا۔ زمین پر پھینک کر اس پر ریت ڈال دی۔ لوہے کی قلعی دار بالٹی کی رسی سیمنٹ سے بنائے ہوئے کنوئیں میں بالٹی ڈال کر ڈھیلی چھوڑی تو بالٹی کنوئیں کی کائی لگی دیواروں سے رگڑ کھاتی ہوئی تلی میں اتر گئی۔ بالٹی کھینچ کر کائی زدہ سبز پانی نکالا اور اس سے بچی کو صاف کر دیا۔ اس کا مچھی کا ٹوکرا باہر دہلیز پر ہی پڑا تھا۔ مارکیٹ جانے کو دیر ہو رہی تھی۔ ٹونی پاس کھڑا اس کو یہ سب کرتے دیکھ رہا تھا۔ پال انڈے کی شکل والی چیونگم چوس رہا تھا اور چیونگم کے اندر سے نکل نکل ملغوبے کی لگدی سی بن کر رہ گئی جس میں گلابی رنگ کی رال بہہ بہہ کر اس کے کلے پر جم گئی تھی۔

جب وہ ٹوکرے کو جھال سے ڈھانک رہی تھی تو اس نے دیکھا کہ سلیم نے مچھلی کے پیٹ پر جہاں اپنا ناخن کچوکا تھا اس جگہ پر بہہ کر نکلنے والا خون جم کر سخت ہو چکا تھا۔۔۔۔۔اور اب جلد سے جلد مچھلی کو بیچنا ضروری تھا۔ چنانچہ اس نے سرپٹ دوڑنا شروع کر دیا۔ اتنا تیز کہ اس کی رانوں کے پٹھے پھیل پھیل کر پھاوڑے کے پھال کی طرح نظر آ رہے تھے وہ اس لحاظ سے اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھ رہی تھی کہ اس نے سارڈین یا میکرل مچھلیاں نہ لے لی تھیں۔ شکر ہے کہ ان کا سودا نہ کیا تھا۔ مچھلی کی یہ دونوں قسمیں بازار میں بہت عام تھیں اور کثرت سے آتی تھیں۔۔۔۔۔ اور یقیناً اس بڑی مچھلی کی زبردست مانگ ہوگی۔ اچھے پیسے مل جائیں گے۔ اس خیال ہی سے میٹلڈا کو ایک نامعلوم سی خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ اسی امید نے اس کے اندر خوشی اور طمانیت کی ایک مدھم دھیمی دھیمی لو سی روشن کر دی تھی۔ ان دنوں وہ اپنی کسی آس یا امید کو جوئے پر نہ لگا سکتی تھی۔ بس وہ تو ایک بات جانتی تھی کہ اس کو بڑی مچھلیوں کا یہ ٹوکرا بیچ کر جلد سے جلد خالی کرنا ہے۔ اس کو یہ اطمینان تھا کہ آج لڑائی میں فاطمہ نے پہل کی تھی اور اس کے لڑنے جھگڑنے پر اس کا خون کھول گیا تھا۔ اس کا مغز پھر گیا تھا اور اب اس کے سر میں ایک سودا سا سما گیا تھا کہ اس مچھلی کو جلدی سے جلدی بیچ کر ٹھکانے لگا دینا ہے۔

دراصل وہ فاطمہ کو بری عورت نہیں سمجھتی تھی نہ ہی فاطمہ کنجری تھی۔ بلکہ اس نے تو کئی بار اس کی بڑی مدد کی تھی، خاص کر پال کی پہلی کمیونین پر، مگر اس کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ وہ یہ مچھلی اس کو ہتھیا لینے دیتی۔۔۔۔۔ ارے یہ تو سلیم کا کیا دھرا تھا۔ ایک زہری کتا تھا وہ تو وہ انہیں آپس میں لڑوا کر فائدہ اٹھاتا تھا۔ وہ اگر عیسائی نہ ہوتی تو کمبخت کو اتنے کوسنے دیتی کہ کھڑا پانی نہیں پیتا۔ نہیں! ہاں ویسے تو اب بھی کوس سکتی تھی۔ خدا باپ کی چوری چوری کون سا وہ ہر وقت اسی پر نظریں گاڑے بیٹھا رہتا ہے تو خیر مچھی اچھے داموں نکل گئی تو فاطمہ کی بیٹی، چھوٹی بیٹی ہے نا اس کے لئے کیلا لے کر جاؤں گی۔

ٹونی نے اپنا جال کھینچ کر ایک دور پرے کھڑے ہوادار پتوں والے ناریل کی چھاؤں میں پھیلا دیا اور اس کی مرمت کرنے میں جٹ گیا۔ جال کے پھندے ڈالتے ڈالتے بیچ بیچ میں دیسی شراب کے خمار سے جھونٹے آنے لگتے ہیں۔ جن کو روکنے کے لئے وہ سر جھٹک کر خمار کو دور کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ دھوپ میں تمازت میں سورج کی بھالے کی طرح اندر گھس جانے والی

MashalBooks.org

ایک تیز کٹیلی کرن بچے کی جکڑی ہوئی چھاتی پر پڑ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے اندر جما ہوا بلغم اکھڑ اکھڑ کر اس کو بے چین کئے ہوئے تھا۔ وہ کبھی چھینک رہا تھا، کبھی کھانسنے لگتا اور کبھی جکڑی ہوئی چھاتی میں سے سائیں سائیں اور زوں زوں کی سی آوازیں آنے لگتیں۔

"اے پال ادھر آ۔ آ کر میرے پاس بیٹھ"۔ وہ قریب آ کر بیٹھا تو اس نے بچے سے کہا: "تو مجھ سے دور دور کیوں بھاگتا ہے؟ اور میرا ادب اور خیال نہیں کرتا، بات کیا ہے؟ اس لئے نا کہ میں تاڑی پیتا ہوں، نشہ کرتا ہوں۔ ہیں نا۔۔۔۔یہی بات ہے۔ میری بات سن۔۔۔۔۔ میں نشہ اس لئے کرتا ہوں کہ سمندر میں اب مچھلی رہی نہیں۔ یہ دیکھیں ٹرالر بوٹ، ہاں ساری مچھلی تو یہ سمیٹ کر لے جاتے ہیں اور مچھی کے انڈے بھی تباہ کر جاتے ہیں۔ مچھی نہیں ملتی تو مچھیرے مچھی پکڑنے کے بجائے شراب تیار کرتے تاڑی بناتے ہیں۔ تو پھر میں بھی مچھی پکڑنے کے بجائے نشہ کرتا ہوں، تاڑی پیتا ہوں۔ ہاں بہانہ بہت معقول ہے"۔ اس نے لڑکے کی پیٹھ پر ایک دھپ لگائی۔

"سن اپنی ماں کو بول دیجئو۔ پر یہ بتائے دیتا ہوں ماں کو بولے گا تو وہ تیری زبان کے پرخچے اڑا دے گی۔ دھجی دھجی کر کے بکھیر دے گی"۔

پال اس کی بات سن کر مسکرانے لگا۔

"تجھ کو پتہ ہے نا کہ ہم اپنے چوزوں کو رنگتے کیوں ہیں گلابی رنگ۔ بس اسی لئے کہ چیل کوے ان کو پہچان نہ پائیں، ان پر جھپٹا نہ ماریں۔ ارے بدنصیب پال تو کیا جانے اور سمجھے گا تو تو ایک دم گاؤدی ہے ناسمجھ۔ تیری ماں تو تجھے اسکول بھیجنا چاہ رہی تھی کہ پڑھ لکھ کر بس ڈرائیور بنے گا۔ ہاں اور کیا تجھے کوئی بدھو مچھرا تو نہیں بنانا تھا۔۔۔۔۔ ہاں وہ جو ہے نا ہماری ماں کدمتا۔۔۔۔۔ ہم ماہجھیوں مچھیروں کی ماں، اس کی تو بس اتنی ہی آشا ہوا کرتی ہے کہ اس کا ہر بیٹا ساگر پر کشتی لے جانے جوگا بن جائے۔ پر ہاں ایک بات ہے کہ ساگر تو سدا ہمارا اور ہمارے بچوں کا اپنی موجوں اور لہروں پر سواگت کرنے کو تیار ہی رہتا ہے۔ کبھی کسی کو لانے سے روکتا ہے"۔

میٹلڈا نے اپنے تلووں کی سیاہی کو ٹرک کی بجری پر رگڑا۔ جس پر تارکول کا استر کیا ہوا تھا۔ اس کو لاریوں اور بسوں کی گھر رگھوں گھوں اور ان کی آمد و رفت سے پیدا ہونے والی ہر آواز اور ہر شور سے عشق تھا۔ حد یہ ہے کہ وہ تو اڈے پر سے گزرتی موٹر کاروں کی نرم نرم گھیر گھیراتی

MashalBooks.org

آوازوں سے بھی پیار کرتی تھی۔ اگرچہ ان کی وجہ سے اڈے والی سڑک پر دھول اڑا کرتی اور لاریاں اور بسوں کے دھونے دھلانے سے کیچڑ پانی بھی بہت رہتا تھا۔ پر اس کو تو یہ سب بھی اچھا لگتا تھا۔ پیار تھا اس کو اس سارے ماحول سے۔ لاریاں جب اڈے میں داخل ہوتیں تو کوئی بھی اپنی جگہ سے نہ ہلتا۔ چپ چاپ کھڑے دیکھا کرتے لوگ۔ بس اور لاریاں آ آ کر اپنے اپنے کونوں میں کھڑی ہو جاتیں۔ وہ دیوار سے لگی کھڑی بڑے غور اور پریم سے گاڑی کے بڑے بڑے ٹائر ٹیوبوں کو دیکھتی۔ آج بھی کھڑی تھی کہ ایک نیلے رنگ کی بس آ کر رکی تو میٹلڈا اسے بڑے پیار سے دیکھتی رہی تھی۔ بات یہ تھی کہ آج سے کوئی چھ سات ماہ پہلے کی بات ہے، اس وقت تیا صرف دو مہینوں کی تھی۔ ایک دن ایسی بس آ کر رکی اس میں سے ایک عورت اتری تھی۔ بڑی سندر اور بہت من بھاؤنی تھی۔ سفید کلف لگی سوتی ساری کے کناروں پر کالے رنگ کے دھاگے سے آم کے بیتے کڑھے ہوئے تھے۔ اس کی کلائی میں کالی اور سفید چوڑیاں سجی تھیں، وہ سوشل ورکر تھی۔ اس گاؤں میں سماجی کام کرنے آئی تھی۔ جس دن وہ آئی ٹونی باہر گیا ہوا تھا۔ میٹلڈا کو بڑی خوشی تھی کہ وہ اس وقت موجود نہیں ورنہ تو وہ اگر پئے ہوئے نشے میں ہوتا تو وہ کیا کہتی۔ اس نے ان کو بہت باتیں بتائی تھیں۔ بڑی نرم نرم دھیمی دھیمی آواز میں بات کرتی تھی۔ اس نے بڑی عقل کی باتیں کیں ان کو بتایا کہ تم سب انسان ہو، تم کو بھی رہنے کو اچھی جگہ چاہیے ہے۔ صحت مند ماحول کی ضرورت ہے اور یہ کہ تم کو بہت سمجھ داری سے پیسہ کمانا چاہیے۔ اس کو خرچ بھی ہوشیاری سے کرنا ہے اور بڑے طریقے سے بچت بھی کرنا ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ پتی پتنی آپس میں میل جول سے رہیں، لڑائی جھگڑا بالکل نہیں کرنا ہے۔۔۔۔۔ میٹلڈا اس کی ہر بات کو پوری طرح مان رہی تھی اور اس کی بات پر پورا پورا وشواس تھا، اسے یقین تھا کہ اسی میں ان کی بھلائی ہے اور ہاں اس نے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ زیادہ بچے بالکل نہیں پیدا کرنا۔ بس دو ہی بچے کافی ہیں تاکہ ماتا پتا ان کی اچھی طرح دیکھ بھال کر سکیں اور ان کو بھلے مانسوں کا سا جیون دے کر بھلے مانس بنا سکیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے دو بچوں والے خاندان کی تصویریں بھی دکھائیں۔ ان کے گھر میں کرسیاں تھیں، جن پر مخملی پوشش تھی۔ میز پر کرسٹل کا بڑا سا پیالہ رکھا تھا۔ انگور اور انناس سے بھرا ہوا۔ لڑکی کے سیاہ چمک دار بال گھنے اور لمبے تھے۔ بالوں میں نیلی ساٹن کے ربن بندھے ہوئے تھے، وہ پیٹھ پھیرے کھڑی ہوئی کھڑکی کے اس طرف پھولوں کو دیکھ رہی تھی اور جو لڑکا تھا اس کے سر پر گھنے

MashalBooks.org

گھونگریالے بالوں کا ایک سیاہ اور چمکدار جھنڈ نظر آ رہا تھا اور وہ اپنی چوڑی سی چکنی چکنی کلائی پر گھڑی باندھے ہوئے تھا۔ تصویر میں وہ لٹو گھما رہا تھا جو بڑی تیزی سے گھوم رہا تھا۔ ماتا پتا کرسیوں پر آرام سے بیٹھے پیالیوں میں چائے پی رہے تھے۔

"اور یہ دونوں آپس میں بالکل جھگڑا نہیں کرتے"۔ عورت نے یہ بات خاص طور پر جتا کر کہی تھی کہ یہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اس تصویر نے جو اس عورت نے دکھائی تھی اس نے میٹلڈا کی تپلی سوکھی چھاتیوں میں عجیب سی اتھل پتھل پیدا کر دی تھی۔

ایک بار ہی ایسا ہوا تھا کہ وہ اپنا آپریشن کروانے تریوندرم کے بڑے ہسپتال چلی گئی تھی۔ وہ آپریشن تو کیا تھا، ایک دعا تھی، ایک عبادت، ایک سپنا تھا۔ بالکل ساٹن کے نیلے ربنوں اور پریم بھاونا کے ماحول میں مل جل کر چائے پینے والی تصویر جیسا۔

اس نے اس ساری بات کو ٹونی سے چھپائے رکھا تھا، جب تک کہ وہ آپریشن کروا کر واپس نہ آ گئی۔ پھر جب اس نے ٹونی کو ساری بات بتائی تو وہ تو آپے سے باہر ہو گیا۔ آگ بگولہ ہو گیا، اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں، منہ سے جھاگ نکلنے لگے۔ منہ میں آئے الفاظ گنگ ہو گئے، وہ بہت سی باتیں جو وہ چیخ چیخ کر کہنا چاہتا تھا۔ ان کو باہر نہ نکال سکنے پر اس کا چہرہ مسخ ہو گیا۔ اس کے اندر رنج اور طیش کا غصے اور کرودھ کا کتنا گہرا ساگر موجیں مار رہا تھا۔ کیسا جوار بھاٹا تھا جو اس کے اندر ہی اندر بل کھا رہا تھا، اس کی گہرائی کا اندازہ تو کدلما بھی نہ کر سکتی تھی۔ لو بھلا یہ کوئی بات ہوئی کہ کسی دوسرے مرد کے ہاتھوں نے اس کی عورت کی کوکھ کے بھیدوں کو جاننے اور پھر باہر کام کرنے اور بیان کرنے کی جرئات کی۔ کسی مرد نے اس کی کوکھ کو ہاتھ لگائے ہوں اور الٹ دیا ہو اور جب اس نے پوچھا تو کہا یہ بہت بری بات ہے۔ پاپ ہے کسی دوسرے کی عورت کی کوکھ کو ہاتھ لگانا الٹا کر دینا؟ تو وہ اس پر جنگلی وحشیوں کی طرح دیوانہ وار ٹوٹ پڑا۔ اپنے بڑے بڑے ہاتھوں اور وحشیانہ انداز میں مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا وہ اس کے غصہ اور مار کے آگے بالکل بے حال ہو گئی۔ جیسے پگھلا ہوا موم بالکل رقیق سیال، پھر اس نے اس کو اپنے سینے سے چمٹا کر ایک دم بھینچ لیا۔ اس سے لپٹ کر سو تو گیا مگر سوتے میں روتا اور بکتا رہا اپنی ٹھوڑی کو اس کے سینے میں ایسے گھسا کر گاڑ دیا جیسے کوئی کلہاڑا کسی لکڑی کے درمیان پھنس کر رہ جائے۔

بس وہ دن اور آج کا دن پھر کبھی ان کے درمیان اس کے بارے میں بات نہ ہوئی۔

جیسے کوئی بھیانک سپنا ہو جسے دیکھ کر بھول جائے اور پھر اس کو دہرانے کی ہمت نہ ہو۔

لہلہاتی ہری کچھوہ فرن دریا کے کنارے کنارے کھڑی گھنی جھاڑیوں اور دوسرے جھاڑ جھنکاڑ پر پھیلی ہوئی تھی۔ میٹلڈا ٹھنڈے ٹھنڈے پانی میں پاؤں ڈالے کھڑی فیری کا انتظار کر رہی تھی۔ تیز دھوپ اور سورج کی تمازت اس کے سوکھے سہمے کاندھوں کی ہڈیوں میں بھالے کی طرح گڑی جا رہی تھی، جیسے ہی اس کے کان میں چپو سے پانی کے تھپیڑوں کے ٹکڑانے کی آواز آئی وہ اچھل کر فیری پر چڑھ گئی، مچھلی کی بڑی سی نرم اور مڑی تڑی باسکٹ کو کلیجے سے چمٹا کر گرجا کی کسی حمد کی دھن گنگنانے لگی۔

فیری کا کرایہ ادا کر کے وہ اتری اور تیز تیز قدموں سے بازار کی طرف بھاگنے لگی۔ خیال ہی خیال میں ٹوکری میں بڑی مچھلی کے قتلے قتلے کاٹتی ہوئی۔ دل ہی دل میں حساب لگاتی جا رہی تھی، کس کس حصے کا قتلے کے ساتھ کس کس طرف کے قتلوں کا جوڑ مناسب قیمت دلوا سکے گا۔ من ہی من پرارتھنا کرتی جا رہی تھی کہ خدا باپ اتنی مدد کر دے کہ آج تو مجھے میری مچھی کی من مانی قیمت مل جائے۔ بات یہ تھی کہ مارکیٹ میں ان دنوں چھوٹی بچہ اور گرہی مچھلی کی جیسے باڑھ آ گئی ہو وہ جو تھے ناکم بخت ٹرالروں والے انہوں نے کوکلن اور گرہی اور چنگڑی مچھلیوں کے بھرے بھرے ٹوکروں سے مارکیٹ کا رخ ہی بدل دیا تھا۔ اب کون ان چھوٹی اور سستے داموں ملنے والی مچھلیوں کو چھوڑ کر اس کی بڑی سی نفیس مچھلی لے گا۔ بس اس کی یہی پرارتھنا تھی کہ کوچین کی طرف سے آنے والے باڑھ نہ آئے کہ جس کے ساتھ یہ قیلوں اور چنگڑی مچھلیوں کی مارکیٹ میں بھرمار ہو جاتی ہے۔ جیسے مچھلیوں کا سیلاب آ گیا ہو۔ ابھی پچھلے پیر ہی کی تو بات ہے کہ وہ اپنا مچھلی کا بھرا ٹوکرا واپس لے کر گھر آئی تھی۔ ایک مقابلہ ہو تو بھی کوئی بات ہو وہاں تو برف میں لگی مچھلی بھی مقابلے پر آئی ہوئی تھی۔ اب تک تو اس نے سلیم کو اپنے آپ سے دور ہی رکھا ہوا تھا۔ سلیم نے اپنے قرضوں کی رقم اگاہنے کے لئے چھوکروں کا ایک ٹولہ رکھا ہوا تھا جو قرض داروں سے کسی بھی قیمت پر پیسہ اگاہنے میں ماہر تھے۔ اب اگر کل تک وہ سلیم کا قرضہ نہ اتار سکی۔۔۔۔۔تو۔۔۔۔۔ اس خیال ہی سے اس کے پیٹ میں مڑوڑے اٹھنے لگے۔

میٹلڈا۔۔۔۔ مارکیٹ پہنچی تو دن چڑھ چکا تھا۔ دوپہر سر پر تھی۔۔۔۔۔ ایسٹر کی آمد آمد تھی۔ اس وجہ سے سواری گاڑیوں کی آمد و رفت میں زیادتی آ گئی تھی ہر طرف فضا میں رونق

ہنگامہ اور گہما گہمی تھی۔ میٹلڈا نے اپنے خاص الخاص گاہک کو دیکھا ربڑ کی چپلیں پہنے، پھٹ پھٹ کرتی ادھر سے ادھر پھر رہی تھی۔ آج تو اس نے وائل کی ساری باندھ رکھی تھی اور بینی میں تازہ پھول بھی سجائے ہوئے تھے۔ اب اس وقت اس نے پومفر مچھلی خرید لی تھی۔ اگر میٹلڈا ذرا جلدی آ گئی ہوتی تو ضرور وہ اس کی بڑی مچھلی کے چند قتلے تو ضرور ہی خرید لیتی۔ اس کا لکڑی کے کریٹوں سے بنا کھوکھا تھا۔ جس کے دونوں طرف کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ کھوکھے کے اندر زردی مائل سفید سفید بلونگڑوں کا ایک پورا نومولود جھول پڑا ہوا تھا۔ اس نے بڑی نرمی اور احتیاط سے بلونگڑوں کو اٹھا اٹھا کر مٹی کے ٹوٹے گھڑے میں ڈال کر کوڑے کے ڈھیر پر رکھ دیا۔ پھر اپنا کریٹ پلٹ کر مارکیٹ میں اس جگہ پر رکھا جہاں ایسے کھوکھوں کا نیم دائرہ سا بنا ہوا تھا۔ اب تک اس کے گاؤں کی تقریباً تین چوتھائی مچھلی تو فروخت کر چکی تھیں۔

وہ دل ہی دل میں تیا اور ٹونی کو کوس رہی تھی، جن کے کارن مارکیٹ اتنی دیر سے پہنچی تھی۔ گاؤں کی دو عورتیں بھی بڑی مچھلی بیچ رہی تھیں۔ ان کی مچھلی تقریباً بک چکی تھی، صرف تھوڑے تھوڑے قتلے باقی رہ گئے تھے۔ اپنے کریٹ کو دھوتے دھوتے وہ مسکرا دی تھی، پگھلی ہوئی برف کے پانی سے بننے والے ننھے ننھے تالاب دکھائی نہ دے رہے تھے۔ ان کی عدم موجودگی پر وہ خوشی محسوس کر رہی تھی۔ لوہے کے لمبے گز سے مچھلی کی پیمائش کی اور اس کو اپنے بالشتوں ناپا اور مچھلی کو کاٹ کاٹ کر قتلوں کی علیحدہ علیحدہ ڈھیریاں بنا کر رکھ دیں۔ یہ سب کرتے وقت اس کے بازوؤں کندھوں کی ہڈیوں میں درد کی لہریں اٹھتی رہیں، اس کی رانوں کی رگیں ابھی دھڑک رہی تھیں۔ بہرحال اب وہ بازار کے ہجوم میں اچھی طرح جم چکی تھی اور اس نے مچھلی بیچنے والیوں کی ہانکوں میں اپنی ہانکیں اور آوازیں ملانا شروع کر دیں۔ ہانکیں لگانے کے دوران وہ اکا دکا بچے کھچے گاہکوں پر بھی نظریں گاڑے ہوئے تھی جو جھجکتے جھجکتے، ادھر ادھر نگاہیں مارتے پھر رہے تھے۔ وہ ان کو دیکھتے ہی چیتے کی سی پھرتی کے ساتھ ان پر جھپٹتی۔ اپنے دانت نکوس نکوس کر مسکراتے ہوئے ان کی طرف دیکھتی اور مچھلی کو اٹھا کر دکھاتے ہوئے ان کو للچاتی، خوشبو سے مہکتے ہاتھوں میں مچھلی ٹھونس کر ان کے ہاتھوں میں سے کرارے کرارے نوٹ اور نئے نئے چمکدار سکے نکلواتی رہی۔ ایک دم ہی اس نے آوازیں نکالتے نکالتے بنجاروں کے انداز میں یک لخت یوں لہرا لہرا کر ہانکیں لگانا شروع کر دیں جیسے کوئی بنجارن بیٹھے بیٹھے ایک دم اٹھ کر تیز تیز ناچنا شروع کر دے۔ اس کے

نوٹوں اور پیسوں کی ڈھیروں کے سائز میں اضافہ ہو رہا تھا۔

کبڑے فقیر چاروں طرف پھر رہے تھے۔ جب وہ گھوم پھر کر اس کے قریب آتے وہ ٹین کے کمنڈل میں مچھلی کا موٹا سا قتلہ ٹھن سے ڈال دیتی۔ جس کی چمک اور تازگی اب بھی آنکھوں کو للچا دینے کو کافی ہوتی تھی۔ شام ہو رہی تھی۔ رات تیزی سے مارکیٹ پر اتر رہی تھی۔ میٹلڈا کے کریٹ پر اب بھی ایک بڑی سی تیار مچھلی گاہک کے انتظار میں پڑی تھی۔ اس نے ایک انگڑائی لی۔ پھیری والے اور اسٹالوں پر مچھلی بیچنے والے دھیمے دھیمے قدموں سے چلتے ہوئے واپس جا رہے تھے۔ میٹلڈا نے دونوں بازو پھیلا کر انگڑائی لی اور پھر اپنی کمر کو کمان کی طرح پیچھے کی طرف جھکایا۔ ایک بڑی سی جمائی لی، اس کے کریٹ پر سرخ سرخ دھبوں کے درمیان شام پڑے آنے والے گاہک کے انتظار میں موٹی تازی تیار مچھلی پڑی ہوئی تھی۔ میٹلڈا نے گول گول سفید چھلوں کی شکل کے لچھے کاٹ کر ٹوکرے میں ڈال دیئے۔ اترتی رات کے دھوانسے اور ملگجے اندھیرے میں سڑک کی روشنیاں پھیکی پھیکی پیلی پیلی سی دکھائی دے رہیں تھیں۔ البتہ کچھ فاصلے پر مین روڈ کے مکانوں کے دریچوں سے چھن چھن کر آتی ہوئی روشنیوں میں مانوسیت اور راحت کا عجیب سا سائیں سائیں کرتا احساس ہو رہا تھا۔ یہ وقت میٹلڈا کی تنہائی کا تھا۔ سنسان اور خالی مارکیٹ اور اترتی رات کے اندھیرے میں وہ اب تن تنہا بیٹھی تھی۔ تھکن سے چور بدقت تمام اٹھی اور کریٹ پر پڑی مچھلی کو اٹھا کر ٹوکرے میں ڈالا اور اپنی لنگی کا جھول ٹھیک کیا اور ایک چیتھڑے سے پسینہ پونچھا اور اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے رانوں اور کولہوں کے پر گوشت حصوں کو جلدی جلدی مساج کر کے انکی تھکن اور درد کو دور کیا۔ کریٹ کو اٹھا کر کوڑے کے ڈھیر پر رکھا۔ ایک ٹوٹے ہوئے آئینے کے ٹکڑے میں اپنی صورت دیکھی، ان دنوں وہ اکثر اسی ٹکڑے میں اپنی شکل دیکھا کرتی تھی۔ جسے دیکھ کر دل بیٹھنے لگتا تھا۔ بڑھاپے کا آسیب ایک پھٹکار کی طرح منہ پر چڑھا چلا آ رہا تھا۔ چہرے کے مخملی سطح پر جیسے جابجا کسی کے انگوٹھے کی چھاپ لگتی جا رہی ہو۔ باریک باریک لکیروں کے نشان ابھرتے جا رہے ہوں۔ کریٹ کو کوڑے کے ڈھیر پر رکھ کر اس نے گھڑے کے اندر جھانکا۔ میٹلڈا نے بڑی نرمی سے ایک بچے کا سر انگلیوں پر اٹھا کر دیکھا۔ سارے بچے ایک دوسرے کے ساتھ دبکے ہوئے سوئے ہوئے تھے۔ ایک ٹھنڈی سانس بھر کے بچے کا سر رکھا اور چل پڑی۔

وہ سنسان اور ویران مارکیٹ سے گزر کر مارکیٹ کے چوک کی طرف نکل آئی۔ چوک

کیا تھا خالی اور ٹوٹے پھوٹے کریٹوں کا ایک ڈھیر تھا جو کوڑے کرکٹ کی طرح یہاں سے وہاں تک بکھرا پڑا تھا۔ کریٹوں کے علاوہ گلی سڑی سبزیوں اور مچھلی کی آلائش کے جا بجا ڈھیر ہی اس جگہ کے منڈی ہونے کی علامت تھے۔ اب پو پھٹے، منہ اندھیرے کوڑھی لوگ آ کر اس ڈھیر کو کرید کرید کر اپنے مطلب کی سبزی وغیرہ چھانٹ کر لے جائیں گے۔ یوں یہ کچرا صاف ہو جائے گا۔ اگلے دن پھر وہی بازار کی رونقیں ہوں گی۔

اس وقت ہو کا عالم تھا۔ آسمان پر تارے جھلملا رہے تھے وہ دریا کے کنارے سے فیری پکڑنے جا رہی تھی۔ دریا کے کنارے کنارے ناریل کے پیڑ کھڑے جھوم رہے تھے۔ جن کے نسبتاً نیچے کی طرف کو جھکے ہوئے پتے تاروں بھری رات میں چاندی کی طرح چم چما رہے تھے۔ کاش اس وقت ان پتوں کو کاٹ کر لے جا سکتی، تا کہ برسات کا موسم لگنے سے پہلے پہلے اپنے چھپر کی مرمت کر لیتی۔ اب یہ تھا کہ کسی لڑکے کو لگا کر ناریل کے پیڑ پر چڑھنے اور پتے کاٹنے کے پیسے دینا پڑیں گے۔ پھر چھپر تیار کرنے والے کی مزدوری بھی دینا ہو گی۔ سب ملا کر سارا خرچہ پانچ سو بنے گا۔ کیا کرے کہاں سے لائے، پھر کیا کرے؟ سلیم کا قرضہ اٹھائے؟ توبہ کرو۔ اس سے تو اب کبھی ادھار نہ لے۔ چلو کچھ دن کی بات ہے، پال بڑا ہو جائے گا تو ساتھ ساتھ جھونپڑے کے پاس والا ناریل بھی اونچا ہو جائے گا، اس کے پتے بھی بڑے ہو جائیں گے، چھپر چھانے کے قابل۔ پال درخت پر چڑھ کر پتے بھی کاٹ لیا کرے گا اور چھپر بھی تیار کر لیا کرے گا۔ ہاں آں۔ وہ سکھا دے گی اس کو چھپر چھانا۔ ہاں وہ شام کو جھونپڑی میں دیا بھی بار لیا کرے گا اور جب گرجا کے کانسی کے گھنٹے کی آواز پانی کی موجوں پر سے گزرتی ہوئی گھر تک پہنچے گی تو پال یسوع مسیح کی مورتی کے آگے جھک کر اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنائے ہوئے دعا کرے گا۔

"اے ہمارے آسمانی باپ "وہ اس سے اپنے سمندر کی لہروں پر نیا کھیتے ہوئے اپنے باپ اور مارکیٹ میں مچھلی بیچتی اپنی ماں کے لئے سلامتی اور فلاح مانگے گا۔ بس اسی قسم کی سوچوں میں گم وہ فیری پر چڑھی۔ اس کو یقین تھا کہ خداوند خدا معصوم بچوں کی دعاؤں سے خوش ہوتا ہے اور ان کو قبول کر لیتا ہے۔ دھیرے دھیرے رسان رسان چلتی ہوئی وہ آرام آرام سے گھر کی طرف چلی جا رہی تھی۔ گھر میں تھوڑا سا چاول پڑا تھا وہ تھوڑی مچھی کاٹ کر سالن بنا لے گی باقی مچھلی سکھا لے گی کل بازار میں بیچنے کے واسطے۔ ارے ہاں نہیں تو کتنے سالوں سے انہوں نے بڑی مچھی

اور بھات کا ایک نوالہ بھی منہ میں نہ ڈالا تھا۔ لگتا تھا سمندر میں باڑھ آ رہی تھی۔ ہوا کے تیز جھکڑ چڑھ رہے تھے۔ چلنے میں جیسے پاؤں اکھڑے جا رہے تھے۔ اس کی گھگھری ہوا بھر جانے سے غبارے کی طرح پھول رہی تھی۔ سڑک کیا تھی ایک لمبا چوڑا تناور درخت، یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا تھا۔ بے شمار ڈالوں اور شاخوں سمیت۔ وہ اپنی بے شمار گلیوں کوچوں اور راستوں کو ساتھ لئے چلتی ہی چلی جا رہی تھی۔ تمام ہی راستے اور گلی کوچے چھوٹی بڑی جھونپڑیوں سے پٹے پڑے تھے۔ جیسے پھل دار پیڑ کی ڈالیں پھلوں سے لدی پڑی ہوں۔ رات کے اندھیارے میں جھونپڑیوں سے چھن چھن کر آتی ہوئی روشنیاں بڑی اچھی لگ رہی تھیں۔ اب وہ ایک بغلی گلی میں داخل ہو گئی تھی۔ ذرا لمبے اور تیز پگ اٹھاتی ہوئی دل دھک دھک کرتا گھر کی اور چلی جا رہی تھی۔

گھر کے قریب جا کر کھڑی ہوئی تو جیسے دل کی دھڑکن بند ہونے لگی۔ جیسے کسی نے دل کو مٹھی میں لے لیا ہو۔ جھونپڑا اندھیرا اور خاموش پڑا تھا۔ گرجا کے گھنٹے اس کے سر پر ہتھوڑوں کی طرح بج رہے تھے۔ منہ کا مزا کڑوا کسیلا ہو رہا تھا۔ جھپٹی ہوئی اندر گھسی پیٹ کی گہرائیوں سے ایک کرب میں ڈوبی ہوئی چیخ بے تابی سے باہر نکلی۔۔۔۔۔۔

"پال۔۔۔۔ ! ارے او راکھشس کی اولاد۔۔۔ ارے کہاں مر گیا تو۔ ہے تجھے کوئی پرواہ چاہے باپ ساگر میں ڈوب کر مر جائے۔ چاہے ماں سلیم کے چھرے تلے آ کر دم دے۔ پر تجھے کوئی چنتا ہے کسی کی۔ یہ سمے ہوا اور گھر اندھا چوپٹ پڑا ہے۔ تجھ سے اتنا نہ ہوا مرنے جوگے کہ اس سمے تو دیوا بار دیتا۔ ارے یہی تو وہ سمے ہوتا ہے جب خدا باپ ہماری اور دیکھتا ہے"۔ پوری جھونپڑی پال کے سینے سے نکلتی ہوئی سائیں سائیں اور چوں چوں کرتی آوازوں سے گونج رہی تھی۔ وہ گھونگے کی طرح ایک ایک چیز کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مٹی کے تیل کا لیمپ جلاتے وقت میٹلڈا کی انگلیاں لرز رہی تھیں۔ لیمپ سے نکلنے والی روشنی کی شعاعیں سوئی ہوئی بچی پر پڑیں۔ بچی کتنی زرد اور ناتواں نظر آ رہی تھی۔ بڑے سکون سے سوئی پڑی تھی۔ جھونپڑی کے بیچوں بیچ میں ریت کا ایک پنگورہ سا بنا ہوا تھا۔ اس میں وہ بڑے آرام سے سو رہی تھی۔ لیمپ کی روشنی کی شعاعیں صلیب پر پڑ رہی تھیں۔ ہاتھی دانت کے بنے یسوع کے سفید پیروں کے نیچے ایک سیاہ کیل گڑی ہوئی تھی۔

"ہائے بیچاری تیا کیسی تھکی ہاری سوئی ہے۔ بچی کی مٹھی میں پہلے انڈے والی چیونگم

MashalBooks.org

دبی ہوئی تھی۔ چیونگم پر نظر پڑی تو میٹلڈا اپنے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا دی۔ جس کا منہ وفور شوق سے تمتمار ہا تھا۔ پیار میڈونا کی تصویر کے فریم کے پیچھے چھپی ہوئی ننھی سی چابی نکال کر اس نے ٹین کی کالی صندوقچی کھول کر اس میں پیسے رکھے۔ پال کے سینے سے نکلتی ہوئی سائیں سائیں اور سانس کی تیزی سے لیمپ کی روشنی کی لو تھرتھرا رہی تھی۔ ان لوگوں نے اس کو بتایا تھا کہ وہ بہت جلد مر جائے گا۔ ڈاکٹروں نے اس سے کہا تھا کہ اب وہ تیا کی فکر کرے۔ اس لئے کہ وہ زندہ رہے گی۔ ڈاکٹروں کی بات پر وہ یقین کرنے کو تیار نہ تھی۔ پڑے بکتے رہیں۔ ظاہر ہے سینٹ تو ڈاکٹر سے بڑا ہوا نا۔ اس نے سوئی ہوئی بچی کے ماتھے پر ہاتھ رکھا، اس کے بال برابر کئے۔ اس کا ماتھا ٹھنڈا برف پڑا تھا۔ چلو بخار تو اترا۔

اس نے ٹوکرے میں سے بڑی مچھلی نکالی اور اٹھا کر باہر لے گئی۔ سفید پتھر پر مچھلی کو ڈال کر مچھلی کاٹنے کی درانتی اٹھا کر ایک قتلہ کاٹ کر الگ کر دیا۔ ابھی مچھلی کے روپہلے سفنے روشنی میں چاندی کی طرح چمچما رہے تھے۔ دوبارہ درانتی چلائی اور اس کی آنکھوں والا حصہ کاٹ کر الگ کر دیا۔ اسی دم سرد ہوا کا ایک جھونکا اندر سے آیا اور دروازے سے باہر نکلتا چلا گیا۔ ایک عجیب سے انجانے وہم اور ڈر سے گھبرا کر وہ جلدی سے اندر گئی وہ پریشانی اور خوف سے پسینے پسینے ہو رہی تھی۔ پال ہانپ رہا تھا اور اس کے سینے سے سائیں سائیں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے بیٹے کے منہ اور ناک کے قریب ہاتھ کر کے اس کی سانس کی آمد و رفت کو محسوس کیا۔ پھر وہ اپنی بچی کی طرف جھکی، بڑی دیر تک وہاں کی سانسوں کی آمد و رفت کو سننے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن کوئی مدھم سے مدھم آواز بھی اس گھمبیر سناٹے اور چپ کو توڑ کر باہر آتی سنائی نہ دی۔ جلدی سے بچی کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ اب پتلے پتلے لمبے لمبے کمزور بازو ماں کے بازوؤں سے نکل کر نیچے کو جھول گئے۔

اس کے اندر سے نکلنے والی چیخ تلوار کی کاٹ کی طرح خاموشی کو چیرتی ہوئی نکلی اور نکلتی ہی چلی گئی۔ سو کی سو جھونپڑیوں سے باہر آنے والی روشنیوں میں عورتیں بے تابانہ دوڑتی ہوئی اس کی طرف آ گئیں۔ فاطمہ نے میٹلڈا کو اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔ اس کی دلخراش چیخوں میں آنے والی عورتوں کی چیخیں مل کر آسمان سر پر اٹھائے لے رہی تھیں۔ بغیر کسی تصنع بناوٹ یا ارادے کے ان کے نالہ و ماتم میں ہر طرف سے آنے والے ہجوم میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بغیر کسی ترتیب اور

تنظیم کے قطار در قطار ٹکڑیوں میں بٹی وہ چیخنے چلانے میں مصروف تھیں اور اس قطار در قطار نوحہ گروں کی قیادت کرنے والے سالار کے طور پر میٹلڈا اس جلوس کے سرے پر کھڑی تھی۔ اس کے ایک ٹیڑھے ہاتھ میں مچھلی لٹک رہی تھی اور دوسرے میں اس کی مردہ بچی کی لاش جھول رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org